آج

٧٦

یوگینی چریکوف

ابنِ انشا

صلاح الدین درویش

صائمہ ارم

ہوانگ سَن وون

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 76

اپریل۔جون 2013

سالانہ خریداری:
پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 800 روپے (بشمول ڈاک خرچ)
بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 80 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)
بینک: میزان بینک، صدر برانچ، کراچی
اکاؤنٹ: City Press Bookshop
اکاؤنٹ نمبر: 0100513669

رابطہ:
پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 35213916 35650623
ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:
Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

پروین رحمٰن کی یاد میں

جنھیں 13 مارچ 2013 کو اورنگی پائلٹ پروجیکٹ
کے دفتر کے قریب قتل کردیا گیا

Scanned with CamScanner

ترتیب

ابنِ انشا: ایک انتخاب

یوگینی چریکوف

9

مجبور

(ناول)

ترجمہ: ابنِ انشا

❁

ابنِ انشا

72

بڑی عدالت میں

82

شاعری بھی علم دریاؤ ہے

92

چاند کی بستی: ایک تبصرہ

Scanned with CamScanner

98
سات گھنٹے مولانا مودودی کے ساتھ
106
بیمار کا حال اچھا ہے

❁❁❁

صلاح الدین درویش

123
فکرِ اقبال کا المیہ

❁

صائمہ ارم

241
لبِ گور

❁

ہوانگ سَن وون

275
حاصل کشید

❁

جعفر زٹلی

زٹل نامہ

(کلیات)

مرتب: رشید حسن خان

قیمت: 300 روپے

اردو زبان اور ادب کے تاریخ نگاروں نے دو بڑی غلط فہمیوں کو رائج کر رکھا ہے: ایک یہ کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا، اور دوسری یہ کہ شروع ہی سے غزل اردو شاعری کا اصل سرمایہ رہی ہے۔ جعفر زٹلی اور ولی دکنی کا تعلق ایک ہی زمانے سے ہے، اور زٹل نامہ کے عنوان سے جعفر کا دیوان ولی کے دہلی آنے سے برسوں پہلے مرتب کیا جا چکا تھا۔ جعفر کے کلیات میں ایک بھی غزل نہیں۔ اس طرح یہ بات مسلّم ہو جاتی ہے کہ دہلی میں اردو کی شعری روایت کی بنیاد رکھنے والوں میں جعفر کو اولیت حاصل ہے، اور یہ بھی کہ دہلی میں اردو شاعری کا آغاز غزل گوئی سے نہیں، سماجی حقیقت نگاری سے معمور شاعری سے ہوا جو سرتاسر نظموں پر مشتمل ہے۔

جعفر زٹلی کا کلام ایک طرف شمالی ہند میں ارتقائے زبان کی پہلی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے، اور دوسری طرف سماجی مسائل و مشکلات کے پرزور اور پرشور بیان کے لحاظ سے وہ اردو کا اولین شاعر ہے جس نے اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے۔ کلامِ جعفر کی یہ بڑی اہمیت ہے کہ اس کی بنیاد پر اردو زبان اس پر فخر کر سکتی ہے کہ شروع ہی سے اردو شاعری میں سماجی مسائل و مشکلات کا بے لاگ بیان موضوعِ سخن کے طور پر ملتا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے لہجے میں بے باکی ہے اور کھردرا پن۔ جعفر اس روایت کا بنیاد گزار ہے۔ بگڑتے ہوئے سیاسی حالات، بیکاری، بدنظمی، افلاس، ان سب کے ہلکے گہرے بیانات اس کی شاعری میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ وہ با اقتدار افراد جن کے نکمے پن کے نتیجے میں یہ حالات پیدا ہو رہے تھے، ان کا نام لے کر ان کو اس کا ذمے دار کہنا، یہ صاف گوئی اور بے باکی بھی اس شاعری کا حصہ رہی ہے۔ وہ زمانہ مطلق العنان شخصی حکومت کا تھا، آج کل جیسی جمہوریت کا نہیں تھا، اُس زمانے میں واقعات پر زبان کٹتی تھی: ایسے زمانے میں یہ بے باک بلند گفتاری داد کے قابل ہے۔ دورِ اول کی اس روایت نے، جس کا سب سے بڑا نمائندہ جعفر ہے، ایک بڑا کام یہ بھی کیا کہ اس کے اثر سے لسانی سطح پر اُس کھردرے پن نے فروغ پایا جس کے بغیر احتجاجی شاعری سرسبز نہیں ہو پاتی: لہجے کے بھاری پن کو برقرار رکھا، پرشور لفظیات کا ذخیرہ فراہم کیا، بیان کو ریشمی پن سے محفوظ رکھا اور اُس آہنگ کی تشکیل کی جو رومانیت سے دور ہے۔

جعفر زٹلی کا کلام شمالی ہند میں ارتقائے زبان کی ابتدائی شکل صورت کو پیش کرتا ہے۔ اس میں 'ریختہ' کی ابتدائی مثالیں محفوظ ہیں اور لفظیات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جس کو ادب، زبان، لغت اور لسانیات کا کوئی سنجیدہ طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا۔

Scanned with CamScanner

ارشد محمود

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

قیمت: 200 روپے

ہم نے اپنے ماحول اور انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس حد تک جامد، خشک، بور، بے کیف، حسن اور لطف سے عاری کر رکھا ہے کہ بحیثیت حیوان جن جبلّی خوشیوں پر ہمارا حق ہو سکتا تھا، یہ کہہ کر کہ ہم حیوان نہیں انسان ہیں، اُن سے خود کو محروم کر لیا، اور انسان ہونے کے ناتے جن خوشیوں پر حق ہو سکتا تھا انھیں یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہم انسان نہیں مسلمان ہیں۔ یہ ہے ہمارا ثقافتی المیہ۔ نتیجہ یہ کہ ہم اجتماعی طور پر حسن کے احساس اور خوشیوں کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہیں، بلکہ ان کے بیری بن چکے ہیں۔ اب سنجیدگی کا مارا، تاریکی پسند اور جمالیاتی حسوں سے محروم انبوہِ کثیر، عالمی تہذیب نو سے اپنی ثقافتی، سیاسی اور معاشی دشمنی میں اضافہ کیے چلا جا رہا ہے۔ بربادی اور موت کی علامتوں سے اپنی شاہراہوں کو سجانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ خود ساختہ اخلاقیات اور پارسائی کے خبط نے ماحول میں مُردنی، گھٹن اور بے کیفی اس حد تک پیدا کر رکھی ہے کہ اس کے اندر زندگی اور دنیا کو خوبصورت بنانے یا اسے ترقی دینے کی لگن اور دلچسپی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ایک طرف ہماری طاقتور ایلیٹ (elite) حکمران کلاس ہے، جو حیوانی اور انسانی سطح کی سب جبلّی لذتوں سے بہرہ مند ہے۔ اس نے اخلاقیات اور پاک دامنی کے سب اسباق عام آدمی کے لیے رکھ چھوڑے ہیں، تاکہ عوام کے حصے کی خوشیوں پر قبضہ جاری رکھا جا سکے۔ دوسری طرف کروڑوں عوام کا وہ جمِ غفیر ہے جہالت اور غربت جن کا مقدر ہے، اور یہ مقدر اسی طاقتور طبقے کا لکھا ہوا ہے۔ وہ خوبصورتی اور لذتوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ کسی بھی سوسائٹی کی ساری تڑپ، جدوجہد اور امید کی کرن صرف متوسط طبقہ ہوتا ہے۔ وہ کون سا انسان ہے جسے اپنے لیے اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے خوبصورتی اور خوشیاں درکار نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں اپنے اوپر سے مسخ شدہ انسان کا چوغہ اتار پھینکنا چاہیے اور خوبصورت بننے، ماحول کو خوبصورت کرنے اور ہر ایک کے اپنے انداز سے خوش ہونے کے حق کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ اگر اس طبقے کی مزاحمت نہیں کریں گے جو ثواب اور پارسائی کے نام پر پورے معاشرے کو بلیک میل کرتا ہے، اُسے پیچھے رہنے، گھٹن زدہ اور بدنما زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے، تو ہمارے اس وطن میں تہذیب کے رہے سہے آثار بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی کاوش ہے۔

Scanned with CamScanner

ابن انشا اردو کی محبوب ترین ادبی شخصیتوں میں سے ہیں۔ شاعر، مزاح نگار، سفر نامہ نگار اور کالم نگار کے طور پر ان کی تحریروں نے پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد کو لطف اور آگہی سے آشنا کیا۔ آئندہ صفحات ان کی چند منتخب تحریروں کے لیے وقف کیے گئے ہیں جو آج کل دستیاب نہیں ہیں۔ ان تحریروں میں ایک مختصر روسی ناول کا ترجمہ، ایک کہانی، دو تبصرے اور دو مضامین شامل ہیں۔ اس انتخاب سے ابن انشا کی یاد تازہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں کی رنگارنگی کو سامنے لانا بھی مقصود ہے۔ ترجمے کے میدان میں ان کی کاوشیں خاصی معروف ہیں۔ انھوں نے ایڈگر ایلن پو اور او ہنری کے علاوہ چینی شاعروں اور جرمن مزاح نگاروں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ تنقید نگاری سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی، لیکن اس انتخاب میں شامل ان کے دو تبصرے ان کے تنقیدی خیالات کو ان کی مخصوص شگفتگی کے ساتھ سامنے لاتے ہیں۔ ان کی کہانی ''بڑی عدالت میں'' ایک نادر تحریر ہے۔

ابن انشا، جن کا اصل نام شیر محمد خاں تھا، 15 جون 1927 کو مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر کی تحصیل پھلور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام منشی خاں تھا۔ انھوں نے اپنا قلمی نام اپنے والد کے نام کی رعایت سے رکھا تھا۔ ابن انشا نے 11 جنوری 1978 کو لندن میں وفات پائی۔ ان کا آخری مضمون ''بیمار کا حال اچھا ہے'' ان کے آخری دنوں کا حال بیان کرتا ہے جب وہ لندن کے قریب ایک ہسپتال میں زیرِ علاج تھے۔

Scanned with CamScanner

یوگینی چریکوف

مجبور

(ناول)

انگریزی سے ترجمہ:

ابنِ انشا

Scanned with CamScanner

یوگینی نکولائیوچ چریکوف (Evgeny Nikolayevich Chirikov) کا شمار انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ممتاز روسی فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ڈرامے اور مضامین بھی تحریر کیے۔ وہ ریاست تاتارستان کے صدر مقام کازان میں 1864 میں پیدا ہوئے اور 1932 میں پراگ (چیکوسلوواکیہ) میں وفات پائی۔ ابن انشا نے ان کے جس ناول کا انگریزی سے ترجمہ کیا اس کا انگریزی عنوان معلوم نہیں ہو سکا۔ انھوں نے مصنف کے نام کا تلفظ ''یوجین چرخوف'' کیا تھا، جسے ان کے تحریر کردہ تعارف میں جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

یہ ناول

1945 یا 1946 کی بات ہے، ایک شام انبالہ چھاؤنی کے کباڑی بازار میں سے گزرتے ہوئے یہ کتاب میں نے ردّی کے ایک ڈھیر سے چنی۔ رات کو جو اسے پڑھنے بیٹھا تو دل پر عجب اثر ہوا۔ کچھ کچھ اپنی بیتی معلوم ہوئی۔ چند دن کے بعد دوبارہ پڑھا۔ آخر ایک روز ترجمہ کرنے بیٹھ گیا۔ طالب علمی کے دنوں کا ذوق وشوق اور دلسوزی تو آپ جانتے ہی ہیں، خوب جی لگا کر ترجمہ کیا۔ اتفاق دیکھیے، انھی دنوں لاہور میں ایک جغادری پبلشنگ ہاؤس قائم ہوا۔ ایک دوست نے، جو اس سے متعلق تھے، مجھے خط لکھا کہ ہم اچھے غیر ملکی ناولوں کے ترجموں سے آغاز کر رہے ہیں۔ کچھ کرو گے؟ میں نے یہ مسودہ اٹھا کر بھیج دیا۔ ان لوگوں کو یہ کاوش پسند آئی اور انھوں نے سب سے پہلی کتاب یہی چھاپی۔ 1947 کے ہنگاموں میں وہ دفتر گاؤ خورد ہوا لیکن تب تک اس کتاب کا ایڈیشن نکل چکا تھا۔ گزشتہ دس سال میں بازار میں یہ کتاب کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔

کچھ لوگوں کو یہ کتاب یاد تھی اور اپنا بھی جی کہتا تھا کہ اس شئے عزیز کو فراموشی کی موت نہ مرنے دیا جائے۔ پہلی طبع کے وقت اس کا نام سحر ہونے تک تھا۔ اب یہ مجبور کی صورت میں پیش ہے۔ نام بدلنے کی علت یہ ہے کہ اس دوران میں اس نام کی ایک دو کتابیں اور نکل چکی ہیں۔ مجبور کچھ ایسا اچھا نام نہیں، لیکن نام میں کیا دھرا ہے۔

یہ ناول کیا ہے، ایک بے قرار روح کی داستان ہے جو اندھے پیار، اندھے اخلاق اور اندھے قانون کی زنجیروں میں جکڑی تڑپ رہی ہے۔ قدامت پرستی شباب کے تیز وتند دھارے کے سامنے

Scanned with CamScanner

نت نئے بند باندھتی ہے اور آخر یہ دھارا ان سنگین پشتوں سے گزر کی راہ نہ پاکر بھنور بن جاتا ہے، یعنی بے قرار روح چکرا کر ایک روز یکایک خلائے بسیط میں گم ہو جاتی ہے۔ مصنف کا طرزِ بیان سادہ لیکن دلآویز ہے جس نے کہانی کے گداز اور تحیر کو اور بڑھا دیا ہے۔

یوجین چرخوف کے متعلق میں کچھ زیادہ نہیں جانتا لیکن وہ پائے اور اعتبار کا مصنف مانا جاتا ہے۔ ہمیں فی الحال فقط اس ناول سے غرض ہے:

کیا جانیں دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

ابن انشا

کراچی، دسمبر 1957

Scanned with CamScanner

مہک رہی ہے فضا زلفِ یار کی صورت
ہَوا ہے گرمیِ خوشبو سے اس طرح سرمست
ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گُلبدن گویا
کہیں قریب سے، گیسو بدوش، غنچہ بدست
لیے ہے بوے رفاقت اگر ہواے چمن
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پرست
ہمیشہ سبز رہے گی وہ شاخِ مہرووفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دلوں کی فتح وشکست

فیض

Scanned with CamScanner

حسب معمول گھنٹی بج اٹھتی، سگنل جھک جاتا اور پھک پھک کرتی ہوئی گاڑی لکڑی کے پلیٹ فارم پر آ کھڑی ہوتی۔

بڑھیا چونک کر ڈبوں کی طرف لپکتی۔ وہ نہایت بے چینی سے ہر کھڑکی کے اندر جھانکتی تھی، ہر مسافر کی طرف غور سے دیکھتی تھی، لیکن اس کا لڑکا کہیں نظر نہ آتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ ساری گاڑی چھان مارتی، لیکن بے سود۔

چند منٹ بعد پہلے کی طرح سناٹا چھا جاتا۔

اب وہ ٹرین ہی رہتی نہ مسافروں کی چہل پہل۔ سب لوگ رخصت ہو جاتے اور پلیٹ فارم خالی ہو جاتا۔ رہ جاتی وہ مایوس ضعیفہ اور اس کی سرد آہیں۔

اسی طرح وہ بلا ناغہ علی الصباح اسٹیشن پر آتی تھی۔ میریا کتنے دنوں سے اپنے بیٹے کا انتظار کر رہی تھی۔ ہمیشہ ریل کی آمد آمد کی گھنٹی بجتی، سیٹی کی آواز آتی، پھر وہی مانوس گھڑگھڑاہٹ، بھگدڑ اور چہل پہل، لیکن نکولس کا کوئی پتا نہیں۔

''خداوندا! اس دیر کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟'' میریا سوچنے لگتی۔ ''خدا کرے میرا بچہ بخیر و عافیت ہو۔''

بڑھیا مایوس ہو کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور کبھی کبھی اس کے جھریوں بھرے گالوں پر ٹپک بھی پڑتے۔

ایک دن مقامی پولیس کا داروغہ اترا۔ بیوی بچے اسٹیشن پر استقبال کے لیے آئے۔ دوسرے دن گاؤں کا پادری ڈبے سے نکلا۔ اسی طرح لوگ چڑھتے اترتے رہتے تھے، لیکن بڑھیا کا پیارا نکولس

Scanned with CamScanner

نظر نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی کسی نیلی ٹوپی والے کو دیکھ کر بڑھیا لپک کر اس کے پاس پہنچتی لیکن آخر مایوس لوٹتی تھی۔

ایک دن اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ کرتے ہوئے وہ پلیٹ فارم پر جھاڑو دینے والے مہتر سے پوچھنے لگی:

''یہ گاڑی کہاں جاتی ہے؟''

''ماسکو جائے گی،'' اس نے جواب دیا۔

''اور آتی کہاں سے ہے۔ کیا کیف سے؟''

''ہاں، کیف سے، کیف سے!'' مہتر نے کچھ چڑ کر جواب دیا۔

بڑھیا نہایت آرزومندانہ نگاہوں سے اس سمت دیکھنے لگی جدھر کیف واقع تھا۔ صبح کے دھندلکے میں اس کی نظر زیادہ دور نہ جا سکی، پھر بھی اس کے تصور کے جھروکے میں ایک نیلی ٹوپی والے نوجوان طالب علم کی شبیہ نمودار ہوئی۔

وہ اپنے بیٹے کے خیال میں ماحول سے بیگانہ سی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ایک قسم کی اداسی اور دل گرفتگی کے آثار نمودار ہو گئے، لیکن اسی لمحے مہتر پلیٹ فارم پر جھاڑو دیتا ہوا قریب آ گیا اور وہ نیلی ٹوپی والی دھندلی تصویر دھویں کے بادلوں میں غائب ہو گئی۔ اب وہی سونا پلیٹ فارم تھا اور وہی ہولناک سناٹا۔

نہ جانے کتنی آرزوؤں کے جلو میں میریا پلیٹ فارم پر آتی تھی اور مایوس ہو کر تنہا گھر لوٹتی تھی۔ واپسی میں اس کے پاؤں بوجھل ہو جاتے اور دل میں ایک ٹیس سی اٹھنے لگتی۔ راستے بھر وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی جاتی۔ اس کا چہرہ طرح طرح کے اندیشوں سے سنولا جاتا۔ اس وقت وہ اتنی ستم زدہ اور آزردہ معلوم ہوتی تھی کہ دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ اس پر ترس آنے لگتا تھا۔

کبھی کبھی گھر لوٹتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ شبہ سر اٹھاتا: شاید بھیڑ بھاڑ میں میں نے نہ دیکھ پایا ہو۔ شاید وہ گھر پہنچ گیا ہو اور اس وقت وہیں موجود ہو۔

اس خیال سے بڑھیا کی امیدوں کو ایک سہارا مل جاتا۔ اس کے قدم تیز تیز اٹھنے لگتے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ اسے پورا یقین ہونے لگتا تھا کہ نکولس آ چکا ہوگا۔

Scanned with CamScanner

لیکن اس کے ساتھ ہی اسے کچھ تشویش بھی ہونے لگتی تھی۔ کہیں اس کے آتے ہی اس کے ابا اسے ڈانٹنے نہ لگیں۔ اب ڈانٹ ڈپٹ سے کیا حاصل؟ جو غلطی ہو چکی اس کی تلافی تو اب ممکن نہیں ہے۔ یہ کیا کم خوش بختی کی بات ہے کہ لڑکا بخیر و عافیت گھر لوٹ آیا ہے، ورنہ کس کا لختِ جگر سلامتی سے تعلیم ختم کر کے گھر لوٹتا ہے!

یہی باتیں سوچتے ہوئے میریا مکان کے احاطے میں داخل ہوتی تو اس کا دل اور بھی تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا۔

مکان طرح طرح کی بیلوں سے پٹا پڑا تھا۔ مکان کی عمر بھی تقریباً اتنی ہی تھی جتنی میریا کی، اور وہ بھی بڑھیا کی طرح کہن سال اور خستہ حال ہو چکا تھا۔ میریا لڑکھڑاتی ہوئی مکان کی سیڑھیاں طے کرنے لگتی۔ دروازے کی چٹخنی کھسکاتے وقت تو اس کا دل کسی خفیہ اندیشے کے تحت اور بھی تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا۔ وہ ہراساں کمرے کی طرف لپکتی، لیکن وہاں اپنے خاوند کو اکیلا پا کر اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے۔ وہ مایوس ہو کر بیٹھ جاتی اور دھیمی آواز میں بڑبڑانے لگتی:

''نہیں آیا... میرا بیٹا آج بھی نہیں آیا...''

''میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ انتظار فضول ہے،'' بوڑھا اسٹیفن ہاتھ پھیلا کر کہتا۔ ''تم بیکار اسٹیشن کے چکر کاٹتی ہو، کیا اب بھی معاملہ تمھاری سمجھ میں نہیں آیا؟''

میریا کچھ جواب نہ دے پاتی۔ تب وہ گھنٹوں آمنے سامنے بیٹھے بے مقصد اور ویران نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے۔ دونوں کا دل کسی خفیہ کرب اور اضطراب کے زیرِ اثر ڈوبنے لگتا تھا۔

جب تک میریا اسٹیشن سے نہ لوٹتی تھی، اس کا خاوند پھٹے ہوئے سلیپر پہنے اپنے کمرے ہی میں ٹہلا کرتا تھا۔ وہ بیچارا بہت گھبرانے لگتا تھا، لیکن بار بار کھانس کر اس گھبراہٹ کو چھپانے کی ناکام کوشش کیا کرتا تھا۔ جب میریا اکیلی لوٹتی تو وہ غرا کر اسی مانوس لہجے میں کہنے لگتا:

''اب انتظار فضول ہے، بیکار ہے۔''

دیوار گیر گھڑی مسلسل ٹک ٹک سے اس سناٹے کے افسوں کو توڑتی رہتی تھی، لیکن وہ بھی شاید

Scanned with CamScanner

بوڑھے سٹیفن ہی کے الفاظ دہراتی تھی:

''اب انتظار فضول ہے۔''

''اب انتظار بیکار ہے۔''

کبھی کبھی مقامی بینک کا ایک محرر، جو اسٹیفن کا دوست تھا، ان کے ہاں آیا کرتا تھا۔ وہ سیاسی قیدیوں کے بارے میں ایسی ایسی خوفناک باتیں سنایا کرتا تھا کہ میاں بیوی کانپنے لگتے تھے۔

''جانتے ہو ایسے مجرموں کو کہاں رکھا جاتا ہے؟'' محرر کہنے لگتا۔ ''قلعے کے اندر تاریک تہہ خانے میں، ایسی کوٹھڑی میں جس کی چھت میں کھڑکیاں ہوتی ہیں اور دیواروں میں چھید۔''

تب وہ کئی قسم کی بے سروپا گپیں ہانکنے کے بعد بیان کیا کرتا تھا کہ کس طرح ان سوراخوں سے پانی کا تریڑا دے کر قیدیوں کو ڈبو دیا جاتا ہے۔ وہ کہا کرتا:

''میں نے خود اس نظارے کی تصویر دیکھی ہے۔ ایک لڑکی اپنی کوٹھڑی میں سہمی ہوئی کھڑی تھی اور دیواروں کے سوراخوں سے پانی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔''

''میرے اللہ! میرے مالک!''

بڑھیا دہشت ناک داستانیں سن کر چیخ اٹھتی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے۔

''سرکار ایسے مجرموں کو عموماً پھانسی ہی دیتی ہے،'' محرر نہایت معتبر اور باوثوق لہجے میں کہتا۔ ''ہاں، کبھی کبھی معاف بھی کر دیتی ہے۔ لیکن ایسا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔''

اسی طرح انقلابیوں کے متعلق سو طرح کی گپیں سنا سنا کر وہ بیچارے بڈھے کی جان ہلکان کر دیتا تھا۔

اس کی باتیں سن سن کر اسٹیفن اور میریا اتنے دہشت زدہ ہو جاتے تھے کہ رات کو سو بھی نہ سکتے تھے۔ تمام رات آہیں بھرتے ہوئے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلا کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ جب میریا اسٹیشن سے اکیلی لوٹتی تو اس کا خاوند کہا کرتا:

''اب اسے دوبارہ دیکھنے کی تمنا کرنا فضول ہے۔''

اسٹیفن اس وقت جوش کی حالت میں یہ الفاظ کہہ تو دیتا لیکن پھر تھوڑی دیر بعد مکان سے نکل

باہر چلا جاتا۔

باغیچے میں ان کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی جسے وہ لوگ 'گوشۂ عافیت' کہا کرتے تھے۔ بڈھا اسی جھونپڑی میں گھس جاتا اور اندر سے دروازہ بند کر لیتا۔ تب بیٹھے بیٹھے وہ ایک نادان بچے کی طرح سسکیاں بھرنے لگتا تھا۔ وہ جی بھر کر رو لیتا اور تنہائی کے ان پراسرار لمحات میں مایوس ہو کر دعا کیا کرتا تھا:

''خدایا، مہربان خدایا، بس وہ زندہ ہو اور خیریت سے ہو۔ مجھے کسی اور چیز کی خواہش نہیں۔''

ایک دن جب اسٹیفن کام پر گیا ہوا تھا اور میریا باورچی خانے میں کچھ کام کر رہی تھی، ایک پرانی گھوڑا گاڑی کھڑکھڑاتی ہوئی مکان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

بڑھیا کے ہاتھوں سے جھاڑو چھوٹ گئی اور وہ چونک کر کھڑکی میں سے جھانکنے لگی۔ گاڑی کے قریب ایک شوقین نوجوان کھڑا تھا۔ وہ طالب علم معلوم ہوتا تھا اور اس کا لباس کالج کے لڑکوں ایسا تھا۔ پاس ہی ایک پرانا بکس رکھا تھا۔ نوجوان اس بکس کو اٹھانے کے لیے کوچبان کا انتظار کر رہا تھا۔

اگرچہ وہ نوجوان اس وقت مکان کی طرف پیٹھ کیے کھڑا تھا، لیکن بڑھیا کا اس پرانے بکس پر نظر پڑ جانا کافی تھا؛ ایک لمحہ توقف کیے بغیر وہ دروازے کی طرف لپکی۔

''اوہ کولیا... میرے لال!''

بڑھیا اس لڑکے سے لپٹ گئی۔ مامتا کی ماری کا دل اتنا بھر آیا تھا کہ وہ ہنستی بھی جاتی تھی اور آنسو بھی بہاتی جاتی تھی۔ اسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ اس کا بیٹا واپس آ گیا ہے۔ وہ بار بار اس کا منھ چوم کر پوچھ رہی تھی:

''تُو خیریت سے تو ہے؟ تُو اچھا تو ہے؟''

''ہاں، مزے میں ہوں،'' لڑکے نے جواب دیا۔

''ارے بیٹا، ہم دونوں تو تیرے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچ کر مر رہے تھے!'' میریا رُندھے ہوئے گلے سے بولی۔ ''کیا انھوں نے تجھے معاف کر دیا بیٹا؟ میرے خدایا... آج میرا کولیا...''

پھر اس کا دل بھر آیا اور وہ رونے لگی۔

نکولس نے مسکراتے ہوئے ماں کی ڈھارس بندھائی۔ نوجوان کا چہرہ ستا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔

اس کے اطوار سے اداسی جھلک رہی تھی اور وہ اپنی ماں کے لاڈ سے کچھ کچھ بوکھلایا نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے بہت دنوں سے ایسا اشتیاق اور لاڈ پیار دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

لیکن میریا کی مسرت بے پایاں تھی۔ اس کا دل نامعلوم بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی:

''لا بیٹا، یہ بکس میں اٹھالوں۔ ارے ہماری تو سب امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ میں ہمیشہ اسٹیشن پر جاتی تھی لیکن کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ تیرا کیا حال ہوگا۔''

''کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی،'' نکولس نے سادگی اور لاپروائی سے کہا۔ ''میں کچھ دن کے لیے جیل چلا گیا تھا۔''

''ہیں! کیا اُسی قلعے کے تہہ خانے میں؟'' بڑھیا چونک کر چلّا اٹھی۔ ''تب تو واقعی خداوند نے میری دعا سنی ہوگی۔ اسی کی مہربانی سے تو ہمیں دوبارہ ملا ہے۔ لیکن اب تو انھوں نے پوری طرح معاف کر دیا نا تجھے؟''

''نہیں... پوری طرح تو نہیں،'' لڑکے نے کچھ گھبرا کر کہا۔ ''مجھے کچھ شرطوں کے ساتھ رہا کیا ہے اور اب آپ کے پاس رہنے کے لیے بھیجا ہے۔''

''بیٹا، میں نے اسٹیشن پر ایک طالب علم سے تمھارے متعلق پوچھا تھا، لیکن وہ تو کچھ بھی نہ جانتا تھا،'' بڑھیا نے کہا۔

''ہم ایک دوسرے کو کیسے جان سکتے ہیں ماں!'' نکولس بولا۔ ''مجھ ایسے تو سینکڑوں طالب علم ہیں۔''

''ارے تو نحیف اور کمزور بھی کتنا ہو گیا ہے!'' ماں بولی۔ ''تجھے ضرور بھوک لگ رہی ہوگی۔ چلو جلدی کھانا تیار کرتی ہوں۔''

❁

آخر نکولس پھر اپنے گھر آ گیا۔

گھر میں ہر چیز پہلی حالت پر تھی۔ کمرے سب پہلے کی طرح صاف ستھرے تھے۔ کھڑکیوں

Scanned with CamScanner

پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ باغیچے میں وہی پرانی بیلیں۔ کمروں میں بھی حسب سابق کہیں گلدان دھرے تھے تو کہیں گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ بڑے کمرے میں رکھی ہوئی گول میز اور اس کے پاس ہی بچھا ہوا خاکی گدوں والا صوفہ نکولس کو بھولی ہوئی ساعتیں یاد دلا رہا تھا۔ صوفے کی پھولدار چادر تو اسے اتنی مانوس معلوم ہو رہی تھی جیسے وہ اپنی زندگی کی اولین ساعت سے اسے پہچانتا ہو۔

کھڑکیوں کے درمیان دیوار پر اخبار کی ایک صاف ستھری فائل لٹک رہی تھی۔ میز پر وہی برسوں پرانی دوات پڑی تھی۔ کھڑکی سے باہر وہی ہرا بھرا میدان اور وہی سونی سڑک نظر آ رہی تھی۔ مکان کے ایک کونے میں وہی پرانا کبوتر خانہ تھا اور احاطے کے پھاٹک پر وہی پون چکی کا ایک چھوٹا سا نمونہ نصب تھا۔ میدان میں بطخیں اپنے ننھے ننھے بچوں کے ساتھ پھدک رہی تھیں۔ چار دیواری کے پاس ہی جھاڑیوں میں ایک پالتو سؤر کان پھٹپھٹاتا ہوا اونگھ رہا تھا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر نکولس مسکرا دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ بطخیں اور سؤر اس سے ایک لمحے کے لیے بھی کبھی جدا نہیں ہوئے۔ نیلگوں آسمان پر ابر کا کہیں پتا نہ تھا۔ قریب ہی گاؤں نظر آ رہا تھا۔ وہ اس وقت کتنا سہانا اور دلکش دکھائی دے رہا تھا! ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آسمان کی پرسکون پہنائی کے نیچے نچنت ہو کر سستا رہا ہو۔ اردگرد کا خوبصورت ماحول ایک طرح کی نیند میں مدہوش تھا۔ ابابیلیں فضا میں اونچی پرواز کر رہی تھیں۔ پاس ہی جھاڑی پر ایک کوا آرام کر رہا تھا۔ اس کی چونچ کھلی ہوئی تھی اور پر سمٹے ہوئے تھے۔ نالے کے قریب ہی ایک کتا نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی اداس معلوم ہوتا تھا اور جیبھ باہر نکالے ہانپ رہا تھا۔ ایک کسان سڑک پر نیچی نگاہیں کیے اپنی دھن میں مست چلا جا رہا تھا۔ اس کے قدموں سے سڑک کی دھول اڑ رہی تھی۔ قریب ہی دو لڑکے نظر آ رہے تھے۔ ایک لڑکا لاٹھی ٹانگوں میں دابے دوڑا جا رہا تھا اور دوسرا چلا چلا کر رو رہا تھا۔ شاید پہلے لڑکے نے اس کا گھوڑا چھین لیا تھا۔ بکائن کی جھاڑیوں پر پرندے چیں چیں کر رہے تھے۔ وہ آپس میں یوں لڑ جھگڑ رہے تھے جیسے پینٹھ کے دن دیہاتی عورتیں۔ ایک چڑیا پھدکتی ہوئی کھڑکی کے قریب ایک ڈال پر آ کر بیٹھ گئی اور نکولس کی طرف نہایت غور اور انہماک سے دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد دو چڑیاں اور آ کر بیٹھ گئیں اور شور مچانے لگیں۔

نکولس کھڑکی کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا جی اداس ہو رہا تھا۔ آج صبح گھر آتے وقت اس کے دل میں مسرت کے جو جذبات اُمڈ رہے تھے وہ جانے کہاں غائب ہو

Scanned with CamScanner

چکے تھے۔ وہ خوشی اب ہنگامی اور مصنوعی معلوم ہو رہی تھی۔

نکولس کو یہ پرسکون ماحول بہت سونا معلوم ہونے لگا۔ وہ سڑک، وہ بطخیں، وہ کا بک اور وہ اونگھتا ہوا سؤر، سب کے سب کتنے اداس نظر آ رہے تھے۔ نکولس سوچ رہا تھا: یہاں کسی کو شہر کی ہلچل اور گہما گہمی کا خیال بھی نہیں ہے۔ کسی کو اتنا سوچنے کی فرصت نہیں کہ اس وقت دنیا میں کیسے کیسے عظیم حادثات واقع ہو رہے ہیں۔ شہروں میں زندگی کتنی مشغول ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پانی ابل رہا ہو۔ لیکن یہاں کے لوگوں کے لیے اس ہلچل، اس گہما گہمی کی کیا اہمیت ہے؟ لحظہ بہ لحظہ بدلتے ہوئے حالات جو ایک شہری کے لیے اتنی اہمیت رکھتے ہیں، یہاں کے لوگوں کو ان کی شمہ بھر پروا نہیں ہو سکتی۔

سوچتے سوچتے نکولس کو محسوس ہوا جیسے اس کی اپنی زندگی دو حصوں میں بٹ کر رہ گئی ہو۔ شہر کی چہل پہل میں بیتا ہوا دور اور دیہات کے پرسکون ماحول میں گزرے ہوئے ایام، دونوں میں کتنا فرق ہے! وہ سوچنے لگا۔ شہر کی گہما گہمی میں گزرا ہوا زمانہ ایک بھولی بسری داستان کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ یہ ماحول فطرت کے اصولوں کی طرح کتنا اٹل اور غیر متغیر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دیہات کی زندگی ہی سچی زندگی ہو۔

''کولیا! تو مچھلی شوق سے کھاتا ہے نا؟'' پیچھے سے آواز آئی۔ نکولس نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے میں میریا کھڑی تھی۔

''لے بیٹا، ذرا ناشتہ کر لے،'' بڑھیا نے گرم گرم کھانے کی سینی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ تو سہی، یہ چیزیں تو تجھے بہت مرغوب تھیں۔''

تب وہ ایک عجیب انداز سے بولی، ''مجھے معلوم نہیں تم لوگ کیوں باغی بن بیٹھتے ہو۔ تمھیں کس کس بات کی ہے؟''

چولھے پر مکھن ابل رہا تھا اس لیے بڑھیا بیٹے کا جواب سننے سے پہلے ہی باورچی خانے کی طرف دوڑی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ باغی نوجوانوں کے مطالبات کا خیال کرنے کی بڑھیا کو کچھ ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔

Scanned with CamScanner

کچھ دیر بعد وہ ایک طشت میں روٹیاں لائی اور انھیں میز پر رکھ کر کہنے لگی:

''دیکھو بیٹا، اپنے ابا جان سے جھگڑنا مت۔ ممکن ہے وہ ناراض ہوں لیکن ان کی خفگی زیادہ دیر کے لیے نہیں ہوتی۔ میری رائے میں تم ان کی باتیں مان لینا۔ آخر وہ بوڑھے اور جذباتی ہیں۔ تم تو ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ رہے ہو، لیکن ان کی تو زندگی اتنی گزر چکی ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ باقاعدہ زندگی بسر کرنے اور جہاں تہاں بھٹکتے پھرنے میں کافی فرق ہے۔''

''اچھا، اچھا!'' نکولس قطع کلام کر کے بولا۔ ''ابا جان گھر کس وقت لوٹتے ہیں؟''

''وہی تین بجے کے قریب۔''

''اور آج کل وہ کام کہاں کرتے ہیں؟''

''اسی دفتر میں،'' بڑھیا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''ان کی تنخواہ بھی وہی ہے بیٹا، آج تک کچھ بھی ترقی نہ ہوئی۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے جو اتنا مل رہا ہے، کیونکہ تمھارے ابا تو اب لکھ بھی نہیں سکتے، ان کے ہاتھ اس قدر کانپتے ہیں کہ...''

''کانپتے ہیں؟'' نکولس نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہاں بیٹا، انھیں رعشہ ہو گیا ہے۔ میں نے تمھیں ایک دفعہ اس سلسلے میں لکھا بھی تھا۔ مجھے امید تھی کہ تم...''

بڑھیا کہتے کہتے رک گئی۔

''اچھا اب کھانا کھالو۔ ان باتوں کے دہرانے سے اب کیا حاصل ہے۔''

نکولس کھانا کھانے لگا، لیکن اس کی نگاہیں اپنی والدہ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔ میری دو ہی سال کی غیر حاضری میں امی کتنی بوڑھی نظر آنے لگی ہیں۔ بال سپید ہو گئے ہیں، منھ لٹک گیا ہے۔ ہاتھ بھی کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ اب تو کمر بھی جھک گئی ہے۔

ادھر میریا بار بار بے چینی سے گھڑی دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسٹیفن جلد لوٹے اور اپنے بیٹے کو دیکھ کر آج کی خوشی میں حصہ بٹائے۔ لیکن بڑھیا کچھ کچھ جی میں ڈر بھی رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اسٹیفن جوش میں آ کر کہیں بیٹے کو مار نہ بیٹھے، یا نکولس ہی کہیں اپنے والد کو کوئی چبھتی ہوئی بات نہ کہہ دے۔ میریا انھی خیالات سے سراسیمہ ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں

Scanned with CamScanner

بیک وقت بیم و مسرت کے جذبات امڈ رہے تھے۔

''ابھی ان کے آنے میں دو گھنٹے کی دیر ہے،'' بڑھیا نے اپنے بیٹے کو پیش از وقت مطلع کر دینے کی نیت سے کہا۔'' آج کل ان کے دفتر میں اتنی مکھیاں ہیں کہ تمھارے ابا زچ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر چڑے ہوے سے گھر لوٹتے ہیں۔''

ادھر نکولس کے دل میں بھی ایک ہلچل مچ رہی تھی۔ وہ بھی اپنے والد سے جلد ملنے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا، لیکن ساتھ ہی اسے یہ خوف بھی دامنگیر تھا کہ ابا کہیں اسے طرح طرح کے الزام لگا کر ڈانٹنے نہ لگیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اسے کوئی چاہے کتنا ہی قایل کرنے کی کوشش کرتا، نکولس کا اعتقاد تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا، بلکہ اس کے علاوہ کوئی اور راہِ عمل تھی ہی نہیں۔ لہٰذا یہ سوچ کر کہ والد سے اگر اس موضوع پر گفتگو چھڑ گئی تو ممکن ہے کچھ بدمزگی ہو جائے، نکولس مضطرب ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی، تاہم اس کے دل میں بے چینی سی پیدا ہو رہی تھی اور وہ کچھ کچھ جھینپ سا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے گھڑی کی طرف نظر اٹھائی۔ سوئی تین کی جانب کھسک چکی تھی۔

''لو، بابا بھی کیسے ٹھیک وقت پر آ رہے ہیں،'' لڑکے نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔

واقعی سامنے میدان میں اسٹیفن آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ نکولس نے دور ہی سے پہچان لیا۔ بوڑھا بڑی آن بان سے قدم رکھتا تھا۔ بات یہ تھی کہ اسٹیفن اپنے کو کوئی معمولی آدمی نہ سمجھتا تھا، وہ اپنا شمار گاؤں کے گنے چنے معزز لوگوں میں کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے اوضاع واطوار خاندانی رؤسا کے سے رکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے سر پر بھورے رنگ کی چمکیلی ٹوپی تھی جس پر ایک تمغہ لگا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ایک اچھا سا چھاتا تھا اور بغل میں کاغذات کا بستہ۔

''بابا اپنے ہاتھوں میں کیا لیے ہیں؟'' نکولس نے اپنی والدہ سے پوچھا۔

''وہ ان کا بستہ ہے،'' میریا نے ملائمت سے جواب دیا۔'' اس میں کچھ نہ بھی ہو وہ تب بھی اس کو اپنے ساتھ ضرور رکھتے ہیں۔ یہی چھاتے کا حال ہے۔ برسات ہو نہ ہو، یہ چھاتا ان کے ہاتھ میں رہتا ہے۔''

اسٹیفن اس وقت بطخوں کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اپنے بچوں کے قریب آتے دیکھ کر ایک

بطخ اس کی طرف دوڑی۔ وہ اپنی گردن لمبی کر کے بوڑھے کے پاس اس طرح آئی جیسے کاٹنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ اسٹیفن رک گیا اور اپنی انگلی اٹھا کر اسے پچکارنے لگا۔ بطخ نے اپنی گردن جھکالی اور اپنے بچوں میں جا ملی۔

''او ہو! آ گئے!''

بڑے میاں نے مسکرا کر کہا، لیکن انھوں نے اپنی رفتار کو آہستہ کیا اور نہ تیز۔ معلوم ہوتا تھا، بیٹے کو دیکھ کر ان کے دل کو کچھ بہت زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ نکولس کے آنے کی خبر انھیں دفتر ہی میں مل گئی تھی، پھر بھی انھوں نے آنے میں جلدی نہ کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بوڑھا اپنے جذبات کے بہاؤ کو اس الھڑ نوجوان پر ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔ ابھی رات ہی اس نے نکولس کے متعلق کتنا بھیانک خواب دیکھا تھا۔ اسے یوں نظر آیا کہ عدالت نے نکولس کو موت کا حکم سنا دیا ہے اور وہ اپنے والدین سے رخصت ہونے آیا ہے۔ اس کے بال پریشان ہیں، ہونٹ خشک اور پھٹے ہوئے، چہرہ زرد ہے اور پاؤں ننگے۔ اسٹیفن اس خواب کو یاد کر کے اب بھی کانپ اٹھا تھا۔

''بابا!''

نکولس چلا اٹھا اور اپنے باپ کے گلے سے لپٹ گیا۔ بوڑھے نے ابھی اسے چھاتی سے لگا لیا۔ لیکن اسٹیفن کا خلوص رسمی سا تھا، اس میں گرمجوشی نام کو نہ تھی۔

''کیا تمھیں آئے بہت دیر ہو گئی ہے؟'' اس نے کھانستے ہوئے پوچھا۔

''میں آج صبح ہی آ گیا تھا،'' لڑکے نے جواب دیا۔

''خوب! مجھے بہت مسرت ہوئی،'' اسٹیفن نے ایسے تکلف کے لہجے میں کہا جیسے کسی اجنبی مہمان کا خیر مقدم کر رہا ہو۔

بڑھیا بھی مکان کی سیڑھیوں پر آ گئی تھی، لیکن وہ باپ بیٹے کی ملاقات کا منظر نہ دیکھ سکی۔ جب اس نے دیکھا کہ دونوں چپ چاپ گھر کی جانب چلے آ رہے ہیں، نہ ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں نہ نظریں اوپر اٹھاتے ہیں، تو وہ گھبرا گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ معاملہ بے ڈھب ہے، اس لیے خود دخل انداز ہونا ضروری سمجھا۔

''خدا کا شکر ادا کرو اسٹیفن! ہمارا کولیا گھر لوٹ آیا،'' وہ بولی۔ ''تم نے مجھے اپنے کل والے

خواب کا حال سنا کر ناحق پریشان کر دیا تھا۔ دیکھو، یہ تو مزے میں ہے۔ اچھا چلو، اب کھانا کھالو۔ لیکن آج تم اداس کیوں ہو؟ کیا دفتر میں آج بھی مکھیوں نے بہت ستایا ہے؟''

اسٹیفن فوراً بھانپ گیا کہ اس کی بیوی کیوں اس وقت مکھیوں کا تذکرہ کر رہی ہے، لہٰذا اس نے کچھ جواب نہ دیا۔

کھانے کے دوران میں بھی بوڑھا بہت سنجیدہ رہا۔ وہ اس انداز سے کھا رہا تھا جیسے کوئی رسم ادا کر رہا ہو۔

''اچھا،'' آخر کار بوڑھے نے پوچھا۔ ''تو تم جیل کی ہوا کھا آئے!''

''جی ہاں،'' نکولس نے آہستگی سے جواب دیا۔

''اور اب مشروط طور پر رہا کیے گئے ہو؟''

''جی ہاں۔''

بوڑھا کچھ دیر تک چپ رہا اور اب زیادہ کھل کر بات چیت کرنے لگا۔

''اور اب کیا کرنے کا ارادہ ہے میاں؟''

''کچھ دن بعد پڑھنا شروع کر دوں گا،'' نکولس نے دبی زبان سے کہا۔

''اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ پھر سے بسم اللہ کرو گے،'' اسٹیفن کہنے لگا۔ ''اور اگر انھوں نے دھکے دے کر نکال دیا تو؟ پھر نئے سرے سے ابتدا کرو گے کیا؟''

''خیر، یہ ابتدا اور انتہا کے قصے تو چلتے ہی رہتے ہیں،'' بڑھیا معاملے کو الجھتے دیکھ کر بول اٹھی۔ ''خدا نے چاہا تو کولیا کی تعلیم بھی ایک دن مکمل ہو جائے گی۔''

''ارے انتہا تو سب چیزوں کی ہوتی ہے میریا!'' بوڑھا اپنا منھ پونچھتا ہوا قدرے روکھے پن سے بولا۔ ''یہ تو قدرت کا اٹل قانون ہے ہی۔ ہم دونوں کا بھی ایک دن آخری وقت آ پہنچے گا۔''

تب لڑکے کی طرف متوجہ ہو کر اس نے پھر پوچھا:

''تمھارے اسکول سے نکالے جانے کی کیا وجہ تھی بھئی؟''

''میں نے احتجاجی ہلچل میں کچھ حصہ لیا تھا۔''

''اوں ہوں... اور قید کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

’’میں نہیں جانتا۔‘‘

’’اچھا؟ لیکن دنیا میں کوئی کام بلا وجہ نہیں ہوتا، سمجھے؟‘‘ اسٹیفن نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔’’ کولیا! دراصل مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی۔ تم نے ایک تماشا بنا ڈالا۔‘‘

’’تماشا؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؛‘‘ لڑکے نے دبی آواز میں کہا۔ وہ اس وقت اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا۔

’’اف! کیا اسی لیے ہم لوگوں نے آٹھ سال تک تمھاری فیسیں ادا کیں، کتابیں خریدیں اور پرورش کی؟ کیا اسی لیے ہم نے تمھیں پال پوس کر جوان کیا؟‘‘ اسٹیفن جوش میں آ کر کہنے لگا۔’’ہم تو امید رکھتے تھے کہ ایک دن پڑھ لکھ کر تم بڑے آدمی بنو گے اور ہماری محنت کا صلہ دو گے۔ سوچا تھا، ہماری ساری محنت کسی بہتر شکل میں ہمارے ہی پاس آئے گی۔ لیکن اب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری دنیا میں ہی اس کا اجر ملے گا، اور وہ بھی جلتے انگاروں کی صورت میں۔‘‘

’’[illegible] بھی روتا!‘‘ اسی وقت پھر میریا درمیان میں بول اٹھی۔ اس نے دیکھا کہ گفتگو کا سلسلہ غلط [illegible] ہے۔

’’اس میں اس کی روٹیاں گننے کی کیا ضرورت ہے؟ دنیا میں سبھی لوگوں کے بال بچے ہوتے ہیں۔ سب اپنے بیٹی بیٹے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ کیا صرف تمھارا ہی لڑکا ہے، اور لوگوں کے لڑکے نہیں ہیں؟ اور اگر لڑکے کو کپڑوں اور کتابوں کی ضرورت پڑتی ہے تو اس میں اس بچارے کا قصور ہی کیا ہے؟ اس طرح اس کے کپڑے لتے گنانا کیا دانشمندی ہے؟ یہ بات نامناسب ہی نہیں، بہت بڑا گناہ بھی ہے۔‘‘

’’نہیں نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا!‘‘ بوڑھا گھبرا کر کہنے لگا۔’’شاید سہواً میری زبان سے کوئی نامناسب کلمہ نکل گیا ہو۔ ارے بھئی، ہم لوگوں کو اس سے کیا غرض ہے۔ اب ہم بوڑھوں کی زندگی ہی کتنی ہے، اور ہمیں کپڑے لتے گننے سے فائدہ ہی کیا ہوگا۔ واقعی اگر جوش میں کوئی لفظ میری زبان سے نکل گیا ہے تو مجھے افسوس ہے۔ میرا تو مطلب صرف یہ تھا کہ لڑکا جلد تعلیم ختم کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے، برسرِ روزگار ہو جائے تو ہم چین کریں۔ کوئی بات بڑھانے چڑھانے کی تو اس میں ہے نہیں۔ کیا ہر انسان اپنے آرام کی بات نہیں سوچتا؟‘‘

Scanned with CamScanner

''سب کو آرام کی فکر ہے،'' نکولس دبے لہجے میں بولا، ''لیکن ہر شخص کے آرام کا معیار مختلف ہے۔ بعضوں کو عزت اور وقار ذاتی سکھ سے زیادہ عزیز معلوم ہوتے ہیں۔''

''ہاں، فاقوں کی نوبت پہنچ جانے ہی میں تو بڑی بھاری عزت ہو جیسے!'' بڑے میاں نے چمک کر کہا۔ ''سچ ہے، ہم بوڑھے لوگ آپ کی باتیں کیا سمجھیں! خدا ہم سے ناکارہ لوگوں کو زندہ ہی کیوں رکھتا ہے، ہم کو تو جیتے جی قبروں میں دفنا دینا چاہیے۔''

میریا نے فہمائش کی نظر سے اسٹیفن کی جانب دیکھا اور چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ تب وہ بیٹے کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی:

''تم نے تو اس نامراد گفتگو میں پڑ کر کچھ کھایا ہی نہیں بیٹا!''

''شکریہ، اب مجھے کسی شے کی حاجت نہیں۔''

''شکریے کی کیا بات ہے؟'' بوڑھے نے ایک آہ بھر کر کہا۔

نکولس نے ٹوپی سر پر رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیوں، کہاں چلے بیٹا؟'' بڑھیا نے فکر مند ہو کر کہا۔

''کچھ نہیں، ذرا گھومنے جا رہا ہوں۔'' اور نکولس اٹھ کر چل دیا۔

جب نکولس مکان کی سیڑھیاں اتر کر چلا گیا تو کمرے میں ایک غیظ آلود سرگوشی شروع ہو گئی۔ میریا اپنے شوہر کو ڈانٹ رہی تھی:

''تم تو ہاتھ دھو کر بچارے کے پیچھے پڑ گئے۔ کچھ بھی ہو، ہے تو ہمارا اکلوتا بیٹا، جان کا ٹکڑا۔ اور وہ بچارہ ڈینگیں کہاں مارتا ہے۔ وہ تو الٹا رحم کا مستحق ہے۔''

اور اسٹیفن بار بار دبی زبان سے کہہ رہا تھا:

''میں نے اس سے کون سی ایسی بات کہہ دی میریا؟ میں نے تو اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔''

❁

نکولس ٹہلتے ٹہلتے گاؤں سے آگے نکل آیا۔ وہ سڑک کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ آس پاس کے درختوں کی ڈالیاں جھکی پڑ رہی تھیں۔ نکولس ان کے چکنے پتے توڑتا اور انھیں اپنے

Scanned with CamScanner

ہاتھوں سے مسلتا جارہا تھا۔ کبھی کبھی وہ سیٹی بجانے لگتا تھا۔ لیکن اس کی ہر حرکت سے ایک طرح کا اضطراب ظاہر ہوتا تھا اور اس کا ذہن طرح طرح کے افکار کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔

چلتے چلتے وہ ایک جگہ رک گیا اور اردگرد کا منظر دیکھنے لگا۔ افق تک گیہوں کے ہرے بھرے کھیت مواج سمندر کی طرح لہرا رہے تھے۔ مرغزار حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ ہر چہار طرف سناٹا چھا رہا تھا۔ صرف ایک چڑیا فضا میں اڑتی ہوئی چہچہا رہی تھی یا قریب کی کسی جھاڑی میں چھپی ہوئی کوئل اپنی میٹھی اور اُداس راگنی سے فضا کو گونجا دیتی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر نکولس کے دماغ میں طرح طرح کے بجھے بجھے خیالات سر اٹھانے لگے اور حزن و یاس کا پرتو اس کے چہرے کے نقوش پر مستولی ہونے لگا۔

''یہاں ہر چیز اپنے دھیان میں مگن ہے،'' وہ سوچنے لگا۔ ''شہر کی وہ تمام چیزیں جن سے ہمیں انس ہو جاتا ہے اس کے مقابلے میں کتنی عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ شہر میں جو باتیں بہت اہم گردانی جاتی ہیں انھیں یہاں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ یہاں سب سے مقدم چیز صحت ہے۔ اور اگر ہر چیز اپنی فطرت کے مطابق تندرست رہے تو زندگی کا سارا معما ہی حل ہو جاتا ہے۔ کاش سب لوگ اس پرسکون اور شاداب منظر کو دیکھتے رہیں اور کائنات کی ازلی موزونیت اور حسن پر غور کرتے رہیں۔ اس شفیق آسمان کے زیرِ سایہ کسی اور شے کی ہوس رکھنا لاحاصل ہے۔ جس طرح یہ بے داغ نیلگوں آسمان، یہ حسین کائنات اور یہ پرسکون ماحول کسی چیز کے تمنائی نہیں ہیں، اسی طرح ہمیں بھی نت نئی آرزوؤں اور نادیدہ منزلوں کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے۔ جاڑے کے بعد حسب معمول بہار آئے گی اور بہار کے بعد برف پوش میدانوں کے جلو میں جاڑا۔ بہار کی فصل میں مسرور پرندے جشن آراستہ کریں گے۔ کسانوں کی گاڑیاں کھڑکھڑائیں گی۔ پیر کے دن پینٹھ کا میلہ لگے گا، شرابی کسان جمع ہوں گے۔ اس کے علاوہ اور کوئی نئی بات نہ ہو گی۔''

سورج منزل بہ منزل مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قریب کے جنگل میں پھر کوئل کی کوک گونج اٹھی۔ اس کے لہجے میں کتنا سوز تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چیخ چیخ کر دنیا کے اس فرسودہ اور غیر تغیر پذیر نظام کے خلاف احتجاج کر رہی ہو اور کہہ رہی ہو:

''دنیا کا چہرہ بدلتا کیوں نہیں، بدلتا کیوں نہیں! وہی باتیں جو صدیوں پہلے ہوتی تھیں، آج بھی اس طرح ہو رہی ہیں۔''

Scanned with CamScanner

''اب میں انھی جنگلوں اور مرغزاروں میں آ کر دن گزارا کروں گا،'' نکولس گاؤں کی طرف لوٹتے ہوئے سوچنے لگا۔ ''انھی ندی نالوں کے کنارے شکار سے دل بہلاتا رہوں گا۔''

سورج کی واپسیں کرنیں بستی کے مکانوں کے در و دیوار پر اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ گاؤں کے سامنے کھیلتے ہوئے بچے شور مچا رہے تھے۔ قریب ہی مائیں اپنے آنگنوں میں بیٹھی اپنے نونہالوں کو بہلا رہی تھیں۔

نکولس چلتے چلتے ان مانوس مکانوں اور گلیوں کو دیکھتا جاتا تھا۔ اسے وہ گھر، وہ گلیاں، وہ میدان اور وہ تالاب ایسے مانوس اور آشنا محسوس ہو رہے تھے جیسے وہ کبھی ان سے جدا نہ رہا ہو۔

''آداب بھیا!'' عقب سے کسی کی آواز سنائی پڑی۔ نکولس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا ہم عمر ایک نوجوان ٹوپی اتار کر سلام کر رہا تھا۔

''اوہو! تم ہو گودریلو۔''

''کہو بھائی، کبھی ہمیں بھی یاد کیا کرتے ہو؟'' گودریلو نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔''

''ہم بچپن میں اکٹھے کھیلا اور لڑا کرتے تھے نا۔''

''ہاں ہاں۔ اچھا تو کیسے مزاج ہیں تمھارے؟''

''عیش میں ہوں،'' گودریلو نے جواب دیا۔ اسے اس پرانے دوست سے مل کر واقعی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ ''آج کل میں ایک ریستوران میں ملازم ہوں۔ آٹھ روبل ملتے ہیں۔ بس اور کیا چاہیے۔ کہو، تم کن حالات میں ہو؟ تعلیم ختم کر چکے ہو یا اب بھی یونہی زندگی برباد کر رہے ہو؟''

''دو سال کے لیے تعلیم کا سلسلہ ذرا ٹوٹ گیا تھا۔''

''کیوں؟'' گودریلو نے رسمی لہجے میں پوچھا۔

نکولس نے اپنی تعلیم ادھوری رہنے کی داستان تفصیل سے سنانی چاہی، لیکن پھر اپنے دوست کی بے پروائی دیکھ کر خاموشی کو ترجیح دی اور اجازت چاہی۔

''اچھا بھائی نکولس!'' گودریلو نے کہا، ''کبھی غریب خانے پر آنے کا کرم بھی کرنا۔ ضرور آنا، کافی اچھی سنگت رہتی ہے وہاں۔ شراب نفیس سے نفیس، اور بلیرڈ بھی کھیلا جا سکتا ہے۔''

Scanned with CamScanner

سڑک کی دوسری روش پر جاتے ہوئے ایک شخص کو دیکھ کر گودریلو نے ٹوپی اتار کر سلام کیا اور نکولس سے کہا:

''یہ ہمارے محاسب ہیں۔ ان کا نام ایوان پیترووچ ہے۔ بڑے بھلے آدمی ہیں۔''

نکولس نے اس شخص کی طرف دیکھا اور گودریلو سے دریافت کیا:

''یہ وہی کیلیا جن تو نہیں ہے؟''

''ہاں ہاں، وہی ہے!'' گودریلو نے مسکرا کر کہا۔ کیلیا جن پٹری پر اس طرح چل رہا تھا جیسے سالوں کا تھکا ماندہ ہو۔ نکولس کیلیا جن کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ جس وقت نکولس اسکول میں کسی چھوٹی جماعت میں پڑھتا تھا، کیلیا جن کسی اعلیٰ جماعت کا طالب علم تھا۔ اسکول کے سب لڑکے اس کی ذہانت اور ہوشیاری کے قائل تھے اور اس کی عزت کرتے تھے۔ نکولس بھی ان دنوں کیلیا جن کو مسرور ترین اور لائق ترین آدمی سمجھتا تھا۔ وہ نکولس کو طرح طرح کی کتابیں لا کر دیتا تھا اور کہا کرتا کہ میرا ارادہ کسی مذہبی مشن کے لیے زندگی وقف کر دینے کا ہے۔ لیکن آج اسی کیلیا جن کو ایک معمولی آدمی دیکھ کر اسے بڑا تعجب ہوا۔ وہ دھاری دار پتلون پہنے ہوئے تھا اور پہلے کی بہ نسبت جسیم اور صحت مند نظر آتا تھا۔ اس کے کندھے بہت چوڑے ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی چمک آ گئی تھی۔ اس کی چال ڈھال سے قناعت اور سکون کا اظہار ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شخص اپنی زندگی کی تمام ضرورتوں اور تمناؤں کو پا چکا ہو اور اسے کسی چیز کے لیے شور مچانے کی ضرورت نہ رہی ہو۔

''ایوان پیترووچ!'' نکولس چلایا۔

کیلیا جن نے مڑ کر دیکھا اور مسکرا دیا۔ لیکن قریب نہ آیا، وہیں کھڑا نکولس کا انتظار کرتا رہا۔

گودریلو سے رخصت ہو کر نکولس کیلیا جن کے پاس گیا اور اس سے مصافحہ کیا۔

''خوب، آ گئے نا!''

''جی ہاں۔''

''آج کل کس مضمون کی طرف توجہ ہے؟ کیا سائنس کا مطالعہ رہتا ہے؟''

Scanned with CamScanner

''سائنس؟ اجی نہیں، سائنس مجھے راس نہیں آتی۔''

''کیوں؟''

''سائنس ایک ایسا مضمون ہے جس کا سکون کی حالت ہی میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے، اور میں تو—''

''بڑے منطقی ہو میاں— بالکل میری بیوی کی طرح!'' کیلیا جن نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا اور پھر اپنے مذاق پر خود ہی قہقہہ لگایا۔

نکولس نے اپنی تعلیم میں رخنہ پڑ جانے کا سارا قصہ سنایا۔

''میں تو کہتا ہوں بھائی، اس جھگڑے سے کچھ حاصل نہیں ہے،'' کیلیا جن کہنے لگا۔ ''اب اس سے کچھ نہیں مل سکتا۔ ہمارے نوجوان بیکار زندگی گنوار ہے ہیں۔ آخر تم لوگ امیروں کا کیا کرنا چاہتے ہو؟ تم ان کی اصلاح تو کر نہ سکو گے۔ وہ سب کے سب جاہل اور احمق ہیں۔ بس اپنا پیٹ بھرنے، شرابیں پینے اور خوب سونے کے علاوہ ان لوگوں کو کوئی کام نہیں ہے۔''

کیلیا جن کو امیروں سے بڑی چڑ تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ان لوگوں کے لیے ایک پھٹے ہوئے جوتے کی قربانی کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔

''میرے دوست،'' اس نے کہا، ''میں ان لوگوں کو سدھارنے کے لیے بہت کچھ قربانیاں کر کے دیکھ چکا ہوں، لیکن اب اس حماقت پر پشیمان ہوں۔ دیکھو نا، میرے ہم سبق بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور میں ایک معمولی کلرک ہوں۔ آج کل مقامی آبکاری کے دفتر میں کام کرتا ہوں۔ وہ دیکھو، وہ جو سرخ عمارت نظر آ رہی ہے، وہی ہمارا دفتر ہے۔ اچھا، اب اجازت چاہتا ہوں۔ پھر کبھی ملنا۔''

دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ چوپائے چراگاہوں سے لوٹ رہے تھے۔ اچانک گاؤں کی خاموش اور پرسکون فضا ایک شور و شغب سے گونج اٹھی۔ گائیں بیل ڈکرانے لگے۔ کہیں بچھڑے کلیلیں کر رہے تھے اور کہیں بھیڑوں کی ئیں ئیں سنائی دے رہی تھی۔ عورتیں چلّا چلّا کر

مرغیوں کو پکار رہی تھیں۔ گوالے چیخ چیخ کر گائیں ہانک رہے تھے۔ کبھی کبھی گاڑی بانوں کے چابک کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔

لمحہ بھر میں ساری فضا دھول سے اٹ گئی۔

غروب ہوتے ہوئے سورج کی پھیکی شعاعوں سے منور آسمان سنہرا اور نہایت دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ دیہات کی سادہ زندگی کی یہ مشغول ترین اور مسرور ترین گھڑیاں تھیں۔

❁

ایک ہفتہ گزر گیا۔

ایک دن مقامی پولیس نے اسٹیفن کو بلا بھیجا۔ انھوں نے اس کا بیان لیا اور ہدایت کی کہ نکولس کو بھی کسی دن کوتوالی بھیجیں تاکہ کچھ ضروری کاغذات پر دستخط کرا لیے جائیں۔ اسٹیفن پولیس کے داروغہ سے بھی جا کر ملا۔ داروغہ ایک قابلِ عزت شخص تھا۔ وہ بہت اچھے سجاؤ کا مالک تھا اور لوگ کہتے تھے کہ اس کی شکل جنرل ڈریگومراف سے بہت کچھ ملتی ہے۔ خود داروغہ کو اس مماثلت پر بہت فخر تھا۔

بوڑھا داروغہ اسٹیفن کا دوست تھا۔ نکولس کو وہ اپنا منھ بولا بیٹا کہتا تھا۔ اس دن نکولس کے متعلق اس نے اسٹیفن سے کیا کہا یہ تو کسی کو معلوم نہیں، البتہ اس دن کے بعد سے اسٹیفن اپنے بیٹے سے بہت اچھی طرح پیش آنے لگا۔ صرف کبھی کبھی وہ نکولس سے کہا کرتا تھا:

''میری مانو تو تمھیں سب سے ملتے جلتے رہنا چاہیے اور نہایت سمجھ بوجھ سے کام لینا چاہیے۔ تم اپنے منھ بولے باپ کے گھر کیوں نہیں جاتے؟ یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ —''

''اچھا، اچھا، میں ان کے پاس جاؤں گا،'' نکولس نے قطع کلام کر کے کہا۔ لیکن باوجود کئی بار بلاوا آنے کے نہ تو وہ داروغہ کے ہاں گیا اور نہ کوتوالی۔ اب نکولس تنہائی کو زیادہ پسند کرتا، اس لیے کندھے پر بندوق رکھے وہ دن بھر جنگل اور چراگاہوں میں گھومتا رہتا۔

ایک دن شام کے وقت نکولس گھر لوٹا تو میاں بیوی باغیچے میں ایک جھاڑی کے پاس بیٹھے تھے۔ قریب ہی چائے کا پانی ابل رہا تھا۔ میریا اپنے خاوند کے موزے سی رہی تھی۔ بوڑھے کے چہرے سے کبیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ میریا بھی قدرے ہراساں سی نظر آ رہی تھی۔ شاید نکولس کے

Scanned with CamScanner

متعلق گفتگو کرتے کرتے دونوں میں جھڑپ ہو گئی تھی۔

ماں نے چائے کی پیالی نکولس کو پیش کی اور محبت بھرے لہجے میں پوچھا، ''کہاں گئے تھے بیٹا؟''

''یونہی چہل قدمی کرنے،'' نکولس نے جواب دیا، اور پاس کی جھاڑی پر اپنی ٹوپی پٹخ دی۔

تب وہ میز پر بیٹھ گیا اور چائے پینے لگا۔

''کیا مذاق بنا رکھا ہے؟'' اسٹیفن نے تلخ ہو کر کہا۔ اس کی نگاہیں اخبار پر جھکی ہوئی تھیں۔

نکولس کا چہرہ کچھ سرخ ہو گیا لیکن اس نے ضبط کو ہاتھ سے نہ دیا — وہ خاموش رہا۔ کافی دیر تک کوئی بات نہ ہوئی۔ صرف کبھی کبھی میریا کوئی انٹ شنٹ بات کہہ کر اس سکوت کو توڑنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

''میرا خیال ہے،'' بڑھیا یونہی کہنے لگتی تھی، ''آج بارش کا خطرہ تو نہیں۔''

''آج کوتوالی سے ایک نوٹس آیا ہے،'' بہت دیر بعد اسٹیفن نے اخبار الگ رکھ کر کہا۔ ''میں نے تم سے بارہا کہا ہے کہ وہاں ہو آؤ، لیکن تم تو کسی کی بات پر کان ہی نہیں دھرتے۔ آخر مجھے کس مصیبت میں پھنسانے والے ہو بھئی؟''

نکولس نے اپنے والد کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ نوٹس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور پولیس کی طرف سے ایسا طلبانہ آنا کوئی غیر متوقع بات نہیں۔ لیکن بڑے میاں کی عقل نے کوئی عذر قبول نہ کیا، بلکہ وہ اور بھی بگڑ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے:

''مجھے کیا پڑھاتے ہو، کیا میں خود نہیں سمجھتا؟ آج گاؤں بھر مجھ پر انگلیاں اٹھاتا ہے اور تم اپنی ہی ہانکے جاتے ہو۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم داروغہ صاحب کے پاس کیوں نہیں جاتے؟ اس طرح عیاری سے کام لے کر تم مجھے رسوا کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔''

''واہ، آج تو ضرور کوئی تر مال بنا ہے!'' اسی لمحے احاطے کی چاردیواری کی اوٹ سے ایک مانوس آواز سنائی دی۔ اسٹیفن کے لنگوٹیے دوست وہی محرر صاحب تھے۔

''کیا چائے پانی ہو رہا ہے؟'' محرر نے پوچھا۔

''آیئے، آیئے، تشریف لایئے،'' میریا نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اس موقعے پر محرر کی آمد اسے کھلی نہیں بلکہ وہ خوش ہوئی کہ اس کے آنے سے بات بڑھتے بڑھتے ایکا ایکی رک گئی۔

Scanned with CamScanner

پھاٹک کھلنے کی آواز سنائی دی اور ایک پستہ قد شخص باغیچے میں داخل ہوا۔ اس کے سر پر پھونس کی ٹوپی تھی اور وہ اپنی چال ڈھال، وضع قطع اور بات چیت سے بالکل ناٹک کا کوئی مسخرہ معلوم ہوتا تھا۔

دعا سلام کے بعد اسٹیفن نے اپنے بیٹے کا تعارف کرایا۔

''اوہو، انقلابی صاحب! آپ سے مل کر تو مجھے بے پناہ خوشی ہوئی ہے۔ دور سے آپ کی زیارت کی سعادت تو مجھے پہلے بھی نصیب ہو چکی ہے لیکن قریب سے نیاز حاصل کرنے کا موقع آج ہی حاصل ہوا ہے۔''

تب دونوں بڈھے بغاوت اور سیاسی انتشار کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔ محرر انگلستان کا زبردست مخالف تھا۔ انگریزوں کی ہر چال سے اسے سیاسی عیاری اور دجل وفریب کی بو آتی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے خیالات کو صاف الفاظ میں ظاہر نہ کر سکتا تھا تاہم اس کا عقیدہ تھا کہ نوجوانوں کو اکسانے میں غیر ملکی سازشیوں کا ہاتھ ہے۔ لیکن اسٹیفن اس بات کو بے بنیاد سمجھتا تھا اور محرر کو فراست کا پتلا سمجھتے ہوئے بھی وہ اس کے اس نظریے کا قائل نہ ہو سکا تھا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ بیرونی لوگ کس طرح ہمارے ملک پر اثر انداز ہو سکتے ہیں،'' اسٹیفن نے کہا۔

''اجی جناب، یہ غیر ملکی لوگ بڑے حضرت ہیں،'' محرر نے حقارت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ تمام ہلچل یہودیوں کی وساطت سے مچائی جا رہی ہے۔ یقین کیجیے، یہ غیر ملکیوں کے ہتھکنڈے ہیں۔''

''ممکن ہے بھائی،'' اسٹیفن نے سپر ڈالتے ہوئے کہا، ''لیکن یہ تو کہو، اب میری مصیبت کیسے دور ہو سکتی ہے؟''

''واہ، اس کا تو بہت آسان سا نسخہ ہے،'' محرر بولا۔ ''داروغہ تمھارے بیٹے کا منھ بولا باپ ہے نا؟ وہ چاہے تو کیا نہیں کر سکتا۔ جنرل ڈریگومراف جیسی عظیم المرتبت ہستی کا وہ رشتے دار ہے۔ اس کے لیے کیا بات غیر ممکن ہے!''

''وہ ڈریگومراف کا رشتے دار نہیں ہے،'' اسٹیفن بولا، ''صرف دونوں کے چہروں میں مشابہت ہے۔''

''اجی نہیں!'' محرر نے اپنی بات رکھنے کے لیے کہا۔ ''مجھے خوب معلوم ہے کہ وہ جنرل کا

قریبی رشتے دار ہے۔ میں کہتا ہوں، نکولس کو داروغہ کے پاس ضرور بھیجو اور خود تم بھی جاؤ۔''

''ارے بھئی، میں تو پہلے ہی اس کے ہاں ہو آیا ہوں اور ان حضرات سے سینکڑوں بار کہہ چکا ہوں کہ اپنے منھ بولے باپ سے جا کر ملو، لیکن ان کا دماغ ہی خیر سے چوتھے آسمان پر ہے۔''

اسٹیفن اپنے لڑکے کی بے نیازی دیکھ کر بہت چراغ پا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی یہ اشتعال اتنی بھیانک صورت اختیار کر لیتا تھا کہ میریا اور نکولس دونوں ہراساں ہو جاتے تھے۔ اس وقت انھیں اس بات کا ڈر ستایا کرتا تھا کہ کہیں باتوں ہی باتوں میں معاملہ بگڑ نہ جائے۔ آج بھی اسٹیفن بہت جوش میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ باہر نکال لیے اور زور زور سے چلّانے لگا:

''اوہو ہو ہو، میں کتنا بوڑھا ہو گیا ہوں! دیکھو، میرے ہاتھ اب کس طرح کانپنے لگے ہیں۔''

واقعی بوڑھے کا ہاتھ ایسے کانپ رہے تھے جیسے اسے جاڑے کا بخار چڑھ رہا ہو۔

''دیکھتے ہو؟''

اسٹیفن اپنے بیٹے کی طرف مڑا، لیکن نکولس پہلے ہی کھسک گیا تھا۔ گفتگو کا رنگ بدلتے دیکھ کر وہ چپکے سے باغیچے سے باہر نکل گیا۔

اس دن نکولس بہت رات گئے تک گھر نہ لوٹا۔ اس کے دل میں گھر جانے کی خواہش ہی نہ پیدا ہوئی۔ بہت دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد وہ ایک مکان کے سامنے رک گیا اور اس کے دریچے پر دستک دی۔ دیوار کی ایک دراڑ سے دھیمی دھیمی روشنی چھن رہی تھی۔

''گودریلو!'' نکولس پکارا۔

دروازہ کھلا اور ایک اونگھتے ہوئے آدمی نے باہر جھانک کر دیکھا۔

''گودریلو! میں اندر آنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور ضرور!'' وہ شخص بولا۔

''اور کچھ شراب بھی۔''

''واہ! یہ تو تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔''

یہ کہہ کر گودریلو نے میز پر ایک بوتل لا رکھی۔

Scanned with CamScanner

نکولس بہت دیر تک اس ہوٹل کے کمرے میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس کا سر ہتھیلیوں پر ٹکا ہوا تھا۔ سامنے وہی شراب کی بوتل دھری تھی۔ بار بار اس کے دماغ میں ایک خیال جاگ اٹھتا تھا۔

''اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

جوں جوں وہ خیال جڑ پکڑتا جاتا تھا، حزن و یاس اس پر مستولی ہوتے جاتے تھے۔ ہوٹل کے اس مکمل سکوت کے عالم میں وہ بار بار گنگنار ہا تھا:

دل رہینِ غمِ جہاں ہے آج
ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج
سخت ویراں ہے محفلِ ہستی
اے غمِ دوست تو کہاں ہے آج

''گودریلو! ایک بوتل اور۔''

بوتل آ گئی اور نکولس پھر داد ِمے کشی دینے لگا۔

سخت ویراں ہے محفلِ ہستی
اے غمِ دوست تو کہاں ہے آج

لیکن اچانک، نہ جانے کیوں، اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ اس کے تصور کی پہنائیوں میں بے شمار یادیں ہجوم کر آئیں۔ جوں جوں وہ یادیں زیادہ واضح ہوتی گئیں اس کے دل کی کسک بھی مٹتی گئی۔ وہ اپنے گھر کو بھی بھلا بیٹھا۔ اب اسے ہوٹل کا گندہ فرش نظر آتا تھا اور نہ وہ کالی کالی دیواریں۔ پاس کے کمرے سے جو بلیرڈ کھیلنے کی آواز آ رہی تھی وہ بھی بند ہو چکی تھی۔ نکولس اپنے خیالات میں محو تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ اچانک اسے تصور ہی تصور میں کیف کی وہی پر ہجوم سڑکیں اور بجلی کی روشنی سے بقعہ نور بنی ہوئی دکانیں نظر آنے لگیں۔ پھر وہی شور نغمہ سنائی دینے لگا۔ وہی ہلچل — وہی —

نکولس کا چہرہ ان تصورات کے پرتو سے جگمگا اٹھا اور وہ مسکراتا ہوا پاس کھڑے نیم مدہوش گودریلو سے پوچھنے لگا:

''کہو دوست، کبھی کیف گئے ہو؟''

Scanned with CamScanner

''نہیں،'' گودریلو نے چونک کر جواب دیا۔ ''وہاں ایسے ہوٹل تو بیسیوں ہوں گے؟''

نکولس کھلکھلا کر ہنس دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا دوست! شکریہ۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

رات بہت گزر چکی تھی۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رات چاندنی کی رِدا اوڑھ کر خود بھی سو گئی ہو۔ فضائے بسیط میں گاؤں کے گھنٹہ گھر کی ٹن ٹن کی آواز گونج اٹھی۔ اس کی آواز کتنی سوزناک تھی۔ یہ آواز بہت دیر تک فضا میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی گونجتی رہی اور پھر چاندنی کی خاموش کرنوں سے ٹکرا کر خود بھی خاموش ہو گئی۔

نکولس آہستہ آہستہ اپنے گھر کی جانب لوٹ رہا تھا۔ سڑک کی پٹری پر اس کے جوتے کی آواز گونج اٹھتی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک جگہ رک گیا اور نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ تارے ٹمٹما رہے تھے۔ اچانک اسے فرانس کا مشہور انقلابی نغمہ ''مارسیز'' یاد آ گیا اور وہ چلا چلا کر گانے لگا:

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب

وز جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب انقلاب

انقلاب، اے انقلاب

لیکن یکا یک پاس کی کسی دکان سے ایک کتا بھونک اٹھا اور نکولس کو گانا بند کرنا پڑا۔ سڑک پر پھر سناٹا چھا گیا۔ اب صرف اس کے چلنے کی آہٹ تھی جو اس وقت محوِ خیال رات کے سکون میں مخل ہو رہی تھی۔

❁

اس دن بہت رات گزر جانے پر بھی نکولس کی آنکھ نہ لگی۔ وہ گھنٹوں دیوان خانے میں صوفے پر پڑا رہا۔ اس کے دماغ میں بے شمار یادیں کلبلانے لگیں۔ اسے اپنا زمانۂ طالب علمی یاد آنے لگا۔ کیف میں گزرے ہوئے وہ ایام کتنے ہنگامہ ساماں تھے۔ بار بار یہ تصویر اس کے تصورات کی سطح پر ابھر آتی تھی۔ لیکن ان یادوں میں بھی ایک یاد اسے خاص طور پر بے چین کرنے لگی۔ اس واقعے کو یاد

کر کے وہ مسرور بھی ہوا اور حزیں بھی۔ وہ یاد اسے بے چین کر رہی تھی لیکن وہ اسے اپنے حافظے سے محو کر دینے پر قادر نہ تھا — اور شاید وہ یہ چاہتا بھی نہ تھا۔

ان دنوں وہ کیف کے قید خانے میں تھا۔ دن پہاڑ کی طرح کٹتے تھے، ایک دن ایک سال معلوم ہوتا تھا۔ وہاں کسی کی آواز سنائی پڑتی اور نہ کسی کی صورت دکھائی دے جانے کا امکان تھا۔ رات دن وہی کال کوٹھری تھی اور اس کی بھدی اور کریہہ المنظر دیواریں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے جیتے جی گوشۂ قبر میں دفنا دیا گیا ہو۔

یکا یک ایک دن کوٹھری کا دروازہ کھلا اور داروغہ جیل داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک سنتری بھی تھا جو پوری طرح مسلح تھا — کمر سے تلوار لٹک رہی تھی اور بغل میں پستول۔

"آپ کا کوئی ملاقاتی آیا ہے،" داروغہ بولا۔

نکولس نے اپنی ٹوپی پہنی اور بھاری کوٹ کندھے پر ڈال لیا۔ داروغہ چلا گیا لیکن وہ سنتری ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ نکولس اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ان کا راستہ ایک تنگ و تاریک گیلری میں سے ہو کر نکلتا تھا۔ دونوں طرف قیدیوں کی کوٹھریاں تھیں۔ دروازوں پر سلسلہ وار نمبر پڑے ہوئے تھے۔ ہر پنجرے میں ایک ایک آدمی اس طرح بند تھا جیسے چڑیا گھر میں جانور۔

"کون آیا ہوگا؟" نکولس سوچنے لگا۔ "کیا امی؟ لیکن اسے تو میرے قید ہو جانے کی ابھی اطلاع بھی نہ ملی ہوگی۔ تب کون ہو سکتا ہے؟ میرے ہم سبقوں کا آنا بھی ممکن نہیں ہے۔ وہ یا تو قید ہو چکے ہیں یا ملک بدر کر دیے گئے ہیں۔ اور کوئی بچ بھی گیا ہوگا تو اسے یہاں کون آنے دے گا؟"

"کیوں بھائی! کون آیا ہے؟" نکولس نے سنتری سے پوچھا۔

"صاحب، ہمیں قیدیوں سے بات چیت کرنے کی اجازت نہیں،" اس نے جواب دیا۔

"لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمھیں مغالطہ ہوا ہے۔ وہ شخص کسی اور سے ملنے آیا ہوگا۔"

سنتری نے چاروں طرف احتیاطاً دیکھا، پھر آہستگی سے کہا:

"اجی، آپ ہی کی بیگم صاحبہ تشریف لائی ہیں۔"

"بیگم صاحبہ؟"

نکولس چونک پڑا۔ اس کے قدم چلتے چلتے رک گئے اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا

Scanned with CamScanner

جی چاہتا تھا کہ خوب ہنسے، دل کھول کر ہنسے۔

''چلیے، رک کیوں گئے آپ؟'' سنتری نے متعجب ہو کر کہا۔

لیکن نکولس کے دل میں تو طوفان بپا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صرف نہایت قریبی رشتے دار ہی جیل میں ملنے کے لیے آسکتے ہیں، اس لیے کسی کی محبوبہ کا آنا ممکن نہیں۔ لیکن اس کے پاس آنے والا کون ہو سکتا ہے؟

''انھوں نے میری منگنی تو نہیں کر دی؟'' اچانک اسے خیال پیدا ہوا۔ اور اس کا دل اور بھی زوروں سے دھڑکنے لگا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھی اور وہ بلا قصد مسکرا دیا۔

''لیکن وہ کون ہوگی جس سے میری منگنی ہوئی ہے؟'' وہ اپنے آپ سے پوچھنے لگا۔ اس کے دل میں ایک عجیب کھلبلی مچ رہی تھی۔

''بیگم!'' وہ پھر سوچنے لگا۔ ''اس لفظ میں کتنا سرور بھرا ہے۔ کتنی مسرت، کتنا نشاط — لیکن وہ ہے کون؟''

نکولس تیزی سے سنتری کے آگے آگے چلنے لگا۔ وہ جلد ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گئے۔ سامنے ایک دوسرا کمرہ تھا۔ وہ بھی ایسا ہی تھا اور میلا تھا۔ لیکن دونوں کمروں کے درمیان کوئی دروازہ نہ تھا بلکہ صرف ایک کھڑکی تھی، جس میں شیشوں کی جگہ پیتل کی جالی لگی ہوئی تھی۔ نکولس نے اس کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ زعفرانی کپڑوں میں ملبوس ایک حسین اور نوخیز لڑکی کھڑی تھی۔

''تسلیم،'' وہ مسکرا کر بولی۔

پاس ہی ایک پولیس افسر کھڑا تھا۔ جب وہ اپنا پاؤں ہلاتا، اس کا 'چار آئینہ' کھنک اٹھتا تھا۔

''تسلیم،'' نکولس نے جواب دیا اور دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''آپ کچھ اداس نظر آتے ہیں،'' لڑکی نے پوچھا۔

''نہیں تو،'' نکولس نے جواب دیا۔ لیکن وہ حیران ہو رہا تھا۔ بار بار وہ سوچ رہا تھا، ''کیا میں نے اسے کہیں دیکھا ہے؟'' لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ وجہ یہ تھی کہ لڑکی کے چہرے پر ہلکے لاجوردی رنگ کا گھونگھٹ پڑا تھا۔ اس کے علاوہ جالی کی اوٹ سے بالکل صاف نظر آنا بھی مشکل تھا۔

''اگر آپ اپنا گھونگھٹ کھول سکیں،'' نکولس نے شرماتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

Scanned with CamScanner

''ضرور!''

اتنا کہہ کر لڑکی نے اپنی نقاب اٹھا دی۔ دو سحر بھری آنکھیں نکولس کی طرف دیکھ کر چمک اٹھیں۔ وہ لجا سا گیا اور اس کے رخساروں پر سرخی سی دوڑ گئی۔

''کتنا دلنواز مکھڑا ہے،'' نکولس نے اپنے دل میں سوچا۔ ''اتنا حسین چہرہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

اس وقت پاس کھڑا ہوا پولیس افسر چوکنا ہو کر دیکھنے لگا۔ وہ بار بار کھانستا تھا اور اپنے اسلحے کو کھنکھنانے لگتا تھا، گویا یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے ہر بات اچھی طرح سنائی دے رہی ہے۔

''آپ اپنی گولیا کو تو بھول ہی گئے'' وہ پھر بولی۔

''نہیں تو،'' نکولس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا اٹھا لیکن اس کی نگاہیں ابھی تک جھکی ہوئی تھیں۔

لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنستے وقت اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگے اور آنکھیں کسی غیر ارضی مسرت سے تمتما اٹھیں۔

پھر پولیس افسر کی کھن کھن سنائی دی۔

''از راہِ نوازش اتنا شور نہ کیجیے،'' وہ بولا۔

''واہ صاحب، یہ آپ نے خوب کہی! کیا یہاں ہنسنے کی بھی اجازت نہیں؟'' لڑکی نے شوخی سے پوچھا۔

''جی نہیں، باآواز ہنسنے کی اجازت نہیں۔''

''اور رونے کی؟''

''یہاں نہ ہنسنے کی اجازت ہے اور نہ رونے کی،'' پولیس افسر نے جواب دیا۔

جب دونوں خاموش ہو گئے تو نکولس نے پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا:

''آج کل باہر موسم تو خوب خوشگوار ہو گا؟''

''جی ہاں، آج کل پھولوں پر ایسی بہار ہے کہ فضا مہکتی رہتی ہے،'' وہ کہنے لگی، ''اور تارے بھی اتنے صاف چمکتے ہیں اور اتنے بڑے نظر آتے ہیں جیسے زمین کے قریب آ گئے ہوں۔ اگلی دفعہ جب

Scanned with CamScanner

میں آؤں گی، آپ کے لیے کچھ پھول لاؤں گی۔ کہیے، کون سا پھول آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے؟''

''جون سا بھی آپ لے آئیں،'' نکولس لجاتا ہوا بولا۔''میں انھیں اپنی کوٹھڑی میں رکھوں گا اور وہ مجھے آپ کی یاد دلاتے رہیں گے۔''

اس نے لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر آنکھوں سے آنکھیں مل گئیں۔ وہ شرما گیا اور اس کے رخساروں پر سرخی جھلکنے لگی۔

''آپ فکر نہ کریں، میں ہفتے کے ہفتے آپ سے ملنے آیا کروں گی۔''

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ اس وقت جیل کی گھڑی نے ٹن ٹن دو بجائے۔

سنتری نے دروازہ کھولا اور کہا،'' چلیے، وقت ختم ہو گیا ہے۔''

''اچھا، تسلیم،'' گولیا نے مہر بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔''غم نہ کیجیے۔ جہاں بھی رہیے، خیال رکھیے کہ آپ وفا فراموش ثابت نہ ہوں۔''

نکولس جواب میں فقط مسکرا دیا لیکن اس کے تبسم میں ایک سوز پنہاں تھا۔ آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے، دل اچھلا پڑتا تھا۔ اچانک اس کے دل میں مسرت کا ایسا طوفان امڈ آیا کہ اسے جی بھر کر رونے کی خواہش ہوئی۔

دروازہ بند ہو گیا۔ پھر وہی کال کوٹھڑی، وہی سناٹا۔ یکا یک نکولس کے دل میں گانے کی خواہش انگڑائی لینے لگی اور وہ اونچے سُروں میں کسی پرانے روسی گیت کی تانیں الاپنے لگا:

تجھی پیار کروں گا تجھ سے، ساتھ چلوں گا تیرے...

''یہاں ناچنے گانے کی اجازت نہیں!'' اچانک کسی کی کرخت آواز سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دروازہ ہی انسانی زبان سے بول اٹھا ہو۔

''اور محبت کرنے کی؟'' نکولس نے گانا بند کر کے پوچھا۔

کوئی جواب نہ ملا۔

اس دن نکولس کے دل میں مسرت کی لہریں اتنے زور سے امڈنے لگیں کہ کچھ دیر کے لیے وہ اپنی پابندیوں کو بھول سا گیا اور خوشی کے مارے دن بھر بچوں کی طرح اچھلتا کودتا رہا۔ کبھی وہ

Scanned with CamScanner

جانوروں کی طرح سر اٹھا کر کوٹھری میں دوڑنے لگتا تھا، کبھی مٹھیاں بھینچ کر دیواروں کی طرف لپکنے لگتا تھا۔ ایک دفعہ تو اس نے اچھل اچھل کر ناچنے کی بھی کوشش کی۔

''واہ! یہ تو ایسے اُدھم مچا رہا ہے جیسے آج اس کی سالگرہ ہو!'' سنتری نے دروازے کی درز میں سے جھانک کر دل ہی دل میں کہا۔

واقعی نکولس کے دل میں آج بے پایاں مسرت کا طوفان موجزن تھا۔ اس طرح ناچتے کودتے شام ہوگئی۔ ہفتے کا دن تھا۔ گرجا کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ان کی سریلی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ یکا یک نکولس کے دل کا طوفان تھم گیا اور وہ طرح طرح کے تصورات میں کھو گیا۔ اسے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ دل میں ایک طرح کا اضطراب پیدا ہوا اور اس کا چہرہ ملول سا ہو گیا۔ اس نے کوٹھری کی کھڑکی کھول دی۔ آسمان صاف اور نیلگوں تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور شام کی رخصت ہوتی ہوئی کرنیں جیل کے در و دیوار کو خوں رنگ روشنی سے منور کر رہی تھیں۔ پاس ہی کچھ کبوتر کلیلیں کر رہے تھے۔

نکولس کھڑکی میں سے غروب آفتاب کا نظارہ کرنے لگا۔ اس کا جی اور بھی اداس ہو گیا۔ دل میں درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ ان آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے والے پرندوں کو دیکھ کر اسے اپنی آزادی یاد آ گئی۔

دھند لکے گہرے ہوتے گئے۔ بہار کی سہانی رات تھی۔ کھڑکی کے سامنے سرکاری لیمپ روشنی پھیلا رہا تھا۔ قریب سے کسی کے گانے کی آواز کان میں آ رہی تھی:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

شاید داروغہ کے بنگلے میں کوئی گا رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک بلبل بھی جیل کی دیوار پر بیٹھا چہچہانے لگتا تھا۔ نکولس آزردہ سا ہو گیا۔ ایک عجیب طرح کی ویرانی نامحسوس طور پر اس کے دل پر چھانے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کی خلش کا باعث کیا ہے۔ فقط ایک ہی خیال رہ رہ کر اسے جھنجھوڑ رہا تھا:

''یہ البیلی لڑکی گولیا آخر ہے کون؟''

پورا ہفتہ وہ اسی طرح بے چین رہا۔ اگلے سنیچر گولیا کو پھر آنا تھا۔ نکولس اب اٹھتے بیٹھتے اسی ساعت کا انتظار کرنے لگا جب وہ اپنی اجنبی محبوبہ کو دیکھ سکے گا۔ نکولس کو ہر آن آنے والے ہفتے کے

Scanned with CamScanner

روز کا دھیان رہتا تھا۔ اسے رات کو نیند بھی نہ آتی تھی۔ ہفتے میں ابھی کتنے دن باقی ہیں؟ اس کا ذہن اسی سوال کو سلجھانے میں رات دن غلطاں رہنے لگا۔

آخر وہ دن آیا۔ نکولس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس دن موسم قدرے خراب تھا۔ مطلع ابر آلود تھا اور بوندا باندی بھی ہورہی تھی لیکن نکولس کو اس کی خبر تک نہ تھی۔ وہ تو اپنی کوٹھڑی میں اس طرح ہشیار اور مستعد بیٹھا تھا جیسے پہرہ دے رہا ہو۔ اس کی نظر دروازے پر لگی ہوئی تھی۔ ذرا سی آہٹ ہونے پر بھی وہ چونک اٹھتا تھا۔

دروازہ کھلا اور سنتری کھانا لے کر داخل ہوا۔

''کوئی ملاقاتی آیا ہے؟'' نکولس نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔

لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس کی نظریں اب بھی دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ کان ہر آواز کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہت دیر تک وہ اسی طرح چشم براہ اور گوش بہ دیوار رہا۔ آخر بے چین ہو کر اس نے کواڑ کھٹکھٹائے، اور سنتری کو پکار کر پوچھا:

''کوئی آیا؟''

لیکن اب کے بھی کوئی جواب نہ ملا۔

شام ہوگئی اور قیدی شام کی حمد گانے لگے۔ نکولس مایوس ہوگیا۔ اب اسے گولیا کے آنے کی امید نہ رہی تھی۔ اتنے میں جیل کا داروغہ قیدیوں کی حاضری لیتا ہوا اس کی کوٹھڑی کے قریب آیا۔ دروازہ کھول دیا گیا اور نکولس کے سامنے کچھ مرجھائے ہوئے پھول رکھ دیے گئے۔

نکولس کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہوگیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا:

''اور میرا ملاقاتی؟''

لیکن اسے جواب نہ ملا۔ داروغہ مسکرایا اور چلا گیا۔ دروازہ بند ہوگیا تو نکولس نے اس کی آواز سنی:

''یہاں تو ہر کوئی کسی نہ کسی کی محبت کا اسیر ہے۔''

نکولس نے ان پھولوں کی پنکھڑیوں میں اپنا چہرہ چھپالیا۔ مرجھا جانے پر بھی وہ پھول ایک بھینی بھینی خوشبو سے مایہ دار تھے۔ نکولس کو تو وہ اور بھی عزیز معلوم ہو رہے تھے کیونکہ کچھ دیر پہلے وہ

Scanned with CamScanner

پھول گولیا کے ہاتھوں میں رہے ہوں گے۔

نکولس ان پھولوں کو کمال احتیاط سے رکھنے لگا۔ وہ ان کی اس طرح حفاظت کرتا تھا جیسے ماں اپنے بچوں کی۔ وہ پھول زیادہ دیر شاداب نہ رہ سکے۔ موت نے انھیں جلد ہی جھلسا دیا اور وہ سیاہ پڑ کر بوسیدہ ہو گئے۔ صرف ایک سوکھا پھول بچ رہا۔ نکولس نے اسے ایک ڈائری میں رکھ دیا۔ جب کبھی وہ اس ڈائری کو کھولتا، اس کی نظریں اس پژمردہ پھول پر جم کر رہ جاتیں، اور پھر وہی خیال اس کے ذہن میں جاگ اٹھتا تھا:

''آخر وہ حسین بھولی بھالی گولیا ہے کون؟''

❁

دوسرے دن صبح کمرے میں ایک عجیب طرح کی بھنبھناہٹ سن کر نکولس کی آنکھ کھل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سارا گھر اس دھیمی آواز سے گونج رہا ہو۔ نکولس نے لہجے سے پہچانا کہ یہ اس کے ابا جان کی آواز ہے۔ وہ اپنی صبح کی مناجات میں مشغول تھے۔ کبھی کبھی بوڑھے کے گھٹنوں کے چٹخنے کی آواز آتی تھی۔ اپنے متعلقین اور احباب کے لیے دعا کرنے کے بعد وہ اٹھا اور اپنا پائجامہ جھاڑتا ہوا بڑبڑایا:

''خداوندا! اگرچہ وہ غلط راستے پر ہے، تاہم اسے اپنا ایک ادنیٰ بندہ سمجھ کر معاف کر دے۔''

دعا کے بعد اسٹیفن نکولس کو جگاتا ہوا بولا، ''اٹھو۔ آج تمھیں کوتوالی جانا ہے۔''

''اچھا،'' نکولس نے جواب دیا۔

''صرف اچھا نہیں، جلد اٹھ کر ہاتھ منھ دھولو اور دعا سے فارغ ہو لو۔ آج تمھیں ضرور پولیس افسر کے پاس جانا ہے۔''

بوڑھے نے پردہ ہٹا کر کھڑکی کھول دی۔ صبح کی تازہ ہوا، سورج کی کرنیں اور پرندوں کے چہچہانے کی شیریں آوازیں بیک وقت کمرے میں آ پہنچیں۔ قریب ہی میریا کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ برتن مانجھتی ہوئی ان مرغیوں کو للکار رہی تھی جو برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سن کر اس کے گرد آ جمع ہوئی تھیں۔

Scanned with CamScanner

نکولس بہت دیر تک اسی حالت میں بستر پر لیٹے لیٹے گولیا کو یاد کرتا رہا۔ وہ حسب معمول اپنی پھولدار ٹوپی اور سفید پوشاک پہن کر خواب میں آئی تھی اور اس سے سرگوشیاں کرتی رہی تھی۔ لیکن اس نے کیا کہا تھا یہ نکولس کو اس وقت یاد نہ آ رہا تھا۔

''بیٹے اٹھو!'' میریا نے کھڑکی میں سے جھانک کر کہا۔ ''آج تمھیں کوتوالی جانا ہے۔''

نکولس کا سلسلۂ خیالات برہم ہو گیا۔ اس کے جسم میں ایک کپکپی دوڑ گئی اور گولیا کے بارے میں اٹھتے ہوئے خیالات اس طرح غائب ہو گئے جس طرح میریا کی آواز سن کر بکائن کی جھاڑی پر بیٹھے ہوئے پرندے چونک کر اڑ گئے تھے۔

''سنا کہ نہیں؟'' وہ بولی۔ ''آج تمھیں پولیس کے دفتر میں جانا ہوگا۔''

''میں بہرا تو نہیں ہوں!'' نکولس نے چڑ کر جواب دیا۔

وہ کچھ دنوں سے 'پولیس' کا لفظ سنتے ہی مشتعل ہو جایا کرتا تھا۔ بار بار اپنے والدین کی زبان سے 'پولیس'، 'داروغہ' اور 'منھ بولا باپ' وغیرہ الفاظ سن کر اسے غصہ آ جاتا تھا۔

وہ اٹھا اور جلد جلد ہاتھ منھ دھو کر کپڑے پہننے لگا۔ بال بھی اس نے اتنی رواروی میں سنوارے کہ کئی بال کنگھے میں الجھ کر ٹوٹ گئے۔ تب وہ باہر باغیچے میں گیا جہاں چائے تیار ہو رہی تھی۔ میریا نے چائے کی پیالی سامنے رکھی۔ وہ آج نکولس کی طرف بہت توجہ دے رہی تھی۔ اس کا کوتوالی جانا بڑھیا کے لیے بہت اہم بات تھی۔ اس کے دل میں امید و بیم کے جذبات ابھر رہے تھے۔ وہ بار بار دل ہی دل میں نکولس کے لیے دعائیں کر رہی تھی اور اس کی طرف ایسی رحم بھری اور شفقت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ کسی خطرناک مہم پر جا رہا ہو۔

اسٹیفن نے اپنے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ اس دوران میں کبھی کبھی غراتا رہا اور میز پر بکھرے ہوئے روٹی کے ٹکڑے چن چن کر اپنی طشتری میں جمع کرتا رہا۔

نکولس یہ دیکھ کر دل ہی دل میں بے چین ہونے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا والد اپنے افلاس کا مظاہرہ کر کے اسے اپنی بیکسی کی جانب متوجہ کر رہا ہو۔ اسے یہ بات اتنی چبھی کہ اس نے چائے کی پیالی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

Scanned with CamScanner

''ذرا اپنے بال تو ٹھیک طرح سنوار لو،'' بوڑھے نے اپنے دفتر کے لیے روانہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں نائب داروغہ سے گفتگو کرنی ہوگی۔ خدا کے لیے ذرا خوش خلقی سے پیش آنا۔ وہ لوگ میرے دوست ہیں۔ اپنے ترش رویے سے میری دوستی پر حرف نہ لانا۔''

اسٹیفن کے چلے جانے کے بعد بڑھیا اپنے بیٹے سے کھل کر بات چیت کرنے لگی۔

''کل رات کہاں چلے گئے تھے بیٹا؟'' ماں نے پوچھا۔ ''ہم لوگ تو راہ دیکھتے دیکھتے تھک گئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا بات ہوگئی ہوگی۔ بلکہ ہم تو پریشانی کے عالم میں تمھیں کوتوالی میں بھی تلاش کر آئے۔''

نکولس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اسے کچھ طیش سا آیا اور اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

''دن رات کوتوالی اور پولیس!'' وہ چڑ کر بولا۔ ''کیا مجھے کھانا کھاتے وقت بھی چین نہ ملے گا؟ تم تو مجھے پولیس کی بات سنائے بغیر چائے بھی نہیں پینے دیتیں۔''

''لیکن کولیا بیٹے! ہمیں تشویش ہونے لگتی ہے،'' بڑھیا گھبرا کر کہنے لگی۔ ''تم ہماری نگرانی میں ہو۔ تمھارے والد تمھارے لیے جوابدہ ہیں۔ ان پر کسی طرح کی آفت لانا ٹھیک ہوگا کیا؟''

''اچھا، اچھا، اب میں کہیں نہیں جاؤں گا،'' نکولس نے اس ناخوشگوار سلسلۂ گفتگو کو ختم کرنے کی نیت سے کہا۔ ''اور ایسی کوئی جگہ ہے بھی نہیں جہاں میں بھاگ کر جاسکوں، اس لیے آپ لوگوں کو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''بیٹا، تم جانتے ہی ہو کہ حکام نے تمھارے بابا سے جوابدہی کی تحریر لی ہے۔ تم زیادہ دیر غائب نہ رہا کرو۔''

''اچھی بات ہے۔''

''دیکھو نا، کل شام ہی کیلیا جن نے تمھیں بلا بھیجا تھا۔ کہتے ہیں تمھارے بارے میں کوئی رپورٹ آئی ہے۔ کسی خط و کتابت کا پتا چلا ہے۔''

نکولس خاموش رہا۔ تب میریا توصیف آمیز لہجے میں کیلیا جن کا تذکرہ کرنے لگی۔

''دیکھو، اس نے اپنی تعلیم ختم کر لی ہے۔ عہدہ بھی اچھا مل گیا ہے اور شادی بھی ہوگئی ہے۔

Scanned with CamScanner

بہو بھی کتنی اچھی ملی ہے اسے!'' میریا نے ایک آہ بھر کر کہا اور ایک آزردہ نگاہ سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

''مجھے بھی ایک بہو مل گئی ہے،'' نکولس نے مسکرا کر کہا۔

''سچ؟'' میریا نے اس کی بات پر اعتبار نہ کیا اور پوچھا، ''کون ہے وہ؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''واہ، یہ اچھی رہی۔ اچھا، یہ تو بتاؤ وہ کسی امیر خاندان کی ہے یا معمولی گھرانے کی؟''

''یہ بھی مجھے نہیں معلوم۔''

''اس کا نام؟''

''کہہ نہیں سکتا۔''

میریا یہ جواب سن کر ہنسنے لگی۔

''یوں تو دنیا میں ہزاروں خوبصورت لڑکیاں ہیں،'' بڑھیا بولی۔ ''لیکن اب اس حالت میں کوئی بھی تمھیں قبول کرنے پر رضامند نہ ہوگی۔''

''ممکن ہے۔ لیکن وہ لڑکی تو بخوشی مجھ سے شادی کر لے گی۔''

''تب تو وہ بہت مستقل مزاج ہوگی۔ لیکن کو لیا، تم نے اپنے سکھ کے سب موقعے کھو دیے۔ اگر آج تو بھی پڑھ لکھ کر کہیں کوئی اچھا عہدہ پالیتا تو گھر میں خوبصورت دلہن آتی اور —''

''ماں! تم ہر روز رو رو کر میرے قدم ڈگمگا دیتی ہو،'' نکولس کھیاں اڑاتا ہوا بولا۔

''بیٹا! ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟ میرا دل تمھیں اداس دیکھ کر کتنا بے کل رہتا ہے۔'' ماں کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

''ماں، کیوں بیکار غم کرتی ہو؟ میں جو کچھ کرتا ہوں اپنے عقیدے کے مطابق ٹھیک سمجھ کر ہی کرتا ہوں۔ میں اس راستے سے منحرف نہیں ہو سکتا۔''

نکولس اٹھا اور کوتوالی کی طرف روانہ ہو گیا۔ بڑھیا پھاٹک تک اس کے ساتھ ساتھ آئی۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے چپکے سے صلیب کا مقدس نشان بنا کر دھیمی آواز میں کہا:

''جاؤ، خداوند تمھارا مددگار رہو۔''

Scanned with CamScanner

❁

گاؤں کے گرجا گھر کے سامنے پیلے رنگ کی ایک عمارت تھی۔ اس کی چھت پر ایک بدوضع منارہ تھا۔ نیچے ایک بڑا وسیع برآمدہ تھا جس میں دیہاتی مردوں عورتوں کا ہمیشہ ایک ہجوم نظر آیا کرتا تھا۔ نکولس نے وہ عمارت دیکھی تو اسے معاً اپنے والد کے لمبے لمبے خطبے اور اپنی والدہ کے آنسو نظر آنے لگے۔ اس کالی کلوٹی عمارت کو دیکھ کر اسے اپنے منھ بولے باپ کی یاد بھی آ گئی اور اس کے دل میں پھر کھلبلی مچنے لگی۔ اسے وہ مکان ایسا مقتل معلوم ہونے لگا جس کا ذکر اس نے بچپن میں ایک دہشتناک کہانی میں پڑھا تھا۔

جب نکولس اس مکان کے برآمدے میں پہنچا تو وہاں بیٹھے ہوئے دہقان اس کی بھڑکیلی پوشاک کو دیکھ کر تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مردوں نے اپنی ٹوپیاں اتار لیں اور عورتوں نے سر جھکا لیے۔ ایک دہقان دھیمی آواز میں اپنے لہجے کو حسرت آگیں بناتا ہوا بول اٹھا:

''ہے خداوندا!''

اس ایک لفظ میں کتنا درد، کتنا سوز مضمر تھا۔

نکولس آگے بڑھا۔ سیڑھیوں کے آس پاس بھی دیہاتیوں کا ہجوم تھا۔ فرش پر کچھ عورتیں بیٹھی تھیں۔ قریب ہی ایک چپراسی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا عورتوں سے ٹھٹھول کر رہا تھا۔ ہر طرف کچھ ایسی بو پھیلی ہوئی تھی جیسی بہت سے چوہوں کے ایک ساتھ مر جانے سے پیدا ہوتی ہے۔

نکولس نے ان لوگوں سے وہاں جمع ہونے کی وجہ پوچھی۔ یکا یک بیسیوں آدمی یک زبان ہو کر بول اٹھے:

''ہم گواہی دینے آئے ہیں بھیا۔''

وہ اس طرح چلا اٹھے جیسے انھیں امید ہو کہ چمکیلے بٹنوں والا یہ نوجوان ضرور ان کی کچھ دستگیری کر سکے گا۔

سیڑھیاں چڑھ کر نکولس اوپر پہنچا۔ سامنے ایک چپراسی کھڑا تھا۔ اس نے آ کر پوچھا:

''فرمائیے، کیا کام ہے؟''

Scanned with CamScanner

نکولس کا جواب پا کر چپراسی اسے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا اور اسے وہاں بٹھا کر باہر چلا گیا۔ نکولس بہت دیر بیٹھا رہا۔ ہر چہار طرف سے مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کہیں کاغذ پھڑ پھڑا رہے تھے اور کہیں تیزی سے قلم چر چرا رہے تھے۔ کبھی کبھی سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ بھی سنائی دے جاتی تھی۔

نکولس اس بھگدڑ کی آوازیں سنتے سنتے کسل اور کوفت سی محسوس کرنے لگا۔ اس کی طبیعت بوجھل ہوگئی اور اسے نیند سی آنے لگی۔ ہوتے ہوتے اس کے تمام جسم میں ایسی سنسنی دوڑ گئی جیسے اس کے تمام اعضا ماؤف ہو گئے ہوں۔ اس کی پیشانی ٹھنڈی پڑ گئی۔ خیالات دھندلے ہو کر منتشر ہو گئے اور گویائی جیسے سلب ہوگئی۔

بہت دیر تک نکولس اسی نیم بیہوشی کی حالت میں بیٹھا رہا۔ پھر اسے کسی کی آواز سنائی دی:

''چلیے۔''

نکولس نے آنکھیں کھولیں۔ وہی چپراسی اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ نکولس اٹھ کھڑا ہوا لیکن جلد جلد آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور ایک ایک پاؤں ایک ایک من کا ہو رہا تھا۔

''کیوں، کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' چپراسی نے پوچھا۔

نکولس نے کوئی جواب نہ دیا اور چپراسی کے بتائے ہوئے ایک دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔ آگے ایک بہت بڑا کمرہ تھا جہاں بہت سے لوگ اپنی اپنی میزوں پر جھکے ہوئے لکھنے میں مصروف تھے۔ ایک میز سب میزوں سے زیادہ آراستہ نظر آتی تھی اور اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص بھی دوسروں سے زیادہ معزز دکھائی دیتا تھا۔

''کیا آپ ہی اس دفتر کے سیکرٹری ہیں؟'' نکولس نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

''جی ہاں،'' اس نے بڑے وقار سے جواب دیا۔ ''آئیے، تشریف رکھیے۔ آپ مسٹر اسٹیفن کے صاحبزادے ہیں نا؟ آپ سے مل کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔''

نکولس بیٹھ گیا۔

Scanned with CamScanner

سیکرٹری کہنے لگا: ''میرا خیال ہے آپ آج کل اپنے والدین کی نگرانی میں ہیں۔ مسٹر اسٹیفن میرے بڑے گہرے دوست ہیں۔ کیا آپ ان شرائط پر دستخط کر دینے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟ یہ صرف ضابطے کی کارروائی ہے۔''

اس نے مسکراتے ہوئے ایک کاغذ نکولس کے ہاتھ میں دے دیا۔

''تمھیں گاؤں سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔''

''کسی کو پڑھانے کی اجازت نہیں۔''

''ڈراموں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں۔''

اس طرح کی کئی شرطیں لکھی ہوئی تھیں جو سب ''اجازت نہیں'' کے لاحقے پر ختم ہوتی تھیں۔ سیکرٹری نے نکولس کی گھبراہٹ دور کرنے کی نیت سے کہا: ''ہماری زندگی میں اس سے بھی ناگوار باتیں ہوتی رہتی ہیں۔''

اس نے ایک قلم نکولس کی طرف بڑھایا۔

نکولس نے فوراً اپنے دستخط کر دیے۔

سیکرٹری نے جاذب سے سیاہی خشک کرتے ہوئے اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا: ''بس۔''

نکولس کو اپنے پیچھے کچھ سرگوشیاں سنائی دیں۔ پیچھے مڑنے پر اس نے دیکھا کہ کمرے کے تقریباً سبھی آدمی اس کی طرف حیرت اور استعجاب کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

''میرا خیال ہے ہمارے داروغہ صاحب آپ کے منھ بولے باپ ہیں۔ آپ ان سے مل چکے ہیں؟'' سیکرٹری نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''آپ کو داروغہ صاحب سے کہنا چاہیے کہ وہ پولیس کے آدمیوں کو آپ کے مکان پر جانے سے منع کر دیں۔ میرے خیال میں تو اگر آپ ہفتے میں ایک بار یہاں آجایا کریں تو بہتر ہوگا۔ ہم لوگ یہاں بیٹھ کر کچھ گپ شپ کر سکیں گے اور ضابطہ بھی پورا ہو جائے گا۔''

نکولس کو وہاں بیٹھے بیٹھے ایسی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی جیسے اس کا گلا گھٹ گیا ہو۔ اسے وہ

Scanned with CamScanner

گندہ کمرہ بہت برا معلوم ہو رہا تھا اور وہ جلد باہر کی تازہ ہوا میں پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن اسی وقت ایک وردی پوش شخص اس کے پاس آیا اور بولا:

''نائب داروغہ صاحب نے حکم فرمایا ہے کہ آپ جانے سے پہلے ان سے مل لیں۔''

'حکم' کا لفظ سن کر نکولس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' وہ بولا۔

''انھوں نے جو حکم دیا تھا وہ میں نے عرض کر دیا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ علم نہیں۔''

''بھئی جانا ہی پڑے گا آپ کو،'' سیکرٹری نے نکولس کے کان میں کہا۔ ''قانون کا یہی تقاضا ہے۔''

نکولس نے ایک سگریٹ سلگا لیا اور بے دلی سے قدم رکھتا ہوا اس آدمی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ ایک برآمدے میں سے ہو کر نکلے جہاں سے وہی بدبو پھر آنے لگی جو نیچے کے برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی۔

''یہاں چوہے بہت ہو گئے ہیں،'' چپراسی کہنے لگا۔ ''پارسال وہ ایک بہت ضروری مسل کھا گئے۔ کاغذ کچھ کچھ چربی جیسی باس دیتے تھے اس لیے چوہوں نے سوائے اوپر کے صفحے کے کچھ بھی نہ چھوڑا۔''

''تب تو تمھاری مسلیں بڑی لذیذ ہوں گی،'' نکولس نے مزاحاً کہا۔

وہ اب ایک بڑے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ کمرے کے وسط میں ایک لمبی میز پڑی تھی اور اس پر ایک میز پوش بچھا تھا جس پر زری کا کام ہو رہا تھا۔

''اچھا، اب آپ اپنا سگریٹ پھینک دیجیے،'' چپراسی نے کہا۔

''میں ابھی اسے ختم کیے دیتا ہوں۔''

نکولس نے زور سے دم کھینچا اور نتھنوں کے راستے دھواں چھوڑ دیا۔

''نہیں نہیں، یہ بات ٹھیک نہیں،'' چپراسی بگڑ کر بولا اور اپنے رومال سے پھیلے ہوئے دھویں کو منتشر کرنے لگا۔

اسی اثنا میں نکولس نے سگریٹ کا بچا ہوا ٹکڑا فرش پر پھینک دیا۔ چپراسی نے فوراً لپک کر اسے

اٹھالیا۔ لیکن وہ اسے پھینکنے کی کوئی مناسب جگہ نہ پا سکا۔ آخر بجھا کر اپنے کوٹ کی جیب میں ہی ڈال لیا۔

سامنے ایک دروازہ تھا۔ چپراسی آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا اس کے قریب آ گیا اور ڈرتے ڈرتے کواڑ کھول کر کہا:

''حضور! وہ آ گئے ہیں۔''

''اچھا، انھیں اندر آنے کے لیے کہو،'' ایک درشت آواز سنائی دی۔

''جناب!'' نوکر نے نکولس کی طرف مخاطب ہو کر کہا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

نکولس کمرے میں داخل ہوا۔ ایک میز کے سامنے نائب داروغہ بیٹھا تھا اور کچھ گنگناتا ہوا سامنے پڑے کاغذات الٹ رہا تھا۔ اس نے چپ چاپ نکولس کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر اپنے کاغذات دیکھنے لگا۔

آخر وہ گنگناہٹ بند ہوئی۔ نائب داروغہ نے اپنے ہاتھ کی مسلیں ایک طرف رکھ دیں اور مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بولا:

''آپ اسٹیفن صاحب کے صاحبزادے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''آپ کس بیہودہ جھنجھٹ میں پھنس گئے؟'' اس نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

نکولس خاموش بیٹھا رہا۔

''کیوں بھائی، تم لوگ چاہتے کیا ہو؟'' وہ پھر کہنے لگا۔ ''کیا مساوات؟ لیکن میرے نوجوان دوست، مساوات کے خواب دیکھنا بیکار ہے۔ یہی دیکھو، تم کیسے دھان پان سے ہو اور میں کیا لحیم وشحیم ہوں۔ دنیا میں ہر شخص کا مذاق اور طبیعت مختلف ہے۔ کوئی تربوز کو پسند کرتا ہے اور کوئی اس سے نفرت کرتا ہے۔ پھر مساوات کیسے ممکن ہے؟ اور پھر خود فطرت بھی مساوات نہیں چاہتی۔ میں تو یہی کہوں گا کہ تم کو ان لوگوں کی باتوں پر توجہ ہی نہ دینا چاہیے تھی جو مساوات کا سوال اٹھا کر بھولے بھالے نوجوانوں کو بھڑکاتے ہیں۔

''نہیں! نہیں! دنیا میں مساوات کبھی قائم ہوئی ہے اور نہ مستقبل میں اس کا کوئی امکان ہے۔

میں تمھیں یہ تمام باتیں ایک پولیس افسر ہونے کی حیثیت میں نہیں سمجھا رہا، تمھارا ایک خیر اندیش ہوتے ہوئے کہتا ہوں۔ مجھے تمھارے والد سے بہت اُنس ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے کبھی مساوات کے خواب نہ دیکھے ہوں گے؟ نہیں، جوانی کے دنوں میں سب لوگ اس قسم کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ لیکن ایک وقت آتا ہے جب اپنی حماقت کا علم ہوتا ہے۔ خیر، تم مایوس کیوں ہوتے ہو۔ اب بھی بگڑی بات بن سکتی ہے۔''

''معاف فرمایئے۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر نکولس اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا، ہاتھ کانپ رہے تھے اور آنکھیں اداس اور ویران نظر آ رہی تھیں۔

❅

باغیچہ بکائن کے گلابی اور شاداب پھولوں سے پٹا پڑا تھا۔ علی الصباح ہی طائرانِ خوش نوا کے فردوسِ گوش چہچہے شروع ہو جاتے تھے۔ پڑوس کے باغیچے میں بلبل نیبو کے پیڑوں پر دادِ نغمہ سرائی دیا کرتے تھے۔ ہریالی اتنی تھی کہ اس جھونپڑے کی چھت پر بھی سبزہ اگا ہوا تھا۔ اب دن کے وقت گرمی زیادہ ہوتی تھی اس لیے پانی کو دیکھ کر تیرنے اور نہانے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔

نکولس اکثر و بیشتر بندوق لیے ندی کے کنارے ہی گھومتا نظر آتا تھا۔ وہ اسٹیفن کے طعنوں سے زچ ہو گیا تھا۔ بوڑھا دن رات پیسے کی تنگی یا نکولس کی بیکاری اور لاپروائی کے متعلق ہی بڑبڑاتا رہتا تھا۔ اس لیے نکولس اب جان بوجھ کر اپنے والدین سے دور رہنے کی کوشش کرتا۔

ندی کے اس پار مرغزاروں میں گھرا ہوا ایک تالاب تھا۔ طرح طرح کی خودرو بیلیں اس کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے ریشمیں بادل اس کے آئینے میں اپنے جمال کا نظارہ کیا کرتے تھے۔ جب نسیم سحر کے جھونکوں سے اس تالاب کا شفاف پانی ہلکورے لینے لگتا تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے فضائے لاجوردی کا حسن اس آئینے میں اپنی نمائش کرنے کے لیے سمٹ آیا ہو۔

صبح کے پرسکون لمحات میں ایسے حسین و جمیل قطعۂ زمین کی آغوش میں لیٹ کر پھولوں کی لوریاں سننے سے زیادہ کون سی چیز نشاط انگیز ہو سکتی ہے۔

Scanned with CamScanner

نکولس گھنٹوں اس تالاب کے کنارے ہری دُوب پر لیٹا رہا کرتا تھا۔ اس وقت اس کو ایک بے پایاں سرور محسوس ہونے لگتا تھا۔ دل کی ساری آشفتگی دور ہو جاتی اور اس کے دل میں شباب کا جوہر اس طرح چھلکنے لگتا تھا جیسے اس تالاب میں آسمان کا عکس جمیل۔ اس کے تمام اندیشے اور تفکرات کچھ دیر کے لیے غائب ہو جاتے اور دل میں زندگی کی سچی مسرت موجزن ہونے لگتی تھی۔

کبھی کبھی کوئی آبی پرندہ تیرتا ہوا ساحل پر آجاتا اور کنارے پر جھکی ہوئی بیلوں سے الجھتا ہوا اپنے ساتھیوں کو پکارنے لگتا تھا۔ اس وقت نکولس چاہتا تو بڑی آسانی سے اس کا شکار کر سکتا تھا، لیکن وہ ایسے موقعے پر اپنی بندوق کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا۔ وہ کمال یکسوئی سے اس جنتِ نگاہ منظر کے نظارے میں مگن رہتا۔ اس وقت اسے یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ فطرت کے دقیق اسرار تک رسائی پا سکتا ہے۔ اسے نہ اپنے گھر کا خیال رہتا اور نہ لوگوں کی چہ میگوئیوں کا۔ وہ اپنے تصورات کی حسین فضاؤں میں گم رہتا اور عیش دوام کے سنہرے خواب دیکھا کرتا۔

کچھ دن سے نکولس پر انگشت نمائیوں اور خوردہ گیریوں کی یورش زیادہ شدت اختیار کر گئی تھی۔ اس کی ماں تو صرف ایک آہ کھینچ کر ہی رہ جاتی تھی لیکن اسٹیفن جب بھی اسے دیکھتا تھا، جلی کٹی سنائے بغیر نہ چھوڑتا تھا۔ اگر نکولس کبھی باغیچے میں بیٹھ کر کسی کتاب کا مطالعہ کرنے لگتا تو اسٹیفن کہتا:

''واہ! اس سے زیادہ مزے کی زندگی اور کون سی ہو سکتی ہے کہ کھانے پینے کو سب کچھ میسر ہو اور کام کے نام سے ایک تنکا نہ دوہرا کرنا پڑے۔''

اگر نکولس کہیں باہر چلا جاتا تو بوڑھا اس نوجوان کی شومیِ قسمت کی تصویر کھینچنے لگتا۔ لیکن اسٹیفن یہ سب کچھ اپنے بیٹے کو چڑانے یا اس کے دل کو ٹھیس پہچانے کی نیت سے نہ کرتا تھا۔ اس کا مقصد فقط یہ تھا کہ نکولس سیدھے راستے پر آجائے۔

جب سے نائب داروغہ نے بوڑھے سے اس کے بیٹے سے ملاقات کا تذکرہ کیا تھا، اسٹیفن کے دل میں روز بروز یہی آرزو پرورش پانے لگی کہ نکولس کے خیالات میں کچھ اصلاح ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی وہ اپنے لڑکے کو کوسنے دینے لگتا تھا۔

ایک دن اسٹیفن کی سرراہے داروغہ سے ملاقات ہو گئی۔ بوڑھا اسے دیکھ کر بہت گھبرایا۔ وہ

Scanned with CamScanner

اب گاؤں کے کسی شناسا آدمی سے ملتے ہوئے جھجکتا تھا۔ اسے ان لوگوں کو منہ دکھاتے شرم آتی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس سے کوئی ناشائستہ فعل سرزد ہو چکا ہو جو اس ایسے خاندانی اور معزز شخص کے شایانِ شان نہیں۔

''آپ تو کبھی آتے ہی نہیں،'' داروغہ نے پوچھا۔

''ارادہ تو بہت دن سے تھا لیکن موقع ہی نہ مل سکا،'' اسٹیفن نے آنکھیں نیچی کر کے کہا اور میریا کی طبیعت ناساز ہونے کا عذر پیش کر دیا۔

''اور نکولس تو ایک ہی حضرت نکلا، اس نے ابھی تک اپنی شکل ہی نہیں دکھائی،'' داروغہ بولا۔

اسٹیفن کچھ شرمندہ ہو کر دل ہی دل میں بیٹے کو اس کی لاپروائی کے لیے کوسنے لگا۔ پھر ایک لمبی آہ کھینچتے ہوئے بولا:

''وہ آتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ وہ عاقبت نااندیشی میں جو کچھ کر بیٹھا ہے اس کی وجہ سے منہ چھپائے پھرتا ہے۔ اب اسے اپنی شکل لوگوں کو دکھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

''اونھ! اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟ گزشت آنچہ گزشت۔ گئی گزری باتوں کے لیے اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔''

''تاہم وہ جھجکتا ہے،'' اسٹیفن کہنے لگا۔ ''اسے خیال ہے کہ آپ اس سے خفا ہیں، کیونکہ گو آپ اسے اپنا بیٹا سمجھتے ہیں لیکن ہیں تو پولیس کے داروغہ ہی آخر۔''

داروغہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

''اجی نہیں!'' وہ کہنے لگا، ''یوں تو دنیا میں کوئی بھی کوتاہیوں سے بری نہیں۔ اسے آپ ضرور میرے پاس بھیجیں۔ اگر میں اسے کچھ سخت سست کہوں گا بھی تو اس کے بزرگ کی حیثیت سے کہوں گا، داروغہ کی حیثیت سے نہیں۔ خود ہی سوچو، یہ لوگ کتنے غلط اندیش ہیں۔ ابھی ان کی مسیں بھیگنے نہیں پاتیں کہ آزادی کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں۔''

داروغہ پھر ہنس دیا۔ ہنستے وقت اس کا تمام جسم تھل تھل ہلنے لگتا تھا۔ اسٹیفن اس کی رواداری اور کرم گستری کی وجہ سے دبا جا رہا تھا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں خوشی جھلکنے لگی اور اس کا ہاتھ فرطِ مسرت سے تھرتھرانے لگا۔

Scanned with CamScanner

''ہم دقیانوسی بوڑھے بھی تو ایک دن انھی کی طرح جوان تھے،'' اسٹیفن بولا۔ ''سچ پوچھیے تو نکولس بہت سعادت منداور بھلالڑکا ہے۔ لیکن اس کی عقل نہ جانے یکا یک کیسے غائب ہوگئی ہے۔''

داروغہ کو اخلاقاً سر ہلاتے دیکھ کر اسٹیفن کا حوصلہ اور بڑھ گیا اور اس نے پوچھا:

''لیکن کیا اب غلطی کی تلافی کا کوئی امکان نہیں ہے؟ کاش وہ اپنے اسکول میں واپس جاسکتا اور——''

''کچھ دن ٹھہریے، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا،'' داروغہ نے یقین دلایا اور بوڑھے سے مصافحہ کر کے اپنے رستے پر ہولیا۔ اسٹیفن نے جاتے ہوے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا:

''غضب کا آدمی ہے یہ بھی۔''

اس دن اسٹیفن گھر لوٹا تو اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ راستے میں بھی وہ چھاتا گھماتا ہوا کسی پرانے گیت کے بند گنگناتا رہا۔

کھانے کے وقت اسٹیفن بہت خوش تھا۔ نکولس کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولا:

''آیئے انقلابی جی!''

میریا سے بھی اس نے کچھ مذاق کیا۔ کھانے کے بعد وہ کمرے میں ٹہلنے اور پھر کوئی گیت گنگنانے لگا۔

''آج ایسی کیا خوشی کی بات ہوئی ہے کہ ایک دم گانا بھی شروع کر دیا؟'' میریا نے قدرے متعجب ہو کر کہا۔

لیکن اسٹیفن نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ ایک عجیب انداز سے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ گھما گھما کر اور بھی مست ہو کر گانے لگا۔

میریا بھی اپنے شوہر کو خوش دیکھ کر چہک اٹھی۔ اس نے چائے کی میز کے لیے ایک نیا میز پوش نکالا اور ناشتہ تیار کرنے میں بھی بڑی مستعدی دکھائی۔

چائے پیتے وقت اسٹیفن نے اپنے بیٹے کو مذاق کے لہجے میں خطاب کرتے ہوے کہا، ''آیئے حضرت انقلابی صاحب، آپ کو ایک خوشخبری سنانا ہے۔ آیئے، تشریف رکھیے۔''

Scanned with CamScanner

نکولس اس آواز کو سن کر کانپ اٹھا اور اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ آج اپنے باپ کو اچانک مسرور دیکھ کر وہ سراسیمہ سا ہو گیا۔ جب وہ اسٹیفن کے قریب آ کر کرسی پر بیٹھا تو اس کا دل کسی نادیدہ مصیبت کے تصور سے ڈوبا جا رہا تھا۔

''میں نے تمھیں ہزار مرتبہ اپنے منھ بولے باپ کے پاس جانے کو کہا لیکن تم تو کان ہی نہیں دھرتے۔''

''یا اللہ، پھر وہی ذکر!'' نکولس دل ہی دل میں کسمسایا۔

تب اسٹیفن نے داروغہ سے اپنی ملاقات اور گفتگو کا حال مزے لے لے کر بیان کرنا شروع کیا۔ کہیں کہیں اپنی طرف سے بھی کچھ بڑھا گھٹا دیا تا کہ نکولس کو مصمم یقین ہو جائے کہ داروغہ نے واضح الفاظ میں نکولس کو دوبارہ کالج میں داخل کرا دینے کا وعدہ کر لیا ہے؛ شرط صرف یہ ہے کہ نکولس اپنے دماغ سے اشتراکی خیالات کی غلاظت نکال پھینکے اور پھر اپنی راہ پر آ جائے۔

''بھئی، داروغہ غضب کا آدمی ہے!'' اسٹیفن نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنے بیٹے کو ہدایت کرنے لگا:

''میں کہتا ہوں تم اگلے اتوار کو گرجا سے سیدھے داروغہ کے ہاں جاؤ۔ ہم لوگوں کی بات مانو اور ذرا عقل سے کام لو۔ اس وقت جو فعل مناسب اور سودمند نظر آئے وہی کرو۔ اور بس، پھر سب معاملہ سلجھ جائے گا۔''

نکولس چپ چاپ میز پوش کے پھولوں پر نظر جمائے بیٹھا رہا۔ ادھر اسٹیفن کہہ رہا تھا، ''اب ان احمقوں کو چھوڑو۔ فطرت خود تمھارے خیالات کی تائید نہیں کرتی۔ وہ مساوات کے خبط کو بارور نہ ہونے دے گی۔ میرا خیال ہے تم اس موقعے پر اپنا سر ذرا جھکا لو گے تو وہ ٹوٹ نہ پڑے گا،'' بوڑھے نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن وہ کبھی کبھی ٹوٹ کر گر بھی پڑتا ہے،'' نکولس دبی آواز سے بولا۔

اسٹیفن کا چہرہ غصے کے مارے تمتما اٹھا۔ اس نے ایک چمچہ زور سے میز پر پٹختے ہوئے چلا کر کہا:

''تب تم سے بڑھ کر بے وقوف دنیا بھر میں کوئی نہیں۔ سمجھے؟''

Scanned with CamScanner

''جی ہاں... سمجھ گیا۔''

''میں کہتا ہوں کہ تمھیں جانا ہوگا۔ میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں۔''

''نہیں، میں ہرگز نہیں جاؤں گا،'' نکولس دھیمی آواز میں بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا؟'' اسٹیفن آگ بھبوکا ہو کر چلا اٹھا۔

بیچاری میریا کو کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا کہ اس بھیانک تماشے کو روکنے کے لیے کیا کرے۔ وہ اسٹیفن کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اس کا بازو پکڑ کر کہہ رہی تھی ''خدا کے لیے ایسا نہ کرو۔''

نکولس نے ٹوپی سر پر رکھ لی اور پھاٹک کی طرف بڑھا۔ بوڑھے والدین دیکھتے ہی رہ گئے اور وہ باغیچے سے باہر نکل بھی گیا۔ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا وہ ندی کے قریب جا پہنچا۔ اس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے اور وہ آبدیدہ ہو رہا تھا۔

وہ ندی کے کنارے پر ایک اونچی سی جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا اور متجسس نگاہوں سے سامنے پھیلے ہوئے مرغزار کی طرف دیکھنے لگا۔

سورج آہستہ آہستہ دھندلکوں میں روپوش ہو رہا تھا اور غروب ہوتے ہوئے فطرت کی حسین بہاروں کو اداس اداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ افق پر سیاہی بتدریج گہری ہوتی جا رہی تھی، جیسے کوئی محبوبہ بصد ناز اپنا سیاہ آنچل پھیلا رہی ہو۔ دیکھتے دیکھتے اس تابستانی شام کے منظر کا خاتمہ ہو گیا۔ ندی کے نیلے اور گہرے پانی میں درختوں کے سائے لحظہ بہ لحظہ تاریک تر نظر آنے لگے۔ آسمان گھنی سیاہیوں کے دامن میں چھپ گیا اور بادل مہیب دیووں کی طرح نظر آنے لگے۔

نکولس ندی کے کنارے درختوں کے نیچے بیٹھا تھا۔ فضا میں بوسیدہ گھاس اور گیلی مٹی کی بدبو بسی ہوئی تھی۔ درختوں کے پتے ہوا کے جھونکوں سے کھڑکھڑا رہے تھے اور پانی کے بہاؤ کی سریلی ترل رل کے ساتھ سر ملا کر گانے، یا رونے، کی کوشش کر رہے تھے۔ فطرت اپنے ہی خیالات میں محو معلوم ہوتی تھی۔ صرف کسی مرغابی کی چیخ یا کسی چونکی ہوئی بطخ کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ماحول کے بے پایاں سکون میں کبھی کبھی مخل ہو جاتی تھی۔

نکولس بہت دیر تک اس منظر کو دیکھتا رہا۔ جب تاریکی اچھی طرح پھیل گئی، اس کے خیالات

Scanned with CamScanner

لبِ جو کے نظاروں کی وسعتوں سے پرے پرواز کرنے لگے۔ اس نے دیکھا جیسے ان چراگاہوں سے دور، بہت دور، ندی کے کنارے ایک پرسکون جھونپڑا ہے جو ہر طرف سے چمن اور خودرو پودوں کی باڑوں سے گھرا ہوا ہے، اور اس حسین محل سے ایک دوشیزہ کی شیریں آواز آرہی ہے۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ تاریک اور پرسکون کنج کسی کے جمال کی ایک جھلک سے منور ہو گیا ہے۔

نکولس گھنٹوں گولیا کے تصورات میں محو ہیں بیٹھا رہا۔ وہاں اس کے خیالات کو برہم کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ہر طرف سکون اور خاموشیوں کا تسلط تھا۔ صرف خواب آلودہ لہروں کی سریلی ترل رل کی آواز کان میں آرہی تھی لیکن وہ بھی گویا اپنی الفاظ سے مستغنی آواز میں افق کے دھندلے پردوں میں چھپی ہوئی اس پرسکون دنیا کی دلفریب کہانی کہہ رہی تھی جس میں گولیا رہتی تھی۔

نکولس اس خیالی دنیا کے تصور میں محو ایک پرانا گیت گانے لگا:

اِت اُت بھٹکت دن بیتت ہے

تارے گن گن رات...

اس کی لے کتنی سوزناک تھی۔ رات کی ان خاموش گھڑیوں میں اس کا گانا ندی کے نواح میں گونجتا ہوا کسی ان جانی، ان بوجھی دنیا کی طرف رواں تھا۔ شاید گولیا بھی اسی طرح اپنے محبوب کا تصور کیے دریائے نیپر کے کنارے کہیں بیٹھی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہوا اس کا پیامِ محبت پہنچانے کے لیے سن سن کرتی ہوئی اسی دنیا کی طرف بڑھ رہی ہو جہاں حسین گولیا بیٹھی تھی۔

اس اثنا میں چاند خاصا اونچا جا پہنچا تھا۔ چاندنی میں ندی کی دھیمی لہریں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ کھیتوں میں کہیں کسی کسان کا روشن کیا ہوا الاؤ نظر آجاتا تھا۔ یکا یک نکولس کو کسی کی آواز سنائی دی:

''اخاہ! ان تنہائیوں میں آپ ہی گا رہے تھے؟''

نکولس چونک پڑا اور مڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ اس طرح گھبرا گیا جیسے کسی نے اسے کسی ناشائستہ فعل کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔

کچھ لمحوں کے بعد درختوں کی اوٹ سے ایک شخص نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا:

''کیا آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں آپ کے والد کا دوست محرر ہوں۔''

''اچھا، آپ ہیں؟''

''واقعی آج کی رات بڑی دلکش ہے،'' محرر کہنے لگا۔ ''ہاں ہاں، گایئے۔ میں بھی گانے کا بڑا شوقین ہوں۔ پہلے میں ہی گرجا کی حمد گانے والی پارٹی کا سردار تھا۔''

محرر کھانستا ہوا نکولس کے پاس بیٹھ گیا۔

''کہیے، داروغہ صاحب سے تو آپ مل آئے آنا؟''

نکولس نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ اچھل کھڑا ہوا اور بغیر کچھ کہے سنے ایک طرف کو چل دیا۔

''شیطان یہاں بھی دامنگیر رہا!'' اس نے دل ہی دل میں کہا اور بہت جلد جھاڑیوں میں اوجھل ہو گیا۔

محرر بھونچکا سا رہ گیا۔ وہ بہت دیر تک ان جھاڑیوں کی طرف کھڑا دیکھتا رہا جن کی اوٹ میں نکولس غائب ہو گیا تھا۔

❋

نکولس بڑی دیر تک ندی کے کنارے گھومتا رہا اور جب اندھیرا گہرا ہو گیا، وہ گاؤں کے نواحی میدان میں آ کر ٹہلنے لگا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ چاروں طرف خاموشی اور سکون کا راج تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے چاند بھی اس آفاقی سکون کو دیکھ کر متحیر رہ گیا ہو۔ صرف سڑک کے قریب ایک دلدل میں مینڈک ٹرّا رہے تھے اور پاس ہی کوئی آدمی دردناک آواز میں ایک اداس گیت گا رہا تھا، لیکن وہ ماحول کے سکون میں خلل کا موجب نہ ہو رہا تھا۔

رات بہت ہو چکی تھی۔ نکولس وہیں ٹہلتا رہا۔ بستی میں کہیں کہیں کوئی چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی دور کے محلے سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی، یا گھنٹہ گھر کی گھڑی ٹن ٹن کی سریلی آواز سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھی اور یوں معلوم ہونے لگتا تھا جیسے آسمان میں منتشر سیمیں کرنوں کے تار ایک ساتھ جھنجھنا اٹھے ہوں۔

چاندنی لحظہ بہ لحظہ زیادہ اجلی ہوتی جا رہی تھی۔ چاند بہت اونچا پہنچ گیا تھا۔ نکولس اب بھی وہاں سے نہ ہٹا۔ وہ کھیتوں اور جھاڑیوں کے آس پاس گھومتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے سڑک پر جھکی ہوئی درختوں کی ڈالیاں بھی بہ ہزار کاہش یہ جاننے کے لیے مضطرب ہوں کہ نیم شب کی اس سنسان

Scanned with CamScanner

ساعت میں وہ شخص اکیلا کیوں بھٹک رہا ہے۔

یکا یک اس نے سیٹی کی تیز آواز سنی اور کسی نے کرخت آواز میں پوچھا، ''کون؟''

نکولس پہچان گیا کہ گاؤں کا چوکیدار ہے۔ قریب آنے پر بوڑھا چوکیدار بھی نکولس کو پہچان گیا اور مسکراتا ہوا بولا:

''اوہ، آپ ہیں؟ لیکن اس وقت آپ یہاں کہاں؟ کیا نیند نہیں آتی؟''

''نہیں آتی،'' نکولس نے جواب دیا۔

''واقعی آج کی رات متوالی ہے، اور آپ ایسے نوجوانوں کو ایسی حسین رات میں نیند نہ آئے تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔''

بوڑھا چوکیدار کھلکھلا کر ہنس پڑا اور لنگڑاتا ہوا چل دیا۔

میدان چاندنی کی کرنوں سے اسی طرح روشن تھا۔ اسی طرح مینڈکوں کی ٹرٹر اور اس البیلے جوان کا گیت سنائی دے رہا تھا۔ اتنے میں گھنٹہ گھر کی ٹن ٹن کی آواز گونج اٹھی۔ نکولس اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کی جانب چل دیا۔

راستے میں وہ یکا یک ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ مکان کے ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ ایک شخص میز کے سامنے بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور سامنے ایک نوجوان عورت کھڑی تھی۔ وہ شاید اس شخص کی بیوی ہوگی۔ اس کا خاوند بڑے مزے سے کھانا کھاتا جاتا تھا اور اس سے ٹھٹھول بھی کرتا جاتا تھا۔

نکولس اس منظر کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیا۔

''یہ جوڑا کتنا مطمئن معلوم ہوتا ہے!'' وہ چلتے چلتے سوچنے لگا۔ ''معلوم ہوتا ہے ان لوگوں کو کسی امر کی فکر ہے نہ کسی قسم کی بیکلی۔''

گھر قریب آ گیا تھا۔ نکولس جوں جوں اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا، اس کے پاؤں نہ جانے کیوں رکنے لگے۔ آج ہری ہری بیلوں سے آراستہ مکان اسے سنسان اور وحشتناک نظر آ رہا تھا۔ اس کا دل آگے بڑھنے سے ہچکچا رہا تھا۔ وہ گھر جہاں نکولس نے بڑے چاؤ چونچلوں میں اپنا بچپن گزارا

Scanned with CamScanner

تھا، آج اسے اتنا خوفناک معلوم ہوا جیسے کوئی راکشس منہ کھولے کھڑا ہوا۔

ڈرتے ڈرتے نکولس نے پھاٹک کی چٹخنی پر ہاتھ رکھا۔ لیکن جونہی اس نے دروازہ کھولا، اسے قریب ہی سے اپنے والد کے کھانسنے کی آواز آئی۔ واقعے میں اسٹیفن پھاٹک کے قریب بچھی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھا تھا، لیکن نکولس اسے دیکھ نہ پایا تھا کیونکہ بنچ پر کسی جھاڑی کا سایہ پڑ رہا تھا۔

''کون؟ نکولس؟'' بوڑھے نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

نکولس ہکا بکا سا رہ گیا۔ اسے اپنے والد کی موجودگی کا گمان تک نہ تھا۔ گھبرا کر بول اٹھا:

''اچھا، آپ ابھی باہر ہی بیٹھے ہیں؟ فرمایئے!''

''صرف فرمایئے کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا،'' بوڑھا بولا۔ ''سنو! آج میں داروغہ کے ہاں گیا تھا۔ واقعی وہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ گو تم اس کی طرف سے لاپروائی برتتے ہو، تاہم وہ تمھیں اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتا ہے۔ آج اس نے کہا ہے کہ اگر تم ایک درخواست لکھ کر التجا کرو کہ جو کچھ تم سے سرزد ہوا ہے وہ دوسروں کے بہکانے سے ہوا ہے اور آئندہ ایسی تحریکوں سے محترز رہنے کا وعدہ کرو تو سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

نکولس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

''اور میں بھی اپنی طرف سے ایک درخواست لکھوں گا،'' بوڑھے نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ ''میں عرض کروں گا کہ مجھے وفاداری سے سرکارِ عالیہ کی ملازمت کرتے ہوئے آج پینتیس سال ہو گئے ہیں۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، میرے ہاتھ تھرتھراتے ہیں، اب مجھے سبکدوش کر دیا جائے۔''

نکولس کا گلا گھٹ رہا تھا۔ اپنے والد کی باتیں سن کر اس کا دل رقت سے بھر آیا۔ لیکن اسٹیفن نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا۔

''اور تب داروغہ بھی اپنی طرف سے سفارش کر دے گا۔ سب باتیں ٹھیک ہو جائیں گی اور تم پھر اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کر سکو گے۔''

نکولس پھاٹک کے قریب اس طرح کھڑا تھا جیسے کسی سنگین سزا کا حکم سن رہا ہو۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، ہاتھ لٹک رہے تھے اور زبان سے کوئی لفظ نہ نکل رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا

چھارہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رات سانس روک کر نکولس کے دل کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ کر رہی ہو۔ آسمان پر ان گنت تارے ٹمٹمار ہے تھے۔

اسی وقت ایک مچھر اس کے کان کے قریب آ کر بھنبھنانے لگا۔ اس کی بھن بھن نکولس کے دماغ میں گونج اٹھی۔ پاس ہی ایک کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ نکولس کے دل میں ایک خوفناک طوفان بپا تھا۔ اسے مچھر کی وہ بھنبھناہٹ کسی کا درد بھرا نالہ بن کر سنائی دے رہی تھی۔

''اس لیے کل تمھیں داروغہ صاحب کے پاس جا کر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے،'' بوڑھا پھر کہنے لگا۔

''نہیں۔ میں نہ کہیں جانے کو تیار ہوں اور نہ کوئی تحریر لکھ کر دینے کو،'' نکولس نے دھیمی آواز میں جواب دیا اور اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھایا۔

''کیوں؟'' اسٹیفن نے چلّا کر پوچھا۔

''نہیں، مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔''

''لیکن پیٹ میں کھانا تو بڑی آسانی سے ٹھونسا جا سکتا ہے نا؟ اس میں تو تمھیں کوئی مشکل پیش نہیں آتی ہو گی!'' بوڑھے نے تلخ ہو کر کہا۔

''میں کہتا ہوں، خدا کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو، مجھے مت ستاؤ۔''

نکولس پاگلوں کی طرح چلّا اٹھا اور دوڑ کر اس کوٹھڑی میں گھس گیا جو باغیچے کے عقبی حصے میں بنی ہوئی تھی اور جسے وہ لوگ کبھی غسلخانے کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ کچھ دن سے نکولس نے اسی کوٹھڑی میں ڈیرہ جما رکھا تھا۔

اسٹیفن آگ بگولا ہو کر چلّا اٹھا:

''بدمعاش!''

سارا ماحول گونج اٹھا اور چاروں طرف سے اس کی بازگشت کی آواز سنائی دی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ سنسان اور پُرسکون رات ہی اپنی پوری قوت سے چلّا اٹھی ہو۔

''بدمعاش!''

Scanned with CamScanner

کوٹھڑی میں گھس کر نکولس نے ایک موم بتی جلائی۔ کمرے کا فرش مرطوب تھا اور چھت سیاہ۔ ایک کونے میں نہانے کا ٹب الٹا پڑا تھا۔ اس پر کچھ کتابیں پڑی تھیں۔ دوسری طرف ایک چوڑی بنچ بچھی تھی جس کے قریب ایک کرسی تھی۔ دیوار پر بے شمار سائے ناچ رہے تھے۔ بتی کی لو ہوا کے جھونکوں سے کانپ رہی تھی۔ نکولس نے چھوٹی سی کھڑکی کھول دی اور کمرے میں اس طرح ٹہلنے لگا جیسے پنجرے میں بند جانور ٹہلا کرتے ہیں، لیکن اسے چین نہ آیا۔ اچانک اسے اپنے اعضا میں ایک خوفناک خستگی اور تھکن سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ بتی بجھا کر بنچ پر دراز ہو گیا۔

کھڑکی میں سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ دیوار کے پاس کی جھاڑی کے پتے کبھی کھڑکھڑا اٹھتے تھے۔ قریب ہی ایک جھینگر بنکار رہا تھا۔ نکولس بہت دیر تک پیشانی پر ہاتھ رکھے لیٹا رہا۔ اس کے دماغ میں بے شمار بے ربط باغیانہ خیالات امڈ آئے تھے۔ اچانک اسے سڑک پر جاتی ہوئی کسی گاڑی کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ آہستہ آہستہ وہ آواز دھیمی پڑتی گئی اور دور جا کر رات کی بے پناہ خاموشیوں میں تحلیل ہو گئی۔ کوئی قسمت کا مارا کہیں چلا جا رہا تھا۔ نکولس اس کی آواز سن کر سوچنے لگا:

''اب میں بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے بھی کوچ کر دینا چاہیے... جلد بہت جلد۔ ہائے، یہ درد ناقابلِ برداشت ہے! ہائے، یہ تھکن کتنی بھیانک ہے! کتنی بوجھل ہے...''

یکا یک باغیچے میں ایک مرغی چلا اٹھی اور زور سے پر پھڑپھڑانے لگی۔ قریب ہی کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کھڑکی کے پاس کوئی دبے پاؤں چل رہا ہو۔ نکولس چونک پڑا اور اچک کر اپنی بندوق سنبھال لی۔

''کون ہے؟'' اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

''میں ہوں بیٹا۔''

کسی عورت کی رندھی ہوئی آواز سنائی دی اور چاندنی کی دھندلی روشنی میں نکولس کو کھڑکی کے باہر اپنی ماں کا چہرہ دکھائی دیا۔

''ارے، تم کہاں امی؟'' لڑکے نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''بیٹا، آج تم سوئے کیوں نہیں؟'' بڑھیا گلوگیر آواز میں بولی۔ ''تم اداس کیوں ہو؟''

Scanned with CamScanner

وہ آگے نہ بول سکی اور کھڑکی سے ٹیک لگا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ نکولس اس کے قریب گیا اور کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن اچانک اس کا گلا بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور وہ بڑی مشکل سے صرف اتنا کہہ سکا:

''امی، خدا کے لیے اپنی جان کو دکھ نہ دو۔''

''کولیا! میرا دل تمھیں دیکھ کر ایسا بھر آیا ہے کہ میں کسی طرح اپنے آنسو نہیں روک سکتی۔''

نکولس وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ لپک کر کوٹھڑی کے ایک تاریک کونے میں جا چھپا اور ہاتھوں میں منھ چھپا کر سسک سسک کر رونے لگا۔ اس کے گالوں پر گرم گرم آنسوؤں کی ندی بہہ رہی تھی اور دل اندر ہی اندر کسی ناقابلِ برداشت درد سے کٹا جا رہا تھا۔

میریا اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی ہوئی آئی۔ اس نے اپنے بیٹے کے کندھے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ گھنٹوں دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے اس اندھیرے کونے میں چپ چاپ آنسو بہاتے رہے۔ تب وہاں سے اٹھے اور بنچ پر بیٹھ گئے۔ ماں نے اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی سوکھی انگلیاں اپنی پوری قوت سے نکولس کا ہاتھ دبانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''نہیں! نہیں! میں اب یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے اب کہیں چلے ہی جانا چاہیے،'' نکولس سسکیاں بھرتا ہوا بولا۔

''کیوں؟ کیوں؟ کہیں تمھارے بابا نے برا بھلا کہہ کر تمھارا دل تو نہیں دُکھایا؟''

بڑھیا اپنے بیٹے پر جھک کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ نکولس اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پھر ایک ننھا بچہ بن گیا ہو۔ اس کے دل میں اپنی ماں کے لیے ویسی ہی محبت امڈ آئی جیسی کبھی بچپن میں رہی ہوگی۔ نکولس کو اس وقت اپنی امی اتنی عزیز معلوم ہوئی کہ وہ اس کے لیے اپنی زندگی نثار کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے سوکھے ہونٹ اٹھا کر بڑھیا کے استخوانی ہاتھ پر رکھ دیے۔ میریا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی۔

''میں کیا کروں؟'' وہ دھیمے لہجے میں بڑبڑا رہا تھا۔ ''مجھے کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔ یہ زندگی اب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھے بہت جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہیے... کہیں دور بھاگ

Scanned with CamScanner

جانا چاہیے۔''

''ایسی رنج دہ باتیں کیوں کر رہے ہو بیٹا؟ ذرا اپنے بوڑھے باپ کا بھی خیال کرو۔ کیا تمھیں ان پر کچھ ترس نہیں آتا؟ دیکھو وہ ابھی تک رو رہے ہیں۔ نکولس! کم از کم ان کی ضعیفی کے خیال ہی سے ان کی بات مان لو۔ چھوڑو ضد کو — آہ — تم...''

تب بڑھیا نہایت دردناک لہجے میں موت اور زیست کے معنی سمجھانے لگی۔ اس نے اسے بتایا، ماں باپ کا دل کیا چیز ہوتا ہے، بڑھاپا کس خوفناک شکل میں نمودار ہوتا ہے، زندگی کی بھول بھلیاں کتنی پر پیچ ہوتی ہیں۔

نکولس چپ چاپ اس کی عجیب و غریب باتیں سنتا رہا۔ وہ بڑھیا کے الفاظ کا اصل مطلب تو نہ سمجھ سکا، ہاں وہ محبت بھرے الفاظ اس کے دل کو ایک تسکین ضرور بخش رہے تھے:

''...اس لیے میری التجا مان کر جو کچھ وہ کہیں، تم لکھ دو۔'' بڑھیا نے کہا۔

نکولس کو رات کی بات یاد آ گئی۔ اس نے سر ہلا کر کہا، ''نہیں، میں ہرگز نہیں لکھوں گا۔ اگر تمھیں مجھ سے محبت ہے تو مجھ سے اس بات کا مطالبہ نہ کرو۔''

پھر ایک سرد آہ بھر کر وہ بڑبڑایا:

''مجھے اب ضرور رخصت ہو جانا چاہیے۔''

''کیوں بار بار چلے جانے کا ذکر کر رہے ہو بیٹا؟ تم کہاں جا سکتے ہو؟ تم کہیں نہیں جا سکتے! تم جانتے نہیں، تمھارے باپ پر کتنی بڑی ذمے داری عائد ہے؟''

نکولس کچھ نہ بولا۔ دونوں بڑی دیر تک چپ سادھے بیٹھے رہے۔ دونوں کے دلوں میں طرح طرح کے خیالات سر ابھار رہے تھے۔ کائنات خاموش تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تاریکی میں بیٹھے ہوے ان لوگوں کے دل کا حال جاننے کے لیے رات بھی چپکے چپکے کھڑکی میں سے جھانک رہی ہو۔

قریب ہی مکان کے ایک چھوٹے سے کمرے میں دیا جل رہا تھا۔ کمرے کی دیوار پر خدا کے برگزیدہ بیٹے مسیح مصلوب کی مقدس تصویر آویزاں تھی، جس کے سامنے اسٹیفن گھٹنوں کے بل جھکا ہوا نہایت درد بھرے لہجے میں دعا کر رہا تھا:

''مقدس باپ! خداوند! اس گمراہ بچے کو راہ دکھا۔ اس کی رہنمائی کر۔''

Scanned with CamScanner

٭

گرمی کے دن تھے اور دو پہر کا وقت۔ آسمان پر ابر کا نشان تک نہ تھا۔ سورج کی تپش اور تمازت آنکھیں اوپر اٹھانے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ابابیلیں سڑک کی دھول میں نہا رہی تھیں اور کوے پنکھ پھیلائے آرام کر رہے تھے۔ گاؤں بھر گرمی کی وجہ سے پریشان تھا۔ سب لوگ اپنے گھروں میں گھسے اونگھ رہے تھے۔ اس وقت کسی کے دل میں یہ خواہش ہی نہ پیدا ہوتی تھی کہ ہمسائے کی خبر لے۔ اس لیے پڑوس میں اس باغیچے والے مکان میں کیا گزر رہی ہے یہ جاننے کی کسی کو تشویش تھی اور نہ مہلت۔

اس مکان کے سامنے اس وقت ایک چھوٹی سی گاڑی کھڑی تھی۔ گھوڑا دم سے مکھیاں اڑاتا ہوا اونگھ رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا، صرف مکان کی کھلی کھڑکی سے نہ جانے کس کی درد بھری چیخیں بار بار سنائی دے جاتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی شخص زبردست درد میں مبتلا ہو جس کی ناقابل برداشت تکلیف سے بے چین ہو کر رہ رہ کر کراہ رہا ہو۔ لیکن ایسا نظر آتا تھا کہ وہ شخص اکیلا نہیں ہے. کیونکہ جونہی اس کی آواز آتی، برآمدے میں سے کاناپھوسی کی آواز بھی سنائی دیتی اور ساتھ ہی کسی کے قدموں کی چاپ بھی۔ لمحے بھر بعد سب لوگ چپ ہو جاتے اور سناٹا چھا جاتا۔ لیکن پھر وہی چیخیں سنائی دیتیں اور پھر وہی کاناپھوسی، اس کے ساتھ ہی کمروں میں پھر وہی بھاگ دوڑ کی آوازیں۔

''کون آیا ہے؟'' ایک شخص نے کوچوان کے پاس آکر دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''ڈاکٹر۔''

اس شخص نے سانس اس طرح چھوڑی جیسے بہت دیر سے روکے ہوئے ہو۔ اس نے اپنی چھتری تہہ کر لی اور گھبرائی ہوئی نظروں سے مکان کی طرف دیکھا۔ یہ صاحب اسٹیفن کے وہی قدیمی دوست اور ہم جلیس محرر صاحب تھے۔

محرر سڑک پر کھڑے کھڑے چاردیواری پر سے احاطے میں جھانکنے لگا۔ تب یکایک اس نے کسی شخص کو اشارے سے باہر بلایا اور خود کھسک کر ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے پسینہ پھوٹ رہا تھا جسے وہ بار بار رومال سے پونچھتا جاتا تھا۔

Scanned with CamScanner

احاطے کا پھاٹک کھلا اور ایک دیہاتی عورت نے پھاٹک سے باہر جھانک کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے بے حد گھبرائی ہوئی ہو۔ محرر کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں بھاری سی ہوگئیں اور ان سے آنسوؤں کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔

''کیوں؟ کیا معاملہ ہے؟'' محرر نے گھبرا کر پوچھا۔

عورت سسکیاں لینے لگی اور دامن میں منھ چھپا کر روتے روتے بولی:

''بچارے بوڑھے پر صدمے سے آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ اس کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان سب سن ہو گئے ہیں۔ بس ہٹر ہٹر چاروں طرف تاک رہا ہے، جیسے رحم کی بھیک مانگ رہا ہو۔''

بات ختم ہونے سے قبل ہی وہ اور بھی زوروں سے سسکیاں لے کر رونے لگی۔ پھر آنسو پونچھ کر بولی:

''آپ اندر کیوں نہیں آجاتے؟''

''آنے سے فائدہ ہی کیا ہے!'' محرر نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اب کیا ہوسکتا ہے؟''

وہ ایک سرد آہ بھر کر پاس بچھی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا۔ کوچوان نے اس معزز آدمی کے پاس بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''اور اسے تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں نا؟'' عورت نے پوچھا۔

''کس کو؟''

''نکولس کو۔''

''نہیں!'' محرر نے سراسیمہ ہو کر پوچھا۔ ''کیوں؟ کہاں ہے وہ؟''

''آہ! وہ تو اس کوٹھری میں ایسا بے فکر ہو کر سو رہا ہے کہ...''

بچاری عورت اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا گلا بھر آیا اور وہ چادر میں منھ چھپا کر پھاٹک کے پیچھے چلی گئی۔

Scanned with CamScanner

اسی وقت سامنے کے میدان کی طرف سے ایک بوڑھا محرر کے قریب آ کر سرگوشیاں کرنے لگا۔اس کی آنکھوں پر نیلے رنگ کا چشمہ تھا اور سر پر اونچی وضع کی ٹوپی۔ کچھ دیر تک احاطے کی طرف جھانکتے رہنے کے بعد وہ بولا:

''میرے خیال میں اندر چلے چلنا چاہیے۔باہر ٹھہرنا مناسب نظر نہیں آتا۔''

محرر نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا اور دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں کے چہروں سے فکرمندانہ سنجیدگی مترشح تھی۔انھوں نے اپنے چھاتے کھول لیے اور اس کوٹھڑی کی طرف جو اسٹیفن کا غسلخانہ تھا،قدم بڑھایا۔

اس پرانی کوٹھڑی کے نزدیک گاؤں کے بچوں اور عورتوں کی بھیڑ لگ رہی تھی۔ وہ لوگ بار بار اس کوٹھڑی کی کھڑکی میں سے جھانک رہے تھے۔کوٹھڑی کے دروازے پر تالا پڑا تھا، اور ایک مسلح سنتری اس کے سامنے ٹہلتا ہوا پہرہ دے رہا تھا۔

عورتیں اس کوٹھڑی میں سے جھانکنے کے لیے ایک دوسری پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ دور سے دیکھنے پر کوٹھڑی میں پڑے ہوئے کسی آدمی کے پاؤں نظر آ رہے تھے۔ وہ نئے موزوں میں ڈھکے ہوئے تھے۔عورتیں خائف ہوکر ان کی طرف دیکھ رہی تھی اور سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

''یہ اسی کے پاؤں ہیں؟''

''ہاں ہاں، اسی کے۔''

''ذرا مجھے بھی دیکھنے دو۔تم تو خوب دیکھ چکیں۔لیکن کیا اب سرکاری معائنہ بھی ہوگا؟''

''بیشک!''

''خداوندا—''

لوگ آتے تھے اور نمناک آنکھوں سے بار بار اس کھڑکی سے اندر جھانکتے تھے لیکن جسے وہ اتنے اضطراب سے دیکھ رہے تھے وہ تو اتنی گہری نیند سویا تھا کہ لوگوں کی رائے زنی کا اسے علم ہی نہ ہو سکتا تھا۔

کسی تھکے ہوئے آدمی کی طرح نکولس کوٹھڑی میں پڑی ہوئی بنچ پر دائمی نیند میں بیہوش بے سدھ پڑا تھا۔قریب ہی اس کی ڈائری دھری تھی، جس کے کھلے ہوئے صفحے پر ایک مرجھایا ہوا

Scanned with CamScanner

پھول پڑا نظر آ رہا تھا۔

❁

دوسرے دن نکولس کو دفنا دیا گیا۔

صبح کا وقت تھا۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف گرجا کی گھنٹیاں، اپنے سنجیدہ لہجے میں فضا کو ارتعاش آشنا کرتی ہوئی، سننے والوں کے دلوں میں ایک طرح کا درد جگا رہی تھیں۔

جنازہ قبرستان کی طرف بڑھنے لگا۔ گاؤں کے سبھی لوگ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ آگے آگے مقامی گرجا کی حمد پارٹی تھی جو دردناک لہجے میں مذہبی گیت گاتے جا رہے تھے۔ جب گیت گانے والے چپ ہو جاتے تو جھاڑیوں کی اوٹ سے یکا یک پرندوں کی میٹھی راگنیوں کی ایک دھارا پھوٹ نکلتی تھی۔

جنازے کے پیچھے ایک بڑھیا لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔ پولیس کا داروغہ اسے اپنے کندھے کا سہارا دیے تھامے ہوئے تھا۔ بڑھیا کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ختم ہو گئے تھے۔ وہ کچھ بول سکتی تھی اور نہ رو سکتی تھی، فقط دھندلی دھندلی ویران نگاہوں سے میت کی طرف دیکھ کر اپنا سر دُھنتی جاتی تھی۔

شہر کے معززین داروغہ کے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ سب کے دل درد اور کسک سے لبریز تھے۔ ان کی نظریں اس بڑھیا پر مرکوز تھیں۔ ہر شخص کے دل میں اس بدقسمت ماں اور اس کے مرحوم جگر گوشے کے لیے رحم، افسوس اور ہمدردی کے جذبات امڈ رہے تھے۔

محرر حمد پارٹی میں شریک تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے ان لوگوں کی قیادت کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے نزدیک کسی نوجوان کی مرگِ بے ہنگام کی اتنی اہمیت نہیں جتنی ان حمد گانے والوں کی پارٹی کی قیادت کی۔ وہ کمال یکسوئی اور انہماک کا اظہار کر رہا تھا اور کبھی کبھی ان کو ٹوک کر ٹھیک طرزوں پر گانے کی ہدایت بھی کر دیا کرتا تھا، لیکن وہ لوگ تو اس کی طرف توجہ ہی نہ دیتے تھے۔

قبرستان میں پہنچ کر کیلیا جن جنازے کے قریب آ کر نکولس کے لیے اپنی طرف سے ہمدردی

کے کچھ الفاظ کہنے لگا، لیکن وہ ایک جملہ بھی پورا نہ کر پایا۔

اس نے کہنا شروع کیا، ''آپ لوگ اس کے لیے اتنے غمگین نہ ہوں۔ جوانی کے دنوں میں دنیا سے رخصت ہو جانا کوئی ماتم کرنے کی بات نہیں...''

''ماتم کرنے کی بات نہیں؟''

بڑھیا یکا یک چیخ اٹھی اور پاگلوں کی طرح اپنے آپ کو لوگوں سے چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ داروغہ کا دل بھر آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ غمزدہ ہو کر بولا، ''صبر کرو۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ یہ سب کچھ اس مقدس باپ کے ہاتھ میں ہے۔ رونے چلّانے سے اب فائدہ کیا ہے؟''

''سب کو ایک دن مرنا ہے اماں!'' نائب داروغہ نے بھی اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب کو ایک نہ ایک دن یہیں آنا ہے۔''

لیکن میریا نے کسی کی نہ سنی۔ آہستہ آہستہ اس کا سسکیاں لینا آہ وزاری میں تبدیل ہو گیا اور وہ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے رونے کے شور میں کیلیا جن کی تقریر کسی کو بھی سنائی نہ دی۔

لاش دفنائی جانے لگی۔

''کولیا!'' وہ چلّا چلّا کر رونے لگی۔ ''ارے تو نے کیا کر لیا؟''

داروغہ نے اپنا رومال نکال لیا۔ آس پاس کھڑے سب لوگوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

مٹی ڈال دی گئی۔ لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ قبرستان میں پھر سناٹا چھا گیا۔ اب قبرستان میں وہ بڑھیا رہ گئی تھی یا قریب کی جھاڑیوں پر پھدکتے ہوئے پرندے۔ پرندے تو حسب معمول چہچہا رہے تھے لیکن بدنصیب ماں پھولوں سے ڈھکی ہوئی قبر کے سامنے بیٹھی انتہائی دلخراش آواز میں سسکیاں بھر رہی تھی۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے اس مٹی کے تودے کو دیکھ رہی تھی اور دردناک آواز میں دھیمے دھیمے گنگنا رہی تھی:

''ہائے بیٹا! ہائے میرے لال...''

❄❄

Scanned with CamScanner

ابنِ انشا

بڑی عدالت میں

یہ ذکر اس خیراتی کا ہے جو چوڑی فروشوں کے محلے میں امپیریل نیلام گھر سے دو دکانیں چھوڑ کر سیٹھ شعبان بھائی رمضان بھائی سوت والے کے سوت گودام کے سامنے ایک کھولی میں رہتا تھا۔

خیراتی مر گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اس کی موت کا اس دنیا والوں پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ کوئی نہیں جانتا کہ خیراتی کون تھا، کیسے زندگی بسر کرتا تھا اور کس عارضے سے مرا۔ نہ کسی روزنامے میں اس کے مرنے کی خبر چھپی اور نہ کوئی پیغامِ تعزیت۔ اس قسم کا کوئی اعلان بھی تو نظر سے نہ گزرا کہ ''جن احباب نے میاں یا مرزا یا سید خیرات حسین کی وفاتِ حسرت آیات پر تعزیت اور ہمدردی کے خطوط اور تار بھیجے ہیں ان سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں، اس لیے بذریعۂ اخبار ہذا... وغیرہ۔'' کسی انجمن نے بھی کوئی قرارداد منظور نہیں کی کہ خیراتی (یا خیرات حسین) کی موت سے قومی زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ پورا ہونا مشکل ہے۔ نہ اس کے سوگ میں بازار کی دکانیں بند ہوئیں نہ جھنڈے سرنگوں ہوئے۔ چوڑی فروش اسی طرح ہنس ہنس کر چوڑیاں بیچتے رہے۔ کھولی کے سامنے جو قلفی والا بیٹھتا ہے وہ اس شام بھی اُسی عظیم الشان آواز میں چلاتا رہا، ''قلفی بھئی قلفی بمبئی والی، کھوئے والی۔ کھاؤ گے تو یاد کرو گے!'' رات کو کھولی کے سامنے جو خارش زدہ کتا لیٹتا ہے، اسے بھی تین چار دن بعد جا کر یہ احساس ہوا کہ کھولی کا مالک بدل گیا ہے، کیونکہ نئے مالک نے، جو ایک آوارہ گرد فقیر تھا اور لوگوں کو سٹے کے نمبر بتایا کرتا تھا، اس روز اسے زور کی لات مار کر بھگا دیا تھا۔ پہلے مالک نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔

Scanned with CamScanner

وہ ایک سائے کی طرح اس دنیا میں آیا اور گزر گیا۔ اس نے اتنے وسیع کرۂ ارض پر کوئی جائیداد چھوڑی اور نہ ہی مخلوق میں سے کسی کے دل میں اپنی یاد کا کوئی نشان۔

اس کے پیدا ہونے پر بھی نہ گھر کے دروازے پر باجے گاجے بجے تھے نہ زرق برق لباسوں والے مہمان دعوت کھانے آئے تھے۔ محلے کی نائنوں اور میراسنوں نے نہ آ کر ڈھول بجایا نہ لچھے دار زبان میں بدھائی دی۔ اس کے باپ نے، جو ریس کے گھوڑوں کی مالش کیا کرتا تھا اور ڈٹ کر تاڑی پیتا تھا، خیراتی کی پیدائش کے تیسرے چوتھے ہی روز اس کی ماں کو سیٹھ سدانند کی مِل پر دال پھٹکنے کے لیے بھیج دیا تھا۔

خیراتی زندگی بھر انفرادیت کو ترستا رہا — ہوسکتا ہے اسے انفرادیت کا علم ہی نہ ہو۔ وہ بالو کے لاتعداد ذروں میں سے ایک تھا جو وسعتِ صحرا میں پریشان رہتے ہیں۔ ہوا انھیں کبھی اِس ڈھیر میں دبا دیتی ہے کبھی اُس ڈھیر میں۔ مرنے پر بھی اس کے ساتھ یہی ہوا۔ اس کی قبر قبرستان کے ایک دور افتادہ ریتیلے کونے میں بنائی گئی، اور ہوسکتا ہے اب تک اس کا نام و نشان مٹ گیا ہو۔ اس کے گرد نہ کوئی چار دیواری بنائی گئی تھی نہ کوئی کتبہ نصب کیا گیا تھا، ورنہ ممکن تھا آئندہ چکر میں کبھی کتبے کا پتھر کسی محقق کے ہاتھ لگ جاتا اور خیراتی کا نام اس دنیا میں دوبارہ سنائی دے جاتا۔

خیراتی بیمار پڑا تو اسے اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اس کی کھولی پر درجن بھر آدمی پہلے سے تاک لگائے بیٹھے تھے اور انھوں نے نیلام بول کر سب سے اونچی بولی دینے والے شخص (اس آوارہ فقیر) کو وہ کھولی دے دی۔ مرنے کے بعد اسے اسپتال کی چارپائی پر قبرستان پہنچا دیا گیا، لیکن اس سے پہلے ہی بیس مریض اس چارپائی کے خالی ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

جب وہ قبرستان میں دفن کیا جا رہا تھا تو بیس آدمیوں کو، جو ایک دیوار کے گرنے سے مر گئے تھے، وہاں لایا گیا۔ کون جانتا ہے کہ کتنے آدمی اس کی قبر کی مختصر سی جگہ خالی ہونے کی راہ دیکھ رہے ہوں گے، اور شاید وہ جگہ خالی بھی ہوگئی ہو۔

وہ چپ چاپ اس دنیا میں آیا تھا، چپ چاپ رہا اور چپ چاپ ہی رخصت ہوگیا۔ اسے دفن بھی کر دیا گیا۔ لیکن عالمِ بالا میں ایسا نہیں ہوا۔ وہاں تو اس کی آمد سے سنسنی پھیل گئی۔

جنت میں پاک روحوں کا استقبال کرنے والے فرشتے کے قرنا کی آواز بہشت میں پھیل گئی۔

بارگاہِ عالی کے نقیب بڑے بڑے ناقوس کے لیے ادھر اُدھر اعلان کرتے پھر رہے تھے۔ ''میاں خیراتی کی عالم بالا میں آمد آمد ہے — میاں خیراتی کو بارگاہِ خداوندی میں طلب کیا گیا ہے۔'' عرشِ معلی اس آواز سے کانپ رہا تھا: ''میاں خیراتی خوش آمدید، خوش آمدید!''

نشیلی آنکھوں والے، سنہرے پروں والے اور چنچل پاؤں میں چاندی کے سلیپر پہنے ہوئے خوبصورت اور نوعمر پریزاد خیراتی کی پیشوائی کو دوڑے دوڑے آئے۔ ان کے پروں کی سرسراہٹ، سلیپروں کی چھن چھن اور ان کے خوبصورت گلابی ہونٹوں کے مسرت بھرے قہقہے عرش میں گونجتے ہوئے خداوندِ اعلیٰ کے تختِ معلی تک پہنچ گئے۔ خداوند کو بھی میاں خیراتی کی آمد کی خبر ہو گئی تھی۔

ابراہیم بابا نے بہشت کے دروازے پر آ کر اپنا داہنا ہاتھ بڑھا کر خیراتی کا پرجوش استقبال کیا اور ان کا جھریوں بھرا چہرہ ایک ملکوتی تبسم سے چمک اٹھا۔

ساتھ ہی ایک گھن گرج کی آواز آئی۔

دو فرشتے ایک بھاری پہیے دار سونے کی کرسی خیراتی کے بیٹھنے کے لیے کھینچ کر بہشت میں لا رہے تھے۔

اور دفعتاً چمک سے سب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

یہ نایاب جواہرات سے مرصع اس تاج کی چمک تھی جو خیراتی کے لیے لایا جا رہا تھا۔

بہشت میں رہنے والے اولیا اور بزرگوں کی روحیں یہ شکوہ دیکھ کر رشک بھرے لہجے میں پوچھنے لگیں، ''ہیں! خداوند کے دربار میں اس کے گناہوں اور نیکیوں کا محاسبہ ہونے سے پہلے ہی یہ سلوک؟''

فرشتوں نے جواب دیا، ''اس کے اچھے برے اعمال کا محاسبہ تو محض رسم نبھانے کے لیے کیا جائے گا۔ بہشت کا سرکاری وکیل بھی خیراتی کے خلاف کچھ نہیں کہے گا۔ اس کا فیصلہ ہونے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ آپ لوگوں نے میاں خیراتی کا نام نہیں سنا؟''

جب چھوٹے چھوٹے فرشتوں نے خیراتی کی روح کو ہوا میں سے پکڑا، اس کے سامنے ایک ملکوتی گیت گایا، جب ابراہیم بابا نے ایک پرانے دوست کی طرح اس سے مصافحہ کیا، جب اس نے دیکھا کہ اس کے لیے بہشتِ بریں کا طلائی تخت آ رہا ہے اور اسے تاج پہنایا جائے گا، جب اس نے

سنا کہ بارگاہِ عالی میں اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہا جائے گا، تو خوف سے اس کی زبان ساکت ہوگئی، وہ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا اور اس نے سوچا: ''یا تو یہ عالمِ خواب ہے یا کسی غلط فہمی کی بنا پر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔''

ان دونوں باتوں کا اسے اپنی زندگی میں اکثر تجربہ ہو چکا تھا۔ جب وہ نیچے دنیا میں تھا، اس نے کئی بار خواب میں دیکھا تھا کہ ڈھیروں روپیہ زمین پر بکھرا پڑا ہے جسے وہ اکٹھا کر رہا ہے، اور بیدار ہونے پر وہ پہلے سے زیادہ مفلس ہوتا تھا۔ کئی بار یہ بھی ہوا کہ بازار میں کسی نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا، لیکن بعد میں وہ شخص اپنی غلطی سے مطلع ہونے پر نفرت سے منھ پھیر کر چلا گیا۔

اس لیے خیراتی نے آج بھی یہ سوچا کہ میری قسمت ہی ایسی ہے۔ وہ سر جھکائے اور آنکھیں بند کیے چپ چاپ کھڑا تھا۔ اسے خوف تھا کہ آنکھیں کھلتے ہی اس خواب کا خاتمہ ہو جائے گا اور وہ اپنے کو جہنم کے کسی غار میں سانپوں اور چھپکلیوں کے درمیان پڑا پائے گا۔ وہ کوئی لفظ منھ سے نکالتے اور پلکوں کو ذرا بھی اوپر اٹھاتے ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی اسے پہچان نہ لے اور اسے دوزخ میں نہ پھینک دیا جائے۔

وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ نہ وہ ان گیتوں کو سن رہا تھا جو فرشتے اس کی توصیف میں گا رہے تھے اور نہ اس جشنِ مسرت کی طرف متوجہ تھا جس کا اہتمام اس کی آمد پر اور اس کے لیے کیا گیا تھا۔ ابراہیم بابا کے پرجوش استقبال کا بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بارگاہِ معلیٰ میں پہنچ کر آداب بجالانا تک بھول گیا۔

جب اس کی نظر عدالتِ خداوندی کے فرش پر پڑی تو وہ اور بھی سراسیمہ ہوگیا۔ یہ فرش شفاف اور نایاب سکوں کا تھا۔ میرے پاؤں کے نیچے ایسا فرش؟ وہ خوف سے بے حال ہوگیا اور سوچنے لگا کہ یہ لوگ نہ جانے کس ولی اور بزرگ کے دھوکے میں میری اتنی عزت کر رہے ہیں۔ اس اصلی شخص کے آنے پر انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا تو معلوم نہیں میرا کیا حال کریں گے!

اس گھبراہٹ کی وجہ سے وہ منصفِ عدالت کا یہ اعلان بھی نہ سن سکا کہ ''خیراتی کا مقدمہ پیش ہو!'' اس کے متعلق جو مسلیں اور فائلیں تھیں، منصف نے انھیں خیراتی کے وکیل کے حوالے کرتے ہوئے کہا: ''انھیں پڑھیے۔ لیکن از راہِ کرم اختصار کا خیال رکھیے۔''

Scanned with CamScanner

خیراتی کو ساری کچہری گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے کان دھائیں دھائیں کر رہے تھے، تاہم وکیل کے ہونٹوں سے ستار کے شیریں اور مترنم سروں کی طرح الفاظ کی جو دھارا بہہ رہی تھی وہ اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔

وکیل کہہ رہا تھا: ''مائی لارڈ، مسمی خیراتی کا نام اس کی شخصیت پر بالکل اسی طرح چست بیٹھتا ہے جیسے کسی ہوشیار درزی کی سلی ہوئی اچکن کسی متناسب جسم پر۔''

خیراتی سوچنے لگا: ''یہ کیا کہہ رہا ہے؟''

منصف نے وکیل کو ٹوک کر کہا: ''ازراہِ کرم تشبیہیں رہنے دیجیے۔''

وکیل آگے کہنے لگا: ''اس نے زندگی بھر خدایا کسی انسان کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاری کبھی نہیں چمکی، نہ اس کے دل میں کبھی ہوس کی سیاہی کو بار مل سکا ہے۔''

خیراتی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ منصف عدالت نے درشت لہجے میں وکیل کو پھر ٹوکا: ''مہربانی کر کے شاعرانہ لہجے میں بات مت کیجیے۔''

وکیل نے پھر کہنا شروع کیا: ''حضرت ایوب پر اتنی مصیبتیں نہیں ٹوٹی تھیں، پھر بھی وہ خیراتی کی طرح آخر دم تک ثابت قدم نہ رہ سکے۔''

منصف خاموش ہو کر چلایا: ''میں صرف واقعات سننا چاہتا ہوں۔''

''واقعات؟ پیدائش کے مہینہ بھر بعد خیراتی کا ختنہ ہوا——''

ایسی معمولی باتوں کا ذکر قطعاً غیر ضروری ہے،'' فاضل منصف پھر بول اٹھے۔

''اس موقعے پر جو جرّاح بلایا گیا وہ نیم حکیم تھا اور خون کا بہنا نہ روک سکا۔''

''کہتے جائیے۔''

''پھر بھی خیراتی خاموش رہا۔ بارہ سال کی عمر کا تھا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور اسے ایک سوتیلی ماں سے واسطہ پڑا۔ وہ سوتیلی ماں نہیں تھی بلکہ ناگن تھی، ڈائن تھی... چڑیل تھی...''

خیراتی نے سوچا: ''کہیں سچ مچ میری ہی تو بات نہیں ہو رہی ہے؟''

منصف صاحب نے پھر وکیل کو ڈانٹا: ''دوسرے لوگوں کی مذمت مت کیجیے۔''

Scanned with CamScanner

''سوتیلی ماں خیراتی کو ٹکڑے ٹکڑے کے لیے ترساتی تھی اور خود وہ کٹنی بڑھیا دودھ ملائی پر ہاتھ صاف کرتی تھی۔''

فاضل منصف نے چلّا کر کہا،''ازراہِ کرم مطلب کی بات کیجیے۔''

''وہ خیراتی بچارے کو اپنے ناخنوں سے اس طرح نوچتی تھی کہ اس کا سارا جسم لہولہان ہو جاتا تھا۔ ہر کام خیراتی کو کرنا پڑتا تھا۔ لکڑی لائے تو خیراتی، آٹا لائے تو خیراتی۔ اور سردیوں میں خیراتی میاں، نہ پاؤں میں جوتا نہ جسم پر کپڑا، اس کو اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے چکی بھی پیسنی پڑتی تھی اور لکڑیاں بھی پھاڑنی پڑتی تھیں۔ کئی بار اس کے ہاتھوں میں موچ آ گئی۔ کئی بار اس کا جسم پھوڑوں سے گل گیا، پھر بھی اس نے اپنے باوا سے کبھی شکایت نہ کی۔ نہ اس کا کوئی دوست تھا نہ مونس نہ ہم جلیس نہ ہمدم۔''

''اصل بات کہیے،'' عدالت مآب نے پھر چلّا کر کہا۔

''جب ایک رات اس کے والد نے نشے میں دھت ہو کر اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر دروازے میں سے باہر پھینک دیا تو وہ زخموں اور چوٹوں کی پروا نہ کرتے ہوئے کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور جدھر سینگ سمائے، روانہ ہو گیا۔ وہ بھوک سے بے حد نڈھال تھا، لیکن اپنی وضع پر قائم رہا۔ اس نے زبان سے کبھی نہ کھانے کی کسی سے التجا کی نہ پیسے کی۔

''آخر ایک رات وہ ایک بڑے شہر میں جا پہنچا۔ اس روز زوروں کی بارش ہو رہی تھی اور جھکڑ چل رہا تھا۔ اس شہر میں خیراتی اس طرح غائب ہو گیا جیسے سمندر میں پانی کا ایک حقیر قطرہ۔ پہلی رات اسے آوارہ گردی کے الزام میں حوالات میں رہنا پڑا، جہاں بارش سے بچاؤ رہا، لیکن صبح وہاں سے بھی نکال دیا گیا۔ باہر آ کر اسے بڑے سے بڑا بوجھ ڈھونا پڑا۔ پھر بھی اکثر رات کو بھوکا ہی سوتا تھا۔ اس پر بھی وہ چپ رہا۔

''اجنبیوں اور بچوں نے اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر اس پر اینٹیں پھینکیں، کیچڑ پھینکا اور ایک بدمعاش تانگے والا تو اپنا تانگہ ہی اس پر چڑھانے لگا تھا۔ خیراتی مرتے مرتے بچا، لیکن پھر بھی اس نے اُف نہ کی، حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا۔''

منصف نے کہا،''اس طرح تو آپ بہت وقت لیں گے۔ ذرا اختصار ملحوظ رکھیے۔''

Scanned with CamScanner

وکیل نے کہا، ''ایک دفعہ وہ ایک امیر کے اصطبل کا چوکیدار ہو گیا۔ لیکن اس نے کبھی تنخواہ مانگنے کے لیے اپنی زبان نہ کھولی۔ پہلی تاریخ کو وہ آقا کے دروازے پر ایک بھکاری کی طرح جا کھڑا ہوتا تھا اور کچھ نہیں کہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی لجاجت ہوتی تھی جیسے روٹی مانگتے وقت کسی مسکین کتے کی آنکھوں میں۔

''اس کا آقا گدی پر بیٹھے بیٹھے کہہ دیتا تھا، 'جاؤ، پھر کسی دن آنا!' اور خیراتی جیسے اس حکم کا منتظر ہو، فوراً سائے کی طرح غائب ہو جاتا تھا اور پھر کسی روز پہلے سے بھی زیادہ خاموشی اور مسکینی سے اپنی تنخواہ کا مطالبہ کرتا۔

''لوگوں نے کبھی خیراتی کو پوری مزدوری نہ دی۔ کسی نے اسے کھوٹے سکے دیے، کسی نے دھتکار دیا، اور وہ چپ ہی رہا، خاموش ہی رہا۔''

خیراتی نے دل ہی دل میں کہا، ''یہ سچ مچ میری ہی بات ہو رہی ہے۔''

پانی کا ایک گھونٹ پی کر وکیل پھر گویا ہوا، ''ایک دفعہ خیراتی کی زندگی میں تھوڑا سا انقلاب بھی آیا۔ ایک روز ربڑ کے پہیوں والی ایک بگھی بڑی تیز رفتاری سے اس کے پاس سے نکلی۔ اس کے گھوڑے بدک گئے تھے، کوچبان بہت دور پیچھے سڑک پر پڑا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور بے تحاشا بھاگتے ہوئے گھوڑے کے منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ اس کے سموں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں اور بگھی میں ایک سہما شخص ادھ موؤں کی طرح دبکا بیٹھا تھا۔

''خیراتی نے بگڑے ہوئے گھوڑوں کو روک لیا۔

''اس طرح خیراتی نے جس شخص کو بچایا تھا وہ ایک شریف اور رحمدل آدمی تھا۔ اس نے خیراتی کے احسان کو فراموش نہ کیا اور اسے اپنے مرحوم کوچبان کی جگہ دے دی۔ یہی نہیں بلکہ اس بھلے آدمی نے خیراتی کے لیے ایک بیوی کا بھی انتظام کر دیا۔ پھر بھی خیراتی خاموش رہا۔''

کچھ لوگوں کی دبی دبی ہنسی کی آواز آئی۔ منصف نے ڈانٹ کر کہا، ''ان لوگوں کو باہر نکال دو۔''

''ان کا مطلب مجھی سے ہے،'' خیراتی نے اپنے آپ سے کہا۔ اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ عرش والوں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ پھر بھی اسے اتنا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ آنکھ اٹھا کر منصف کی طرف دیکھے۔

Scanned with CamScanner

''جب اس کا آقا دیوالیہ ہو گیا اور اسے تنخواہ نہ دے سکا، تب بھی وہ چپ رہا۔ جب اس کی بیوی شیر خوار بچے کو چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تب بھی وہ خاموش رہا۔

''وہ اس وقت بھی کچھ نہ بولا جب پندرہ سال بعد اس بچے نے ہوش میں آنے پر اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔''

''ان کا مطلب واقعی مجھ سے ہے،'' خیراتی خوش ہو کر بولا۔

وکیل ملائم اور درد بھرے لہجے میں پھر کہنے لگا، ''وہ اس وقت بھی چپ رہا جب اس کے آقا نے اور سب کا حساب چکا دیا لیکن خیراتی کی تنخواہ کی ایک پائی بھی ادا نہ کی، اور اس وقت بھی جب اس کے آقا کی وہی ربڑ کے پہیوں والی گاڑی جس میں بگڑا ہوا گھوڑا جتا تھا، اس کے اوپر سے نکل گئی...

''وہ بالکل خاموش رہا۔ اس نے پولیس تھانے جا کر اتنا بھی نہ کہا کہ اسے کسی نے لنگڑا کر دیا ہے۔

''وہ اسپتال میں جا کر بھی چپ رہا جہاں کسی کو رونے چلّانے اور کراہنے سے منع نہیں کیا جاتا...

''وہ اس وقت بھی چپ رہا جب ڈاکٹر نے پانچ روپے رشوت لیے بغیر اسے دوا دینے سے انکار کر دیا...

''اور اس وقت بھی چپ رہا جب نرس نے ایک روپیہ نہ ملنے پر اس کے زخموں کو جان بوجھ کر خراب کر دیا۔

''جاں کنی کے عالم میں بھی وہ خاموش رہا اور جب موت کے فرشتے نے اس پر اپنے سیاہ پنکھ پھیلا دیے اس وقت بھی چپ رہا۔

''اس نے نہ کبھی خدا کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نکالا، نہ کسی انسان کے خلاف — مجھے بس اتنا ہی کہنا تھا۔''

خیراتی کے جسم میں ایک کپکپی دوڑ گئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب سرکاری وکیل کی باری ہے — خدا جانے وہ کیا کہے۔ خود خیراتی کو اپنی زندگی کے سارے حالات یاد نہ تھے۔ کبھی کوئی واقعہ ہوتا تھا تو دوسرے ہی لمحے خیراتی کے حافظے سے فرو ہو جاتا تھا۔ وکیل کی باتوں سے اسے سب کچھ دھندلا دھندلا یاد آنے لگا۔ اس نے سوچا، ''خدا جانے اب سرکاری وکیل میرے کون کون سے جرائم اور گناہ

کھود نکالے گا۔ اور اس نے جرح کی تو؟''

''مائی لارڈ... ''سرکاری وکیل نے تیز لہجے میں اور نہایت وقار سے کہنا شروع کیا۔ لیکن وہ پھر رک گیا۔

''مائی لارڈ... ''اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ لیکن پہلے سے زیادہ ملائمت سے — لیکن وہ پھر رک گیا۔ آخر اس کے گلے سے مکھن اور ریشم کی سی نرم اور ملائم آواز سنی۔

''مائی لارڈ، خیراتی عمر بھر خاموش رہا ہے۔ میں بھی خاموش ہی رہوں گا۔''

تھوڑی دیر تک عدالت میں سکوت رہا۔ پھر ایک دوسری نہایت شیریں اور لرزتی ہوئی آواز سنائی دی:

''خیراتی... میرے بچے خیراتی...''

یہ الفاظ خیراتی کے دماغ میں ستار کے تاروں کی جھنجھناہٹ کی طرح گونج اٹھے۔

''میرے پیارے بیٹے... میرے بیٹے، میرے خیراتی!''

جب سے اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا، اسے ایسے محبت بھرے الفاظ سننے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

فاضل منصف نے کہا، ''میرے بیٹے، تم نے زندگی بھر مصیبتیں اٹھائی ہیں، دکھ جھیلے ہیں، لیکن صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ تمھارے جسم کا کوئی جوڑ ایسا نہیں جس سے خون نہ بہا ہو۔ پھر بھی تم ہمیشہ خاموش رہے...

''نیچے کی دنیا والے ان باتوں کی قدر نہیں کرتے۔ شاید تم خود بھی نہیں جانتے کہ تم شکایت کر سکتے تھے، فریاد کر سکتے تھے، اور تمھاری ایک ہی پکار سے عرش معلٰی کی دیواریں لرز جاتیں، لیکن تم خاموش رہے۔

''وہ دنیا ہوا و ہوس کی دنیا ہے۔ وہاں کسی کو اس کی محنت کا اجر نہیں ملتا۔ یہ حق و انصاف کی بارگاہ ہے۔ یہاں تمھیں تمھارا حق ملے گا۔

''یہاں تم جو کچھ مانگو گے، پاؤ گے۔ بہشت کی سب نعمتیں تمھارے قدموں میں ہیں۔''

خیراتی نے پہلی بار نظریں اوپر اٹھائیں۔ ایک چکا چوند سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ درو دیوار سے نور برس رہا تھا۔ ہر چیز سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ عدالت کی چھت پر، فرشتوں

Scanned with CamScanner

کے سروں پر، انصاف کی کرسی پر، سب جگہ ایک غیر ارضی نور مستولی تھا۔

''کیا یہ سچ ہے؟'' اس نے حیا اور شک کے ملے جلے لہجے میں آہستہ سے کہا۔

''بلا شک وشبہ!'' منصف نے کہا۔ ''میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ سب کچھ تمھارا ہے۔ بہشت کی ہر چیز پر تمھارا حق ہے۔ تم جو چاہو لے سکتے ہو، بس منھ سے بولنے کی دیر ہے!''

''سچ مچ؟'' خیراتی نے ایک بار پھر پوچھا، اب کے ذرا اعتماد اور یقین کے لہجے میں۔

''ہاں ہاں — بلا شک!'' سب نے اسے یقین دلایا۔

''اگر یہی بات ہے،'' خیراتی نے کہا، ''تو میں چاہتا ہوں کہ مجھے ہر روز دو گرما گرم تنوری روٹیاں اور پیالہ بھر دال بلا ناغہ ملا کرے۔''

منصفوں نے اور فرشتوں نے شرما کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔ بارگاہِ عالی کا نور گھٹ کر دیے کی مدھم روشنی بن گیا، اور سرکاری وکیل کی ہنسی سارے عرشِ معلیٰ میں گونج گئی۔

❁❁

Scanned with CamScanner

شاعری بھی علم دریاؤ ہے

آج کل کی شاعری کا عجب ہنجار ہے۔ جو جس کے جی میں آتی ہے بنکار رہا ہے۔ ثقہ طبیعتیں نئے زمانے کے ان سرشور شعرا سے سخت بیزار ہیں۔ کیا زمانہ آ لگا ہے کہ ایسا کوئی شعر کان میں پڑے مہینوں گزر جاتے ہیں جس میں پرانے، استادوں کے رنگ کی ذرا سی بھی جھلک ہو — کچھ نازک خیالی، کچھ بیان کی بوقلمونی، کچھ زبان کا چٹخارا۔ بات یہ ہے کہ یہ نئے لوگ محنت اور کاوش نہیں کرتے جسے غالب کی زبان میں 'کاوِکاوِ' کہتے ہیں، اور اگر کوئی کرے تو اسے خاطر میں نہیں لاتے، دقیانوس کا لقب مرحمت فرماتے ہیں۔ خیر میاں آزاد، تجھ کو اس سے کیا غرض، تجھے تو انشراحِ قلب کا سامان کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ آج بھی لے، یہ دو دیوان شاعری کے ہیں۔ پڑھ اور ان نغز گویوں کے چکیدہ قلم سے حظ اور فیض اٹھا جو روایت اور قدامت کی آبرو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ دوسروں کو بھی ان کی جھلک دکھلا، کہ لذت اور عبرت کا توشہ حاصل کریں۔ یقین رکھ کہ مصنف بھی تجھے دعائے خیر سے یاد کریں گے کہ کوئی تو ان لولوے لالا کی قدر کرنے والا نکلا، اور اے دریاے معاصی کے شناور، تجھے دعا کے علاوہ چاہیے بھی کیا؟ اما بعد...

1

پہلی کتابِ مستطاب جو سامنے آتی ہے اس کا نام شراب ہے۔ لطفِ مزید کے لیے ہم رنگین

اور مجلد گرد پوش کی پوری عبارت نقل کرتے ہیں:

بسم اللہ کر کے کتاب کھولیے۔ پھر سامنے کتاب کا نام اور 1961 کے نیچے ایک شعر ملے گا:

اے تصور یہ تصوف کی شراب تو شرابوں میں ملا دے ظالم

اس کے بعد جملہ حقوق محفوظ والا صفحہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بلاک ڈیزائننگ حضرت مصنف نے خود کی ہے۔ بلاک پرنٹنگ کا اعجاز مشین مین استاد محمد خالد ناظمی کی استادی کا مرہون ہے۔ دیباچہ اور غزلیات لکھنے والے کاتبوں کے نام الگ مرقوم ہیں۔ طباعت مشین مین استاد ظہور محمد صدیقی (ماہرِ تخجیم) نے کی اور جلد بندی استاد چودھری محمد بشیر (پنجاب والے) نے۔ واضح رہے کہ شروع کے چودہ صفحات رنگ برنگے بلاک میں چھپے ہیں اور ان پر وارنش بھی کی گئی ہے جس میں سرسوں کے تیل کی آمیزش کا ہمیں شبہ ہے۔ خیر، جملہ حقوق محفوظ ہو گئے۔ آگے کے صفحے پر دورنگی چھپائی ایک تصویر

کی۔ فضا میں ایک پری اڑ رہی ہے جو بظاہر چگادڑ معلوم ہوتی ہے۔ نیچے شاید کشتی ہے اور بیچوں بیچ ایک شعر آبدار:

دیکھ اے گردشِ دوراں تو حقارت سے نہ دیکھ　　ہم کسی تختِ سلیمان سے گزرے ہوں گے

(تصور)

اخاہ! تو یہ تختِ سلیمان ہے۔ شاعر نے ہر شعر کے ساتھ، خواہ وہ سرورق پر ہے یا اندر، اپنا تخلص ضرور ٹانک دیا ہے۔ مالِ عرب پیشِ عرب۔ یوں تو کسی شاعر کے مجموعے میں اندر جو اشعار ہوں، عموماً اسی کے ہوتے ہیں، اور اس مجموعے کے اشعار بھی منفرد رنگِ کلام کو دیکھتے ہوئے نواب سید محی الدین علی خان تصور کے علاوہ کسی کے نہیں ہو سکتے، لیکن احتیاط شرط ہے۔ آج کل سرقے کی وارداتیں عام ہیں۔ اچھا تو صفحہ الٹیے۔ عرض کیا ہے:

شبنم سے سیکھیں گے تصور　　آنکھوں سے پھولوں کو دھونا

نیچے ایک گوبھی کا پھول ہے — ممکن ہے گلاب کا ہو — جس کے اندر ایک مدقوق سا چہرہ بنا ہوا ہے۔ آگے چلیے۔ جناب مصنف فارسی میں بھی بند نہیں۔ رنگا رنگ زمین پر دو قطعات ہیں۔ دوسرا ان میں سے یہ ہے:

من کہ بینم مہ و مہتاب سدا　　من صدائے دلِ بیتاب سدا

ایں فراغ غم ہستی توبہ　　نوحۂ نغمۂ مضراب سدا

اس میں 'سدا' کا لفظ اس خوبصورتی سے کھپایا ہے کہ فارسی ہی کا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس سے اگلے صفحے پر بھی ایک قطعہ فارسی کا ہے جسے ہم فارسی کا ذوق کم ہونے کی وجہ سے نظر انداز کرتے ہیں۔ آگے جنرل اعظم خاں کے نام باقاعدہ انتساب کا صفحہ گزر کر ہم مصنف کے حالات کے خلاصے پر آتے ہیں۔ ''سنہ آغازِ سخن: 1929۔ کتب اشاعت شدہ: (1) شاہد و مشہود (2) تصویرِ تصور (3) بہادر خان مجاہدِ اسلام (نظم 92 شعر)۔ مضامینِ پسندیدہ: فلسفہ، تصوف، تاریخ، قانون، اردو ادب، انگریزی ادب۔ پیشہ: تجارت، زراعت، لینڈ لارڈ و زمیندار۔ تاریخ ولادت: 19 ربیع الاول 1335 بروز اتوار، دو و نیم ساعت، پچیس لمحہ، شام۔ 1949 میں پاکستان آئے۔''

Scanned with CamScanner

اے آمدنت باعثِ آبادیِ ما

آگے مصنف کی تصویر ہے۔ چہرے مہرے سے بہت سنجیدہ اور مدبر لگتے ہیں۔ لگتے ہی نہیں، ہیں بھی۔ تصویر پر ان کا اپنا آٹوگراف ہے:

آپ پوچھیں گے تصور کس سے کون بتلائے گا دنیا کیا ہے

اگلے دو صفحوں میں بھی ان کے باتصویر قطعات ہیں۔ پہلے قطعے میں ''کلیدِ درِ میخانۂ زیست'' کے الفاظ ہیں، لہٰذا ایک تالا، ایک چابی اور ایک جام بھی بنایا ہے۔ ایک طرف نمک دانی سی ہے اور ایک کونے میں چھتری ہے — یا کچھ اور ہوگا۔ نیچے کے قطعے میں ''محورِ گردشِ دوراں ہے خیال'' کے مصرعے کی رعایت سے دنیا کا نقشہ بصورتِ گلوب مع آسٹریلیا اور جنوبی امریکہ وغیرہ بنا رکھا ہے۔

ورق پر ورق الٹتے جایئے، قطعات اور تصویریں بالالتزام آتی ہیں۔ بلاک کے آخری صفحے پر خدا جانے کس کی تصویر ہے، جیغہ و دستار اور ریش و فش سے ہنری ہشتم کا دھوکا ہوتا ہے۔ نیچے شعر ہے:

کیوں التفاتِ یار نے بدلی نگاہِ عشق کیوں شامِ زندگی کا فسانہ بدل گیا

ہنری ہشتم کے حالاتِ زندگی ہمارے اس گمان کی تصدیق بھی کرتے ہیں۔

پیارے ناظرین، اندرونی صفحات ختم ہوئے، اب تعارف کی منزل ہے۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''اس کتاب کی اشاعت خداوند تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے جو میرے حال پر ہوا۔

''قیامِ پاکستان بھی خداوند تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ ہمیں ایک ملک عطا ہوا۔

''اکتوبر 1958 کا ایوبی انقلاب بھی جس نے ہمیں موجودہ حکومت دی، خداوند تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے۔''

اس سے نہ صرف یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تینوں وارداتیں برابر کی اہمیت کی ہیں، بلکہ یہ کہ بنیادی اہمیت کتابِ ہذا کی اشاعت کی ہے؛ بقیہ دو کے ساتھ 'بھی' کا لفظ حفظِ مراتب کی چغلی کھاتا ہے۔ اگلے پیرے میں آپ نے دعا کی ہے کہ ''ایوب، اعظم، برکی اور شیخ خدا کرے کہ جنم جنم پیدا ہوں۔''

پھر حیدرآباد (دکن) میں اپنے خاندانی حالات لکھے ہیں اور فرمایا ہے کہ ''مجھ سے ممکن نہیں کہ

حیدر آباد کو بھول جاؤں۔ میں نے پاکستان آنے کے بعد اپنی زبوں حالی کے زمانے میں لکھا تھا:

اک زندگی یہاں ہے، اک زندگی دکھن میں اک لاش بے کفن ہے، اک لاش ہے کفن میں

اللہ کا شکر ہے، اب وہ حالات نہیں رہے۔''

مصنف کی طبیعت میں مشرقی انکسار کا مادہ بہت ہے۔ لکھتے ہیں: ''اس کتاب کا ٹائٹل کور، اس کتاب کے تمام نقوش، اس کتاب کی تمام تصاویر میری اپنی بنائی ہوئی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں ان لوگوں میں ہوں جو حسبِ ضرورت ہمہ قسم کے کام کر لیتے ہیں۔ یہ ٹائٹل پیج اور یہ تصویریں میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار بنائی ہیں۔''

یہ آخری دعویٰ تسلیم کرنے میں ہمیں ضرور تامل ہوتا اگر نقوش خود اس کی گواہی نہ دیتے بلکہ فریادی نہ ہوتے۔ تعارف کا ایک پارہ اور سنیے:

''میری موجودہ عمر 46 سال ہے۔[1] 5 مارچ 1960 کو میں نے اپنی شادی کی کہ چل چلاؤ کے دن قریب آ گئے ہیں۔ میری بیوی کا نام فلاں ہے اور یہ فلاں صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ میری بیوی قبول صورت، اطاعت گذار اور فرمانبردار ہے۔ خدا کا حکم تھا کہ بغیر دیکھے اپنی پسند کی شادی ہو گئی۔'' آگے اپنے کچھ مرحوم بزرگوں کا ذکر کیا ہے اور نہایت حسرت سے لکھا ہے، ''کیا برا تھا اگر وہ زندہ ہوتے۔ بہرحال، مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔''

اس سے آگے الف تا یے ردیف وار ان کا کلام ہے جسے ہم اس لیے نقل نہیں کرتے کہ ملک میں نیا نیا کاپی رائٹ ایکٹ لگا ہے۔ جس کو بہت ضرورت ہو، مجلد کے لیے 5.75 اور غیر مجلد کے لیے 3.87 خرچ کرے۔ ٹائٹل پیج کے آخری صفحے پر جناب مصنف نے ہدایت کر دی ہے کہ ''اپنے شہر کے ہر کتب فروش سے طلب کیجیے۔'' یہ نہیں کہ ایک آدھ سے پوچھ لیا اور مطمئن ہو گئے۔

1۔ پہلے کیا کیا عمر رہی ہے، یہ نواب صاحب نے نہیں بتایا۔

Scanned with CamScanner

2

خوبیِ مضمون جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

پروفیسر آغا محمد شمس الدین حیدر عرف سید بڑے آغا لکھنوی نے اپنے مجموعہ کلام کا نام نگینہ شاید اسی رعایت سے رکھا ہے۔ ننھی منی سی تقطیع میں یہ کتاب چھپی ہے۔ سائز اس صفحے کے آدھے سے آدھا۔ بڑے آغا نے اتنی چھوٹی تقطیع کیوں پسند کی؟ ہم تو اسے بھی ان کے انکسار پر محمول کریں گے۔ آپ مولانا صفی لکھنوی (مرحوم) کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں لہٰذا اس کتاب کو ان کی روحِ پُرفتوح سے معنون کیا ہے۔ ''منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی'' یہ ان کے خودنوشت تعارف کا سرنامہ ہے۔ اربابِ نظر کو جاننا چاہیے کہ ان کے بزرگ یہاں کے نہیں تھے، باہر سے، یعنی نیشاپور سے آئے تھے اور، جیسا کہ ہونا ہی چاہیے، نواحِ دہلی میں ان کی جاگیر بھی تھی اور وظیفہ اور وثیقہ بھی ملتا تھا اور ان کے کچھ بزرگ صاحبِ دیوان شاعر بھی تھے۔ خود فرماتے ہیں کہ ''میرے خاندان میں شاعری موروثی چلی آرہی ہے اور اکثر میرے خاندان کے لوگ شاعر ہوتے ہیں اور اب بھی ہیں۔'' ان میں سے ایک کا قلمی دیوان تو آغا صاحب بتاتے ہیں، راجہ صاحب محمود آباد کی لائبریری میں بھی موجود ہے۔ جس کو یقین نہ آئے، جاکر دیکھ لے۔

یہ زمانہ زندگی کے ہر شعبے میں نودولتیوں کا ہے۔ شاعری کا بھی یہ حال ہے کہ جس کسی نے کچھ غزلیں نظمیں ڈھنگ کی کہہ لیں اور مقبول ہو گیا، شاعر کہلانے گا اور کسی کو خاطر میں نہ لانے لگا۔ کوئی پوچھے کہ میاں، تم تو ہوئے شاعر، لیکن تمھارے دادا نانا کیا کرتے تھے؟ انھوں نے بھی کبھی شاعری کی یا خواہ مخواہ اِترا رہے ہو؟ یقین ہے کہ اکثر لوگوں کو بغلیں جھانکتے ہی بنے گی۔ خود تو شعر ہر کوئی کہہ سکتا ہے، صاحبِ دیوان باپ دادا کا اتا پتا بتائے تو بات ہے۔ ہمیں اس مجموعے میں شاعری سے زیادہ جناب مصنف کی خاندانی وضع داریوں کا تذکرہ پڑھ کر بصیرت حاصل ہوئی۔ لکھتے ہیں:

''ایک دن میرے والد اور چچا کسی دکان پر کچھ سودا خرید رہے تھے۔ دادا کو جب معلوم ہوا تو بڑا غصہ آیا کہ تم شریف آدمی ہو کر بازار میں سودا خریدتے ہو۔ یہ خاندانی روایات کے خلاف ہے۔ جھگڑا اتنا بڑھا کہ والد صاحب قبلہ، مع سوتیلی والدہ کے، چچا کو ساتھ لے، کربلائے معلیٰ روانہ ہو گئے

Scanned with CamScanner

اور عتباتِ عالیات کی زیارتوں کے بعد وہیں مقیم ہو گئے۔''

غیرت ہو تو ایسی ہو، غصہ ہو تو ایسا ہو

سیّد بڑے آغا صاحب پہلے بندے کاظم جاوید سے اصلاح لیتے تھے، ''مگر جب انھوں نے ہم سے یہ شعر پڑھوایا:

آپ نے مٹی میں کیوں دابا حضور پھول ایسا دل مرا کمھلا گیا

تو ہمارا دل کھٹا ہو گیا اور اصلاح بھی لینا بند کر دیا۔ ابتداً ہمارے بہت معمولی شعر ہوتے تھے:

شبِ دیجور میں اے دل جو ہم فریاد کرتے ہیں
کسی کے گیسوے افعی کو رو رو یاد کرتے ہیں

مشاعرے میں سب نے تعریف کی مگر بعد کو دوستوں نے کہا کہ یہ کیا واہیات کہا کرتے ہو۔ تو ہمارا خیال ہے کہ ہم نے بعد کو کچھ ترقی کی ... یکا یک انقلاب آیا اور ہم پاکستان کراچی آ گئے۔ اسی انقلاب میں ہماری پیشتر کی سب غزلیں ضائع ہو گئیں۔ اب پھر کہنا شروع کیا ہے۔ تھوڑا سا اس میں سے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔''

آگے کا پیرا ہماری ناقص سمجھ میں نہیں آیا:

''یہاں ہمارے دماغ میں جوش صاحب قبلہ گھوما کرتے ہیں۔ کلام ہے کہ دریا امڈا آتا ہے۔ کس کس بات کی تعریف کروں۔ جس راستے نکل جاتے ہیں، آفت ڈھا دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ میں اپنے تمام حالات نہیں لکھنا چاہتا ورنہ ایک بڑی موٹی کتاب ہو جاتی۔ ہمت نہیں ہوتی کیونکہ فرصت کم ہے۔''

گویا نہ لکھنے کی تین وجہیں بیان کی ہیں: (1) لکھنا نہیں چاہتے، (2) ہمت نہیں ہوتی، (3) فرصت کم ہے۔

ممکن ہے بعض قارئین کرام آغا صاحب کی لمبی لمبی غزلیں دیکھ کر کہیں کہ فرصت تو ہے، لیکن اسے فرصت نہیں کہتے۔ وہ تو اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔ خود آغا صاحب کی زبانی سنیے:

''دلّی لکھنؤ کا تمدن یاد آتا ہے۔ خط چھوڑنے نکلے تھے، ایک صاحب مل گئے۔ ارے بھئی ٹھہرنا، میں آیا۔ کہو بھئی، کیسے ہو؟ نکلتے نہیں کیا گھر سے، آغا صاحب؟ ہاں بھئی، جب گھر سے نکلنے کا

ارادہ کیا، لگا ایک شعر دماغ میں گھومنے۔ بھئی یہ غزل کی بیماری بڑی مزیدار ہے۔ اچھا بھئی، مجھے ذرا دور تک پہنچادو! اور یہ کہتے کہتے ان کے مکان تک پہنچ گئے۔ شعروغزل شروع ہو گئے۔ دن کا ایک بج گیا۔ ارے بھئی، اب ہم کو جانے دو، فلاں فلاں کو کھانے پر بلایا ہے۔ تو ہم کو کیوں نہیں بلایا؟ بھئی معاف کرنا، بھول گئے۔ پھر سزا بھگتو، میں کھانا منگاتا ہوں، کھا کے جاؤ۔ مجبوراً کھانا کھانا پڑا۔ گھر پر کوئی تین بجے پہنچے۔ پتا چلا تین دوست آئے تھے، کھانا کھا گئے۔ ہم نے کہا، خیر... مگر یہاں تو:

اس شہر میں دل کا کوئی پرساں نہیں ملتا
میں ڈھونڈ رہا ہوں مجھے انساں نہیں ملتا"

حسرت و دردمندی سے لبریز یہ پورا قطعہ ہے جس کا آخری شعر ہے:

گر دلّی و لکھنؤ کا کوئی ایک یہاں دوست
آغا نہیں ملتا ہے تو ہاں ہاں نہیں ملتا

اس کے بعد ان صاحبوں کا شکریہ ہے جنھوں نے تقریظیں عنایت کیں۔ جوش صاحب، بہزاد صاحب اور شاہد احمد دہلوی صاحب۔ شاہد صاحب کو یوں لگتا ہے بڑے آغا صاحب نے پڑھا نہیں، صرف سنا ہے۔ ان کی جوابی تقریظ یوں لکھی ہے:

"شاہد صاحب لئے بے مثل دیکھتے ہیں۔ ترانہ بہت ہی عمدہ گاتے ہیں۔ کوئی جلسہ گانے بجانے کا ان سے خالی نہ جانا چاہیے۔ ایک بار تو انھوں نے میاں کی ملہار ایسی گائی کہ مجھ کو حیرت میں ڈال دیا۔ موسیقی کے حق میں نعمت ہیں۔"

انصاف کی بات یہ ہے کہ آغا صاحب کا کلام بہت عمدہ اور پرتاثیر ہے۔ شاعری ہی نہیں، مضامین بھی وراثت میں پائے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

دل مرا اب وہ کیا خریدیں گے ‌‌ مفت ہاتھ ان کے مال آ ہی گیا
ان کے کوچے کی بھیڑ سے پھر آج ‌‌ بچ کے میں بال بال آ ہی گیا
اونچی ہو جاتی تھی دیوارِ ارم جست سے قبل ‌‌ سخت حیرت ہے کہ شیطان یہ پھاندا کیسا [2]

2۔ ان اشعار کو مزاحیہ سمجھ کر نہ پڑھا جائے۔ اسے شوخیِ مضمون کہتے ہیں۔

مرے لختِ دل میرے خوں میں ملا کر — یہ تجویز میری غذا کیجیے گا
ہاتھوں کو رنگِ خونِ شہیداں جو بھا گیا — مہندی لگا لگا کے چھڑائی تمام رات
چڑھے ان کے تیور ہیں یا یہ گلے پر — دھری میرے ابرو کی دو آریاں ہیں

ممکن ہے کچھ لوگوں کو گمان ہو کہ ہم ان کے اچھے اچھے شعر چن چن کر دے رہے ہیں۔ یہ بات نہیں۔ بعض جگہ پوری پوری غزلوں میں انھوں نے دقیقہ سنجی کا حق ادا کیا ہے۔ کیسے کیسے مشکل قافیے کس آسانی اور خوبی سے بٹھائے ہیں:

سورگ سے میں جس دم نکا سا گیا ہوں — بہت اپنے جی میں اداسا گیا ہوں
جو کعبے گیا ہوں تو احرام باندھے — میں مسجد میں باندھے منڈاسا گیا ہوں
سنا ہے جو نانا بنارس گئے ہیں — تو میں پیچھے پیچھے نواسا گیا ہوں
میں ڈھولک لیے ساتھ قوال بن کر — عرس میں شراکت کو بانسا گیا ہوں
میں بن کر باورچی امیروں کے گھر میں — لگا کر رکابی میں خاصا گیا ہوں
میں ہر بار اپنے کو خود دفن کرنے — رکھے دوش پر اک گڑانسا گیا ہوں
جہاں سینکڑوں مجھ سے پہلے گڑے تھے — اسی قبر میں لا کے ٹھانسا گیا ہوں

اس رنگ میں پورے بائیس شعر ہیں۔ فیض احمد فیض میرے مخدوم ہیں، احمد ندیم قاسمی اور ناصر کاظمی وغیرہ میرے دوست ہیں، ان کی تخفیف یا تحقیر منظور نہیں، لیکن ذرا ان کو یہ زمین دے کے دیکھیے، اگر دو تین شعر سے زیادہ نکال جائیں۔

بس ایک اور غزل پر آغا صاحب کا کلام تمام کرتا ہوں۔ پوری کتاب پڑھنی ہو تو دو روپے خرچ کیجیے۔ (آغا صاحب کی تصویر بھی کتاب میں شامل ہے جس کی الگ قیمت نہیں لی جاتی۔)

بتا دوں کسے کہتے ہیں زندگانی — جوانی جوانی جوانی جوانی
بتا دوں ابھی تم کو کیا ہے بڑھاپا[3] — کہانی کہانی کہانی کہانی
بتا دوں ان آنکھوں پہ کیا ہے طلائی — کمانی کمانی کمانی کمانی
بتا دوں تمھیں ان کے وعدے ہیں کیسے — زبانی زبانی زبانی زبانی

3۔ بظاہر تو دھمکی معلوم ہوگی لیکن اصل میں بیان کا ایک پیرایہ ہے۔

Scanned with CamScanner

بتا دوں تمھیں ان کی کیا شے مرے پاس — نشانی نشانی نشانی نشانی
بتا دوں کہ ہے تیز تر کون سی ہے — پرانی پرانی پرانی پرانی
بتا دوں غریبوں کو کھلتی ہے کیا شے — گرانی گرانی گرانی گرانی [4]
بتا دوں وہ مذہب جو ہے سب سے بہتر — قرآنی قرآنی قرآنی قرآنی
بتا دوں ہے معشوقہ کی شکل کیسی — زنانی زنانی زنانی زنانی
بتا دوں طبیعت ہے آغا کی کیسی — دوانی دوانی دوانی دوانی

اس اسلوب کو پرانا نہ سمجھنا چاہیے۔ غالب اور میر کے دیوان چھان ماریے، اس کا سراغ نہ ملے گا۔ نہ معموں کے حلوں سے اسے تشبیہ دینا درست ہوگا۔ یہ جدید ترین پیرایہ ہے جو یورپ اور امریکہ کی درسگاہوں میں طالب علموں کی ذہانت اور لیاقت جانچنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ مثلاً:

سوال: سکندر اعظم نے مار مار کر پورس کا کیا نکال دیا تھا؟

جواب: بھرکس۔

سوال: امیر غریبوں کے پیٹ پر کیا مارتے ہیں؟

جواب: لات۔

سوال: چالاک لوگ دوسروں کو بیوقوف بنا کر اپنا کیا سیدھا کرتے ہیں؟

جواب: اُلّو۔

اس وضاحت کے بعد چند اشعار اور آغا صاحب کے سنتے جایئے۔ پھر ہم کہاں اور آغا صاحب کہاں:

بڑی مدتوں کے مرے دل کے ارماں — برآئے برآئے برآئے برآئے
سحر شام میں نے ہیں داغ اپنے دل کے — جلائے جلائے جلائے جلائے
نہ مانیں وہ لیکن رقیبوں کے ہیں تو — پڑھائے پڑھائے پڑھائے پڑھائے
چنے میں نے چاہت میں لوہے کے آغا — چبائے چبائے چبائے چبائے

❁❁

4- اس سے معلوم ہوگا کہ شاعرِ موصوف مسائلِ حاضرہ سے بے بہرہ نہیں۔

Scanned with CamScanner

ابنِ انشا

چاند کی بستی

وہ مجموعۂ کلام جو راتوں رات مشہور ہو گیا

چاند کی بستی

ایک تبصرہ

''میرا شجرۂ نسب شہنشاہِ رومان جہانگیر سے ملتا ہے'' — مصنف کا اعتراف

صنعتِ توارد کی حسین مثالوں سے مزین

مع سفارشات ڈاکٹر شوکت سبزواری، جناب شاہد احمد دہلوی، سلیم احمد صاحب

ہندوستان کا شہر سہارن پور گنّوں کے لیے بہت مشہور ہے، اور اس میں شک نہیں کہ وہاں کے گنّے نہایت خستہ ہوتے تھے؛ چھلکا اوپر کی پور سے جڑ تک ایک ہی بار میں نکل آتا تھا۔ لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہاں شاعر بھی مزے کے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ صبر سہارنپوری کا تعارف تو محمد حسن عسکری صاحب کرا چکے ہیں جو واصل الحرفین، واصل الشفتین، فوق النقاط وغیرہ صنعتوں میں شعر نکالتے تھے، یعنی ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے جن کے حروف باہم پیوست ہو جاتے ہیں، جیسے:

Scanned with CamScanner

تمنینیہمینشفیقسمجھا (تم نے نہ ہمیں شفیق سمجھا)

کبھی ایسے کہ سارے نقطے اوپر آئیں، یا پڑھتے ہوئے ہونٹ ملے ہی رہیں، وغیرہ وغیرہ۔ عسکری صاحب مضمون نہ لکھتے تو ایسے باکمال اب تک پردۂ گمنامی میں رہتے۔ داؤد چغتائی ایم اے بھی، جن کا مجموعۂ کلام چاند کی بستی اس وقت ہمارے سامنے ہے، اسی خطۂ نیشکر خیز کے ان فرزندوں میں سے ہیں جنھوں نے نالے کو پابندِ نے کیا ہے۔ اس کتاب نے راتوں رات شہرت حاصل کر لی۔ ڈاکٹر سبزواری صاحب نے تو تعارف میں لکھا ہے کہ ''یہ شاعر ادبی محفلوں اور اکھاڑوں سے الگ رہتے ہوئے بھی شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں صرف ذاتی کاوش اور خاموش جد وجہد کی وجہ سے بار پا گیا''، لیکن اتنا تو ہم نے بھی دیکھا کہ جن کھمبوں پر شام کو ہم ''سال بھر میں میٹرک پاس کرانے کی گارنٹی''، ''پوڈر دافعِ کھٹمل'' اور ''پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی'' کے اشتہار چھوڑ کر گئے تھے، اگلی صبح ان سب پر چاند کی بستی کے پوسٹر چھائے تھے۔ بہرحال، اب کتاب ہمارے سامنے ہے جس کی قیمت مع عکسی تصویر مصنف ساڑھے تین روپے ہے۔

جناب شاہد احمد دہلوی نے تقریظ رقم کی ہے، جس کا اقتباس گرد پوش کے حاشیے پر بھی ہے کہ ''اس شاعر کے ہاں موتی کی طرح سچے جذبات موجود ہیں جو عام طور پر دوسرے شعرا کے ہاں نظر نہیں آتے۔'' مخدومنا ڈاکٹر شوکت سبزواری انھیں بقائے دوام کے دربار میں کرسی دلا ہی چکے۔ ان کی زبان کی تعریف میں لکھتے ہیں، ''داؤد چغتائی کی زبان اس کے خیالوں کی طرح چاند کی مانند دمکتی ہے۔ وہ اہلِ زبان ہے۔'' ہمارے محب و مشفق سلیم احمد نے، جن کی شاعری اور تنقید دونوں کی آج کل دھوم ہے، اس کتاب کا تبصرہ لکھا ہے جو ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے، ''برادرم داؤد بیگ تشریف لائے تو میرٹھ کی خوشبو اپنے ساتھ لائے۔ چودہ پندرہ برس کا زمانہ آنکھوں میں گھوم گیا۔'' ہاں یہ بتانا تو ہم بھول گئے کہ یہ ذرہ، اور ذروں کی طرح، میرٹھ ہی میں آ کر آفتاب بنا۔ (کاریگروں کی پاکستان کو ہجرت کے بعد وہاں آفتاب بنانے کی صنعت باقی رہی یا اکھڑ گئی، واللہ اعلم۔)

کتاب عموماً اپنے انتساب سے پہچانی جاتی ہے۔ اس کتاب کے کھلتے ہی ہم دیکھتے ہیں:

انتساب

میں اپنی ناچیز کاوش کو
تین محبوب ہستیوں کے نام معنون کرتا ہوں
ایک وہ معصوم ہستی جسے میری محبت یاد نہیں اور
جس نے مجھے شعر کہنے پر مجبور کیا
دوسری وہ سنگدل ہستی جس نے محبت اور شاعری
دونوں سے باز رکھنے کی حسین کوشش کی
تیسری وہ دلربا ہستی جس کے نزدیک محبت گناہ ہے اور
جو نفرت و محبت کا سرچشمہ ہے

مصنف کی عرضِ حال سے رومانیت کا تاثر کچھ اور چوکھا ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں، ''میرا خاندانی سلسلہ شاہانِ مغلیہ میں شہنشاہِ رومان جہانگیر سے جا کر ملتا ہے مگر میں اپنی طبیعت میں شہنشاہ محبت شاہجہاں کا رنگ زیادہ کارفرما دیکھتا ہوں۔'' چشمِ ماروشن دلِ ماشاد۔ رنگِ کلام سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ مثلاً:

یہ جوانی شراب ہے ساقی — اس کا پینا ثواب ہے ساقی
کیا گنہ ہے اگر پیے جاؤں — تجھ پہ کیف و شباب ہے ساقی

مبادا لوگوں کو شبہ ہو کہ ان کی تربیت ایسے ویسے ماحول میں ہوئی ہے جس کی وجہ سے اس قسم کے مضامین باندھتے ہیں۔ داؤد صاحب نے وضاحت کر دی ہے، ''خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جس گھرانے میں میں نے آنکھ کھولی اور اپنا سہانا بچپن گزارا وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے۔'' یعنی:

وہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

پہلے حصے کا سرنامہ ہے ''ماہ و اختر۔'' اس میں ردیف وار غزلیں ہیں۔ دوسرا حصہ ''رقصِ ناہید (نظمیات)'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس حصے کی نظموں کے عنوانات منجملہ یہ ہیں: ''چاند سے خطاب''، ''اپنی سلطانہ سے خطاب''، وغیرہ۔

داؤد چغتائی صاحب کو بجا طور پر اس کتاب میں ''تاجدارِ سخن'' لکھا گیا ہے۔ ان کا کلام صنائع و بدائع سے مالا مال ہے، لیکن جس صنعت کو انھوں نے سب سے کثرت اور تواتر سے

Scanned with CamScanner

استعمال کیا ہے وہ صنعتِ توارد ہے۔ یہ لفظی بھی ہوتی ہے اور معنوی بھی۔ تعریف اس کی یہ ہے کہ کاوش کر کے ایسا مضمون لایا جائے اور ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو اس سے پہلے دوسرے شعرا کے ہاں آ چکے ہوں۔ مشق سے اس صنعت میں یہاں تک کمال پیدا کیا جاسکتا ہے کہ دوسروں کے اشعار اور اپنے اشعار میں سرمو تفاوت نہ ہو۔ غزل میں تخلص کی مجبوری ہوتی ہے، اس سے قطع نظر، حسنِ توارد کی بعض مثالوں میں ہم نے پوری پوری غزل میں نقطے اور شوشے تک کا فرق نہیں پایا۔ داؤد چغتائی صاحب ابھی ان باکمالوں کی ہمسری کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے، بسیار زماں باشد تا پختہ شود خامے؛ لیکن ہونہار بروا ہیں، تھوڑے سے ریاض سے یہ بات پیدا کر سکتے ہیں۔ مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ سیف الدین سیف کی ایک مشہور نظم ہے جس کا ٹیپ کا مصرع ہے: ''جب ترے شہر سے گزرتا ہوں۔'' کسی فلم میں بھی آئی ہے اور بہت مقبول ہوئی ہے۔ داؤد چغتائی صاحب کی نظم ''گزر'' میں بھی یہی بات ہے اور اس کا ٹیپ کا مصرع ہے: ''تیرے کوچے سے جب گزرتا ہوں۔'' اسی طرح ساحر کا ایک گیت مدتوں پہلے چھپ کر اور فلم میں آ کر مقبول ہو چکا ہے:

میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا

داؤد چغتائی صاحب اس کے قریب قریب پہنچ گئے ہیں:

میں نے زلفوں کی گھٹاؤں کی تمنا کی تھی
ہائے افسردہ جوانی کے سوا کچھ نہ ملا

ایک اور شاعر کی کتاب کے تو نام تک سے توارد ہوا ہے۔ یعنی وہ چاند نگر تھی، یہ چاند کی بستی ہے۔ چاند نگر میں ایک نظم ہے: ''انشا نے پھر عشق کیا۔'' یہ اس سے داؤد چغتائی صاحب نے حیرت انگیز مماثلت پیدا کی ہے:

چاند نگر مطبوعہ 1955	چاند کی بستی مطبوعہ 1963
تا شام نہ ان کوچوں میں گھومیں گے پریشاں	شاموں کو ترے کوچے میں آیا نہ کروں گا
تا صبح شبِ ماہ میں جاگا نہ کریں گے	راتوں کو ترے خواب بھی دیکھا نہ کروں گا

لوگوں سے چھپالیں گے جو احوال ہے جی کا
اپنے سے کسی بات میں دھوکا نہ کریں گے
لکھیں گے کسی اور ہی عنوان کی نظمیں
غزلوں میں بھی اس بات کا چرچا نہ کریں گے
ممکن ہو تو اک چشم عنایت کریں ان پر
یہ اور کسی شے کا تقاضا نہ کریں گے
در سے نہ اٹھائیں وہ ضمانت پہ ہماری
رسوا ہیں مگر آپ کو رسوا نہ کریں گے
اتنا ہے کہ چھوڑیں گے یہ دیوانوں کی صورت
ہم کل سے سر راہ بھی بیٹھا نہ کریں گے

لوگوں سے چھپالوں گا میں احوال محبت
کھل جائے ترا راز میں ایسا نہ کروں گا
نظموں میں ترے حسن کا چرچا نہ کروں گا
غزلوں میں ترا جور ہویدا نہ کروں گا
دو لفظ محبت کے بہ یک چشم عنایت
میں اور کسی شے کا تقاضا نہ کروں گا
دیوانہ ہوں تیرا یونہی خاموش رہوں گا
رسوا ہوا لیکن تجھے رسوا نہ کروں گا
وعدہ ہے سر شام بھی بیٹھوں گا نہ ہرگز
میں نقش قدم پہ ترے سجدہ نہ کروں گا

لیکن اس مجموعے کو دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی ہمیں اس بات کی ہوئی کہ سلیم احمد صاحب، جن کی نظر میں حالی تا فیض اردو کا کوئی شاعر نہیں بچتا اور جو آدھے پونے آدمی کے چکر میں گرفتار رہتے ہیں، داؤد صاحب سے مطمئن ہیں اور کئی صفحات میں ان کے اخلاصِ جذبات، نفاستِ طبع، تنوعِ تجربات کی تعریف پھیلائی ہے اور لکھا ہے: ''یہ ایک سچے شاعر کے نمود کے آثار ہیں۔'' ان کے فن اور حسنِ بیان، فنی شعور وغیرہ کو سراہا ہے اور اپنے دعووں کی مثالوں میں منجملہ حسبِ ذیل اشعار نقل کیے ہیں:

جنوں کا تاج پہنوں گا، سخن کا تاجور ہوں گا
مجھے بچپن ہی میں کیوں بادشہ کہتے ہیں گھر والے

یارب ترے کرم سے ہے داؤد بادشہ
سلطانہ خیال نے سمجھا ہے کیا مجھے

ہائے گستاخیاں محبت کی
ان کی تصویر ہی کو پیار کیا

مرے خیال پہ چھائی ہے ایک سلطانہ
نقاب اٹھاؤں تو کھل جائے گا کسی کا بھرم

اور کچھ ہو نہ ہو، ہم میرٹھ کی خوشبو کے قائل ہو گئے جس نے سلیم احمد کو کیا مارا، نفسِ امارہ کو مارا۔

قارئین یہ سن کر خوش ہوں گے کہ داؤد چغتائی صاحب کی کچھ اور کتابیں زیرِ طبع ہیں جن کے اشتہار بدیں الفاظ شاملِ کتاب ہیں:

تاجدارِ سخن حضرت داؤد چغتائی

کی

نادر تصنیفات وتالیفات

زبورِ نعت (نعتیہ کلام)

آزادی کے پروانے (تاریخ)

اس میں انھوں نے آزادی کے نامور مشاہیر کے جذبۂ حب الوطنی اور ان کی بے لوث قربانی کو 'بے نقاب' کیا ہے۔

حادثے (افسانے)

''ناگن زلفوں، جمیل چہروں، عقیل ذہنوں، حسین جسموں، شباب کی انگڑائیوں، بہار کی رعنائیوں، خزاں کی بربادیوں، آشیانے کی تباہی اور قفس کی اسیری سے وابستہ حادثے نئے اور اچھوتے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔'' ان کے علاوہ

تخلیقی کارنامہ منفرد شعرا (تنقید)

فقید المثال شاہکار ناموران تعلیم (تعلیم)

ہم بڑی بیتابی سے ان نادر تخلیقات کا انتظار کر رہے ہیں۔

❁❁

ابنِ انشا

سات گھنٹے مولانا مودودی کے ساتھ

راقم الحروف دینیات کا عالم ہونے کا چنداں مدعی نہیں۔ یہ وہ ملک ہے جہاں حضرت شاہ ولی اللہ، حکیم الامت علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام سی ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ان کی خاکِ پا ہونے کا دعوئ کرنا بھی بڑی جسارت ہے۔ جو لوگ اپنے علم پر غرور کرتے ہیں اور اپنا آپ ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، عموماً دیکھا گیا ہے کہ فی الاصل سطحی علم کے مالک ہوتے ہیں۔ جن کو خداوند تعالیٰ نے صحیح معنوں میں علم اور اپنے دین کا ادراک ودیعت کیا ہے ان کو انکسار کی دولت بھی دی ہے۔ حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس ہیچ مقدار نے کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی، اور نفسِ امارہ کی تحریص وترغیب کے باوجود، انکسار، عاجزی اور فروتنی کا دامن نہیں چھوڑا۔ کیونکہ ذہنِ رسا، بصیرت اور علمی تجر سب محض خدا کی دین ہیں؛ انسان ضعیف البنیان کا ان پر غرور اور تبختر کی دیوار کھڑی کرنا کسی طرح روا نہیں۔ راقم ہمیشہ سے اپنے کو طالب علم سمجھتا رہا ہے اور سمجھتا رہے گا۔ حضرت امام غزالی اور امام ابن تیمیہ کے ملفوظات سے پتا چلتا ہے کہ ان کا بھی یہی مسلک تھا۔ وہ بھی اپنے کو ہمیشہ طالب علم سمجھتے رہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی عہدِ حاضر کی سربرآوردہ ترین ہستیوں میں سے ہیں۔ جن لوگوں کا راستہ سیاست میں ان سے جدا ہے وہ بھی ان کے علمی مرتبے اور دینی بزرگی کو ضرور تسلیم کرتے

Scanned with CamScanner

ہیں۔راقم کو ایک عرصے سے ان کے نیاز حاصل کرنے کا اشتیاق تھا لیکن اس کے لیے قدرت نے 6 مئی 1959 کا دن مقرر کر رکھا تھا۔مولانا بہت مصروف آدمی ہیں، پھر ان کے حلقۂ خصوصی کے لوگ ان کو گھیرے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ مولانا لیے دیے رہتے ہیں اور ان میں غرور کی حد تک اپنی عظمت کا احساس ہے۔مجھے مسلسل سات گھنٹے ان کا قرب نصیب نہ ہوتا تو شاید میری بھی یہی رائے رہتی۔لیکن جو شخص بہ ایں بزرگی اٹھ کر آپ کے لیے خود دروازہ کھولے، بات چیت میں تقدیم کرے اور لاکھوں عقیدت مندوں کا محترم ومخدوم ہوتے ہوئے بھی اپنی رائے کو آپ پر مسلط نہ کرے، اس کے متعلق ایسا خیال کرنا کتنا ظلم ہے۔میرے اس مضمون سے یہ غلط فہمیاں رفع ہو جائیں تو بڑی مبارک بات ہوگی۔

مئی کے پہلے ہفتے میں مجھے ایک کام سے حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔وہاں تین چار دن سخت مصروفیت میں گزرے۔ایک مشاعرہ تھا، وہ بھی سنا۔پانچ تاریخ کو دوپہر کے کھانے پر اپنے دوست زمان صاحب کے ہاں بیٹھا تھا کہ رحیم یار خاں جانے کا پروگرام بن گیا۔مجھے کراچی واپسی کی جلدی تھی لیکن زمان صاحب مصر تھے، حتیٰ کہ آدمی بھیج کر انھوں نے گاڑی میں میری سیٹ بھی ریزرو کرا دی۔لطف کی بات یہ ہے کہ ان کا آدمی جو اسٹیشن سے واپس آیا تو یہ خبر لایا کہ ہم دونوں کی نشستیں الگ الگ گاڑیوں میں مخصوص ہوئی ہیں۔ان کو کوئی بارہ بجے رات کے روانہ ہونا تھا اور مجھے پون بجے خیبر میل سے۔ہم نے کہا، خیر ٹھیک ہے۔دوسری خبر وہ یہ لایا کہ محکمۂ موسمیات والوں کی اطلاع کے بموجب آج حیدرآباد میں زبردست طوفانِ باد (ٹائیفون) آنے والا ہے جس کی رفتار نوے میل فی گھنٹہ ہے۔اس سے چند روز پہلے ملتان میں طوفان آچکا تھا، کوئی پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے، جس سے بہت سے مکانات ڈھے گئے تھے، چھتیں اڑ گئی تھیں اور خاصا جانی نقصان بھی ہوا تھا۔لہٰذا یہ خبر خاصی تشویش کا باعث تھی۔ان کے عزیزوں میں سے ایک ہوائی کمپنی کے انجینئر بھی ہمارے شریکِ طعام تھے۔ان کی گفتگو سے ہراس اور پھیلا۔انھوں نے بتایا کہ حیدرآباد کے یہ مکانات اس رفتار کے ٹائیفون کا دھکا برداشت نہیں کر سکتے۔اس برِعظیم میں، حتیٰ کہ باہر بھی، باستثنائے جاپان جہاں ہزاروں جانیں ضائع ہوتی ہیں، اتنی شدت کا طوفانِ باد اس سے قبل شاید ہی آیا ہو۔زمان صاحب

نے کمشنر صاحب کے بنگلے پر فون کیا جس سے اس خبر کی توثیق ہوئی۔ یہ بھی پتا چلا کہ حکام پولیس اور ریڈیو والوں کو خبردار کیا جارہا ہے تاکہ لوگوں کو مطلع کردیں اور ہنگامی حالات کے لیے تیار رہیں۔

وقت گیارہ بجے رات سے ایک بجے تک کا بتایا گیا۔ وہی وقت ہمارے گاڑی پر جانے کا تھا۔ انجینئر صاحب نے بتایا کہ ایسے میں گاڑیاں کھڑی کردی جاتی ہیں ورنہ ان کے الٹ جانے کا خدشہ رہتا ہے؛ خدشہ ساکن صورت میں بھی ہے لیکن کم۔ میں نے زمان صاحب سے کہا کہ "ٹکٹ منسوخ کرادیجیے، ایسے میں سفر مناسب نہیں۔" لیکن ان کو جہد آزمائی کا شوق ہے، کہنے لگے: "اجی دیکھا جائے گا۔"

شام کو حیدرآباد ریڈیو سے اعلان ہونے پر خبر سارے شہر میں گردش کرگئی اور ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ میں ایک دوست کے ہاں مشاعرے اور کھانے پر مدعو تھا۔ آٹھ بجے ہم وہاں پہنچ گئے۔ ان کا ریڈیو اور فون اتفاق سے دونوں خراب تھے، اس لیے وہ بے خبر بیٹھے تھے۔ اتفاق سے مہمانوں میں سے بھی کسی کو اس امر کی اطلاع نہ تھی۔ میں نے ذکر کیا تو سب کو اپنی اپنی فکر ہوئی۔ اتنے میں ایک صاحب آئے جنھوں نے ریڈیو پر اعلان سنا تھا۔ ان کی تصدیق پر سب پر تولنے لگے۔ مصیبت کا ہنگام تھا لیکن شعر پڑھنا بھی ضرور تھا۔ بہرحال، کسی نے پانچ بیت پڑھ کے سلام کیا، کسی نے ڈھائی پر اکتفا کی اور کہا: "آگے یاد نہیں۔" کوئی یہ کہہ کے بالکل ہی گول ہوگیا کہ "صاحب، میں کیا اور میرے شعر کیا!" قصہ مختصر یہ کہ لوگ آئے تو تھے بیاضوں سے لیس، آدھی رات تک کا زادِ سفر لے کر، لیکن آدھے گھنٹے میں مطلع صاف تھا۔ صاحبِ خانہ بوکھلاہٹ میں یہ بھی بھول گئے کہ ہمیں ان کے ہاں ماحضر تناول کرنا ہے۔ ہمارے توجہ دلانے کو انھوں نے مذاق پر محمول کیا۔ جب وہ سمجھ گئے کہ یہ لوگ (میرے ساتھ طفیل احمد جمالی اور شان الحق حقی بھی تھے) یوں نہیں جائیں گے تو نوکر کو دہی لینے بھیجا۔ وہ خبر لایا کہ سب دکانیں بند ہیں۔ اس پر خفا ہوتے ہوئے خود گئے تو خاصی دیر میں پلٹے۔ انھوں نے بتایا کہ "ہر طرف ہُو کا عالم ہے، سارا بازار بند ہے۔ ایک پنواڑی کی دُکنیا کھلی تھی۔ اس نے کہا، 'اجی کیسا کھانا اور کہاں کا دہی! توبہ استغفار کا وقت ہے، جا کے بیوی بچوں کی فکر کیجیے۔' گیارہ بجنے کو ہیں، طوفان آیا ہی چاہتا ہے۔ زندگی ہے تو کل ملاقات ہوگی ورنہ کہا سنا معاف۔"

آپ کہیں گے، مولانا مودودی کا ٹائیفون کے تذکرے سے کیا تعلق؟ لیکن میں حرفِ مطلب پر آیا ہی چاہتا ہوں۔ لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم۔ آج کل کی انشا پردازی کا یہی انداز ہے۔ خیر، ان صاحب کے ہاں سے کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے اٹھ کر قیام گاہ کی طرف چلے۔ راستے میں کوئی آدم نہ آدم زاد۔ ایک تانگے والے کو پکارا، لیکن وہ بھی غالباً عقبیٰ کے خیال میں محو تھا۔ ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور ''یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے، افسوس ہم نہ ہوں گے'' کا الاپ کرتا یہ جا وہ جا۔ مشیتِ ایزدی سے کون لڑسکتا ہے! کلمۂ شہادت پڑھتے، چپ راست کرتے، پیدل ہی روانہ ہوے۔ اپنی تعریف کے طور پر نہیں، امرِ واقعہ کے طور پر بیان کرنا ضروری ہے کہ ہر چند موت سر پر کھڑی تھی، ہم تینوں دوستوں نے حوصلے نہیں چھوڑے، نہ راستے میں کسی کو غش آیا۔ میرے میزبان میر غلام حسن تہجد پڑھ رہے تھے۔ اسی رات شروع کی تھی؛ معلوم نہیں اب پڑھتے ہیں کہ نہیں۔ نیت توڑ کر دروازہ کھولا۔ ہم نے اپنا بستر سمیٹا، نم آلود آنکھوں سے میر صاحب سے بغلگیر ہوے اور سوٹ کیس بغل میں داب، اسٹیشن کی راہ لی۔ ایک خدا ترس تانگے والا مل گیا جس نے منھ مانگے دام لے کر اسٹیشن پہنچا دیا۔ مجھے اس کا یہ احسان عمر بھر یاد رہے گا، ورنہ سیاہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے۔

اس موقعے پر اس افسوسناک حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ وہ ٹائیفون جس کا اتنے اشتیاق سے انتظار کیا گیا تھا، نہیں آیا۔ دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی آ گیا ہوتا تو ہم تھوڑے کو بہت سمجھ لیتے۔ اسٹیشن پر چائے پی۔ اتنے میں خیبر میل آ گئی۔ سیکنڈ کلاس کا ڈبہ سامنے ہی تھا۔ ریزرویشن سلپ دیکھی تو سب سے نیچے میرا نام تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ صدائے برنخاست۔ پھر کھٹکھٹایا۔ پھر صدائے برنخاست۔ گارڈ سے کہا۔ اس نے ذرا زور کا ٹھوکا دیا۔ اندر بتی جلی۔ ایک بھاری بھرکم بزرگ نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ نورانی چہرہ، اس پر نورانی عینک۔ (اس مضمون کے قارئین نے قیاس کر لیا ہوگا کہ یہی مولانا مودودی تھے۔ عنوان دیکھنے کے بعد یہ معلوم کرنے کے لیے کسی غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں۔ چونکہ میں نے اس وقت تک یہ مضمون نہ پڑھا تھا نہ لکھا تھا، اس لیے مجھے ان کو پہچاننے میں دقت ہوئی، بلکہ سچ یہ ہے کہ بالکل نہ پہچانا۔)

Scanned with CamScanner

ڈبے میں ایک ہی خالی برتھ تھی، اوپر کی۔ میں نے اپنی ذہانت سے اندازہ لگایا کہ یہی میری ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اس پر اپنا سوٹ کیس رکھا۔ دوستوں کو الوداع کہی، گارڈ کو اشارہ کیا کہ گاڑی چلائیے، میری طرف سے اجازت ہے۔ یاد رہے، اس وقت رات کا کوئی ایک بجا تھا۔

اب عالم یہ ہے کہ وہ بزرگ نیچے اپنی برتھ پر بیٹھے ہیں۔ بتی جل رہی ہے۔ میرے پاس بستر نام کی کوئی چیز نہ تھی اور سیٹ دھول میں اٹی ہوئی تھی۔ ٹنڈو جام سے میں نے گیروے رنگ کا اٹھارہ گز کپڑا خریدا تھا۔ پچھلے دنوں چند در چند وجوہ سے علائق دنیا ترک کردینے کا ارادہ ہوگیا تھا۔ یہ گیروا کپڑا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ پرنسپل گل محمد شیخ نے لے کر دیا تھا۔ قباحت یہ تھی کہ عرض اس کا صرف بارہ گرہ تھا، یعنی پون گز۔ اٹھارہ گز طول کے ساتھ یہ کسی دیو کی لنگوٹی معلوم ہوتی تھی۔ اس کو بچھانے کی کوشش کی لیکن کوئی بیونت ٹھیک ہی نہ بیٹھتی تھی۔ لیٹے تو اندر کفن کے سر تھا تو باہر کفن کے پاؤں۔ پھر اٹھے، پھر درست کیا، پھر لیٹ گئے۔ وہ بزرگ اپنے دھیان میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامان کا جائزہ لیا۔ ایک طرف ناشتہ دان تھا، ایک طرف صراحی۔ ململ کا کرتا، سر پر کھچڑی پٹے۔ کوئی پنشن خوار، صاحب حیثیت بڑے میاں معلوم ہوتے تھے۔ دل ہی دل میں یہ سمجھ لیا کہ کسی بڑے افسر کے اباجی ہیں۔ خیر، ہم نے ریلوے ٹائم ٹیبل کا مطالعہ شروع کر دیا۔ سفر میں سوائے اس کے کوئی لٹریچر اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہیے۔ خانپور سے چاچڑاں جانے والی ریلوں کے اوقات دیکھنے شروع کیے۔ اس لیے نہیں کہ اس لائن پر سفر کرنا تھا، یونہی معلومات میں اضافے کے لیے۔ ان بزرگوار نے ہم سے کہا، ''آپ کہیں تو لائٹ بجھادوں؟'' ذرا تہذیب و شائستگی دیکھیے! مجھ ایسے ہیچ میرز سے درخواست کا یہ لہجہ! میں نے کہا: ''جی ہاں، شوق سے بجھادیجیے۔ لیکن ذرا ٹھہریے، میں دو صفحے ٹائم ٹیبل کے اور پڑھ لوں۔ عادت کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ مطالعے کے بغیر نیند ہی نہیں آتی۔''

خیر، ان کی تکلیف کے خیال سے ڈیڑھ صفحہ اور پڑھ کر میں نے ٹائم ٹیبل بند کیا اور انھوں نے لائٹ بجھادی۔ وہ سوگئے اور میں بھی اس گیروے جامے میں دبک کر رہ گیا۔

یکا یک ذہن میں ایک بلب سا جلا اور مجھے خیال آیا کہ ان بزرگ کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟ کون ہوسکتے ہیں؟ سلسلہ خیال جہانگیر پارک تک پہنچا۔ ارے، یہ تو مولانا مودودی ہیں! چند سال پہلے ان کے ایک جلسے میں شرکت کی تھی۔ ان کو دیکھنے کا شوق کشاں کشاں لے گیا تھا۔

Scanned with CamScanner

جا بجا کپڑے کے پھریرے لٹک رہے تھے جن پر ''اسلامی آئین زندہ باد''، ''لے کے رہیں گے اسلامی آئین'' وغیرہ نعرے لکھے تھے۔ کراچی میں شاید ان کی یہ پہلی تقریر تھی۔ مشتاقین انھیں دیکھنا چاہتے تھے اور یہ پھریرے اڑاڑ کر ان کے اور حاضرین کے درمیان حائل ہو رہے تھے۔ آخر مولانا نے رضا کاروں کو حکم دیا کہ ان کو اتار دو۔ چنانچہ وہ اتار دیے گئے۔ اسی سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ مولانا پردے کے چنداں سختی سے قائل نہیں، حالانکہ مشہور یہی ہے۔

یاروں کو تجھ سے حالیؔ کیا بدگمانیاں ہیں

میں نے مولانا کی برتھ کی طرف غور سے دیکھا لیکن لائٹ بند ہونے کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا۔ ایک نورانی ہالہ سا البتہ تھا جو یا تو ان کے تقدس کا نور تھا یا کھڑکی سے باہر کی روشنی چھن چھن کے آرہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے جہانگیر پارک کے کچھ سین گھوم گئے۔ ایک بار وہاں ایک متدین وزیر اعظم کو جلسے سے خطاب کرنا تھا۔ اُن دنوں قومی بے حسی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنے محبوب رہنما کی تقریر سننے کے بجائے جوق در جوق فلم ماہی منڈا دیکھنے چلے گئے تھے جو اسی روز بیک وقت چار سنیماؤں میں ریلیز ہوئی تھی۔ کچھ باہمت پولیس والوں نے ماس کنٹیکٹ کے گر استعمال کر کے کچھ حاضرین بہ خرابیِ بصرہ فراہم کیے۔ ان کا بھی یہ عالم تھا کہ بکھرے جا رہے تھے۔ پارک کے چاروں طرف لٹھ بند سپاہیوں کا زبردست پہرہ تھا؛ باہر کے لوگوں کو روکنے کے لیے نہیں، اندر کے لوگوں کے روکنے کے لیے۔ **امروز** کے 'بت شکن' نے سرخی لگائی کہ ''وزیر اعظم نے کل شام سی آئی ڈی کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا۔'' اس وقت یہ بھولے بسرے زمانے کی سب پرانی باتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ پھر خاکساروں کے ایک جلسے کا منظر سامنے آیا۔ علامہ مشرقی دروازے سے داخل ہوئے تو خاکساروں نے تن کر زناٹے سے بیلچہ بدست سلامی دی۔ اٹن شن ہوتے ہوئے جو بیلچے زمین پر کھٹ سے ٹیکے تو ایک رضا کار کا بیلچہ بجائے زمین کے اپنے ہی پاؤں پر پڑ گیا۔ جھٹ ''اوئی میں مر گیا'' کہہ کے وہ بیٹھ گیا۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک لکڑی کا گھوڑا اڑا جا رہا ہے اور اس کی پیٹھ پر میں بیٹھا ہوں۔ میرے آگے ملکہ مہر نگار بیٹھی ہے اور نیچے زمین پر ایک سمندری جہاز چلا جا رہا ہے جس پر ایک بہت بڑا انڈا رکھا ہے۔ یکا یک انڈا پھوٹا اور اس میں سے ایک ریل گاڑی چھکا چھک چھکا چھک کرتی آسمان کی طرف چڑھنے لگی جس کے ساتھ بے شمار لال، پیلے، نیلے غبارے سے

بند ھے تھے۔ وہ لکڑی کا گھوڑا بھی ایک غبارہ بن گیا اور ملکہ مہر نگار بھی۔ اور پھر سب گھومنے لگے، تیز تیز چکر کاٹنے لگے۔

اس آخری منظر کے متعلق میرا خیال ہے کہ عالم خواب سے تعلق رکھتا تھا۔ غالباً میری آنکھ جھپک گئی ہوگی۔

کھٹ کھٹ کی آواز پر میں نے منھ سے کپڑا ہٹایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اجالا ہو رہا ہے۔ گھڑی سات بجا رہی تھی۔ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ بیرے چائے کی آوازیں لگا رہے تھے۔ حضرت مولانا اپنے بستر پر بیٹھے باہر دیکھ رہے تھے۔ ان کے ساتھی منکے برابر لوٹا لیے باتھ روم جا رہے تھے۔ میں نے نیچے اتر کر سب سے پہلے ریزرویشن سلپ دیکھی۔ واقعی سب سے اوپر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی لکھا تھا۔ میں نے ان کی سب کتابیں تو نہیں پڑھیں، بہت سال پہلے ہائی اسکول میں تنقیحات یا تفہیمات نام کی ایک کتاب دیکھی تھی، اور اس کا بھی پہلا ورق پڑھا تھا، لیکن اس پہلے ورق ہی سے میں اتنا متاثر ہوا کہ ان کی عظمت کا نقش میرے دل پر ثبت ہوگیا۔ اور اب مولانا میرے سامنے تھے، اتنے قریب۔ میں پھر اچک کر اپنی سیٹ پر جا چڑھا اور سامان سمیٹنے لگا، کیونکہ اس سے اگلا اسٹیشن رحیم یار خاں تھا۔ اتنے میں کچھ لوگ، مولوی صورت، پلیٹ فارم پر نظر آئے۔ ڈبے میں داخل ہو کر انھوں نے مولانا سے مصافحہ کیا اور بڑے ادب سے ایک طرف بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر کی رسمی باتیں ہونے لگیں اور گاڑی چل دی۔

رحیم یار خاں کے اسٹیشن پر میں کوئی آٹھ سوا آٹھ بجے اترا۔ حضرت مولانا کی شخصیت کا رعب کچھ ایسا تھا کہ اترتے ہوئے معمولی سلام علیک بھی نہ کہہ سکا۔ تاہم میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ سات گھنٹے جو ان کی معیت میں گزرے، میری زندگی کا ایک بڑا سرمایہ ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ اس مدت میں ان سے جس قدر فیض میں حاصل کر سکتا تھا، نہ کر سکا، اور ان سے میرا جو تبادلہ خیالات ہوا اس کا بھی علم دین سے کچھ ایسا تعلق نہیں۔ انھوں نے فرمایا، ''لائٹ بجھا دوں؟'' میں نے عرض کیا، ''بجھا دیجیے۔'' لیکن قطرے میں دجلہ دیکھنے والی طبیعتیں سمجھ سکتی ہیں کہ ہم دونوں ان دو فقروں میں کتنا کچھ کہہ گئے۔ عالم استغراق میں ایک لفظ بھی کسی کی زبان سے نکلتا ہے تو اس میں معرفت کا دریا بند ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

میں پھر عرض کروں گا کہ مجھ سے ذرۂ بے مقدار کے لیے یہ کافی فخر کا سامان ہے کہ اسے حضرت مولانا کے ساتھ دن رات اٹھنے بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ رات میں تو ہم حیدر آباد سے چلے ہی تھے، صبح آٹھ بجے کا وقت خاصا دن ہوتا ہے، اور اٹھنے بیٹھنے کی بات میں نے اجمال کے بجائے تفصیل سے کہہ دی۔ مجھے معلوم ہے کہ مولانا کے عقیدت مند، جو دس پانچ منٹ بھی مولانا کی صحبت میں گزارنے کے آرزومند ہیں، میری خوش قسمتی کو رشک کی نظروں سے دیکھیں گے، لیکن یہ خدا ساز موقع تھا، میری اس میں کوئی خوبی نہیں۔

❊❊

Scanned with CamScanner

ابنِ انشا

بیمار کا حال اچھا ہے

اسپتال میں جن صاحب سے سب سے پہلے ہماری علیک سلیک ہوئی، سامنے کے بستر کے بڑے میاں تھے — مسٹر لوئیس۔ اسپتال میں آدمی اس طرح ایک دوسرے سے اس کا مرض پوچھتا ہے جس طرح اسپتال سے باہر خیریت دریافت کرتا ہے۔ وہاں یہ کہ راضی باضی، بھلو چنگو، مزاج شریف؟ یہاں یہ کہ مرضِ مبارک کیا ہے؟ ماشاءاللہ... بیماری کون سی ہے؟ اللّٰھم زد فزد... روایت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کی جائے۔ باتوں باتوں میں مخاطب پر واضح کیا جائے کہ تیرا مرض تو کچھ بھی نہیں، جانے کیسے اسپتال میں آ گیا، سفارشی ہوگا۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ ایک صاحب کہتے ہیں، ''مجھے دمہ ہے۔ کھانستا ہوں تو لگتا ہے ابھی دم نکل جائے گا۔'' دوسرے صاحب کہتے ہیں، ''دمہ بھی کوئی چیز ہے؟ مجھے دیکھو، میرے دونوں پھیپھڑے نکالے جا چکے۔ مصنوعی نالیوں سے سانس لیتا ہوں۔ اصل مرض تو گٹھیا ہے، اور میرا گٹھیا تو بہت اعلیٰ نسل کا نقرس ہے، قریب قریب لاعلاج۔ فلاں فلاں مشاہیر کا انتقال اسی میں ہوا۔'' اس پر تیسرے مریض سے نہیں رہا جاتا، فرماتے ہیں، ''ہاں، گٹھیا بھی نامراد مرض ہے، لیکن پھر ایسا بھی نہیں۔ مجھے تو بچپن سے ہے۔ مرضوں میں مرض ہے بھگندر۔ یہ دیکھو، پورے گھٹنے پر پھیل گیا ہے۔'' چوتھا مریض بڑی دیر سے بٹ بٹ دیکھ رہا ہے کہ میری باری ہی نہیں آ پاتی۔ آخر دل پر دو ہتڑ مار کر ایک طرف کو لنک جاتا ہے کہ خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔ فوراً بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ اہلکار دفتر کی طرف بھاگتے ہیں کہ رجسٹر

Scanned with CamScanner

دیکھیں، اس کے ذمے اسپتال کی رقم تو نہیں، معقول زرضمانت رکھوالیا تھا نا؟ یہ ڈوب گیا تو اس کی جگہ دوسرا آ جائے گا، اسپتال کے پیسے نہ ڈوبنے چاہییں۔ اگر پیسے نکلتے ہوں تو بڑے جذبے سے دل کی مالش شروع کر دیتے ہیں۔ ایک غنچہ دہن تو مصنوعی تنفس دینے کے لیے مریض کے لبوں پر لب بھی رکھ دیتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر مچلا پڑا رہتا ہے، پھر کلمہ پڑھتا ہوا اٹھ بیٹھتا ہے۔ وہ کون سا مر گیا تھا، اور اس قسم کے علاج سے تو سنا ہے سچ مچ کے تنِ مردہ میں بھی جان پڑ جاتی ہے۔ ہمارے ایک دوست جو اسپتال میں رہے ہیں، رات میں کئی کئی بار مصنوعی تنفس لیا کرتے تھے، بلکہ ایسے ماہر ہوئے کہ خود نرسوں کو دیا کرتے تھے۔ بتاتے ہیں، اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ اب تک ہونٹ چاٹتے ہیں (اب اپنے)۔ کوئی کام کا مسیحا نظر آیا تو ہم بھی یہ علاج آزما کے دیکھیں گے۔

2

القصہ، مسٹر لوئیس نے ہم سے پوچھا، ''کیوں آئے؟ کس مرض میں آئے؟''

ہم نے کہا، ''پہلے آپ۔''

بولے، ''سمجھ میں نہیں آتا کیا مرض ہے۔ مجھے ایک ایک کے دو دو نظر آتے ہیں۔ مثلاً تمھاری میز پر ایک گلاس رکھا ہے، مجھے دو نظر آ رہے ہیں۔''

ہم نے کہا، ''لوئیس صاحب، دو ہی تو ہیں۔ یہ رہا ایک، یہ رہا دوسرا۔ یہ اسپتال کا ہے، یہ میں گھر سے لایا ہوں۔''

بولے، ''تمھارے پلنگ کے پاس اسٹول بھی دو دکھائی دے رہے ہیں، حالانکہ ایک ہے۔ ہر پلنگ کے ساتھ ایک ہوتا ہے۔''

ہم نے کہا، ''اسٹول بھی دو ہی ہیں۔ ایک یہ ساتھ والے مریض کا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی ادھر رکھ گیا۔''

اب فرمانے لگے، ''مجھے تو تم بھی دو ہی نظر آتے ہو۔''

اب ہم چپ ہو گئے۔ ان سے کیا کہتے کہ ہم بھی دو ہی ہیں، تمھیں غلط نظر نہیں آ رہا، بلکہ حقیقت پوچھو تو دو سے زیادہ ہیں:

ہم جب دیکھیں بہروپ نیا
ہم کیا جانیں تم کیا کیا ہو

اب انھوں نے ہمارا مرض پوچھا۔ ہم نے کہا،'' ہمیں کچھ نہیں ہوا، تھوڑا سا غم جاناں ہے۔ یہ مرض ایشیا میں، خاص کر ہمارے ملک میں زیادہ ہوتا ہے اور وبائی ہے۔ آپ کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ اس کی علامات بھی نثر میں بتانے میں لطف نہیں، اور شاعری کا ترجمہ ہم سے نہیں ہوتا۔''

3

عینی شاہدین کا بیان ہے کہ سرجن غازی (Gazet) نے ہمارے پیٹ میں لمبا سا شگاف دے کر پہلے ہماری تلی نکال کر ایک طرف کو پھینک دی، کہ ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ۔ پھر اپنڈکس نکالا، کہ یہ نام ہی سے شئے زائد ہے۔ سامنے چند غدود تھے، ان کو بھی نکال کر تھال میں سجا دیا۔ مختار صدیقی نے لکھا: ''گورے جسموں کو جواں رکھتے ہیں بندر کے غدود''۔ ہم کسی طرف سے گورے نہیں، اس لیے ہمارے غدودوں کے نعم البدل کی بھی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ یا یہ سوچا ہوگا کہ ان صاحب نے جوانی میں اپنے غدودوں سے کون سا تعمیری کام لیا، کون سا تیر مارا جو بندر کے غدودوں سے ماریں گے۔ ایک طرف جگر لٹکا نظر آیا۔ خیریت ہوئی کہ اسے نہیں نکالا لیکن اس کا ایک ٹکڑا، یعنی جگر گوشہ، نکال کر نمونہ کلام کے طور پر رکھ لیا۔ پھر کچھ اور نکالنے کی سوچ رہے تھے، دوسرے ڈاکٹر کو رحم آ گیا۔ اس نے کہا، ''بچارے کے پیٹ میں کچھ تو رہنے دو، بالکل ہی پیٹھ سے نہ لگ جائے۔'' یہاں آپ کو جوش صاحب کا قصہ یاد آئے گا، یادوں کی برات والا، کہ ''ارے کچھ تو پیٹ میں جائے۔'' لیکن وہ اور مضمون ہے۔ بڑے آدمیوں کی بھوک بھی بڑی۔

ہمارے پیٹ میں کئی خرابیاں ہیں۔ ایک تو اس میں کوئی بات نہیں پچتی۔ گولیاں کھائیں، ہکیچر پیے، لکڑ ہضم، پتھر ہضم چورن نوش جاں کیے، کچھ فائدہ نہ ہوا۔ خیر، پیٹ کا ذکر تو ضمنی ہے۔ نام اس مرض کا ایک انگریز ڈاکٹر ہاجکنز (Hodgkins) کے نام پر ہے اور اس کا تعلق جسم کی گلٹیوں سے ہے۔ اس نے اسے 1832 میں دریافت کیا۔ مرض تو دریافت کر لیا لیکن اس کا علاج تو ایک طرف، وجہِ مرض تک دریافت نہ کی، چنانچہ یہ اب تک دریافت نہ ہو سکی۔ ہم پہلے تو خوش ہوئے کہ دیکھو ایک

Scanned with CamScanner

مشہور انگریز کے نام کا مرض ہمیں لگا جو بہت نادر و نایاب بھی ہے۔ کھانسی، نمونیہ، تپ دق، ٹائیفائڈ، ملیریا کی طرح عامیانہ نہیں ہے۔ البتہ اس کے بارے میں پڑھا تو پریشانی ہوئی کہ ٹیڑھا مرض ہے۔ جان لیوا ہے، یعنی اس کا علاج یقینی نہیں ہے، جو ہے وہ تجرباتی ہے۔ ان انگریزوں، امریکنوں، جرمنوں کو نئے نئے مرض دریافت کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں۔ پھر ایک ایک مرض کے لیے دس دس دوائیں کھلواتے ہیں کہ کوئی تو کارگر ہوگی — آپریشن وغیرہ اس کے علاوہ۔ یہ نہیں کہ ایک امرت دھارا ایجاد کرلیا۔ اسی کو کھایا، اسی کو لگایا، اس کو پانی میں ڈال کر پی گئے، اسی کو رومال پر ڈال کر سونگھ لیا۔ ہمارے ڈاکٹروں اور حکیموں نے ایسے سفوف بنا رکھے ہیں کہ قبض والے کو بھی وہی، اسہال والے کو بھی وہی۔ کان دُکھتا ہو، پھنسی نکلی ہو، پیشاب نہ آتا ہو، پیشاب بہت آتا ہو، سر کے بال جھڑتے ہوں تو نہار منھ کھائیے، ورنہ پانی میں گھول کر بطور بال صفا پوڈر کے لگائیے۔ ایک صاحب تو اپنی دوا کا اشتہار دیتے ہیں کہ ''بواسیر اور دیگر امراضِ چشم کے لیے اکسیر ہے۔'' ایسے سرمے ہمارے حکمانے ایجاد کر رکھے ہیں کہ بصارت کے علاوہ بصیرت بھی عطا کرتے ہیں۔ انسان کو دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔ آج کل ریسرچ کے مارے امراض کی ریل پیل کا یہ عالم ہے کہ مریض کی سمجھ میں نہیں آتا، کس مرض سے مرے۔ پرانے زمانے میں شرفا چپ چاپ قضائے الٰہی سے انتقال کر جاتے تھے۔ اب قضائے الٰہی نام کا مرض کسی طبی کتاب میں نہ ملے گا۔ ڈاکٹروں کا اللہ تعالیٰ پر سے ایمان بالکل ہی اٹھ گیا ہے۔

4

جانے کب — غالباً رات کو — ہوش آیا تو دیکھا سر پر طرہ، ہار گلے میں، یعنی ناک میں نالی ہے، بازو میں سوئی، سرِ بالیں گلوکوز کی بوتل یعنی پلاسٹک کی تھیلی، ایک اور نالی پیٹ میں پیوست تاکہ آپریشن کے زخموں سے رستا ہوا خون اندر نہ رہ جائے۔ ہاں، پیٹ کو ہم بھول ہی گئے کہ اس پر ٹانکے اور ٹانکوں پر پھاہے اور پھاہوں پر پٹی۔ ابھی سن کرنے کی دوا کا اثر تھا لہٰذا تکلیف نہ تھی، البتہ سنسناہٹ یا پھر غنودگی۔ ہم نے دوستوں کو کہلوا دیا تھا کہ اس عالم میں ہمیں کوئی دیکھنے نہ آئے، ایک دو روز بعد سہی۔ لیکن اگلے روز ناک کی نالی نکلوا کر بیٹھے ہی تھے کہ فیض صاحب، جو لندن آئے ہوئے

Scanned with CamScanner

تھے، تشریف لے آئے۔ فیض صاحب کسی کو دیکھنے آئیں تو اسے اسی وجہ سے آپریشن کرالینا چاہیے۔ گویا یہ ہمیں مفت پڑا۔ ان کے ساتھ حمید اختر، پھر ابن حسن برنی، اور پھر تو دوستوں کا تانتا بندھ گیا، جنگل میں منگل ہو گیا۔ ہمارا آپریشن بھی تو منگل کے روز ہوا تھا:

چھاتی قفس میں داغ سے ہو کیوں نہ رشکِ باغ
فصلِ بہار تھی کہ ہم آئے اسیر ہو

5

آپریشن آج کل معمولی چیز ہے، نہ بھی ضرورت ہو تو ڈاکٹر شوقیہ کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب کو کھانسی تھی، وہ مکسچر لینے گئے، ڈاکٹر نے ان کی پنڈلی کا آپریشن کر کے پٹی باندھ دی۔ یہ سچ ہے کہ اس کے بعد ان کی پنڈلی میں مستقل درد رہنے لگا لیکن کھانسی غائب ہو گئی۔ مریض کا معاملہ البتہ الگ ہے۔ آپریشن سے زیادہ اس کی جان آپریشن کے خیال سے جاتی ہے۔ ہمارا آپریشن خاصا بڑا تھا۔ ہم نے پاکستان اپنے گھر والوں کو اطلاع بھی نہ دی، یہیں دوستوں سے کہہ دیا کہ بھئی کچھ ہو گیا تو صورت حال کو سنبھالنا۔ بعد میں لوگوں نے ہمیں داد بھی دی کہ بڑے بہادر آدمی ہو، چپ چاپ اتنا بڑا آپریشن کرالیا۔ اس پر ہمیں ان صاحب کا لطیفہ یاد آیا جو جہاز کے عرشے پر کھڑے تھے۔ ایک مسافر کا پاؤں رپٹا یا کچھ اور ہوا اور وہ پانی میں جا گرا، غوطے کھانے لگا۔ سبھی لوگ ہچکچا کر پیچھے ہٹ گئے۔ صاحبِ مذکور کو لوگوں نے دیکھا کہ اس کے پیچھے کود گئے اور اسے بچا لائے۔ ان کو بھی لوگوں نے داد دی تو وہ فریاد کرنے لگے کہ پہلے یہ بتاؤ، مجھے دھکا کس نابکار نے دیا تھا؟ ہمارے آپریشن کے لیے پہلے یکم اپریل کی تاریخ دی گئی تھی۔ اس روز آپریشن کرانا ہمیں حماقت نظر آیا۔ دوسرے بھی یہی خیال کرتے۔ اس سے قطع نظر، ہمت بھی نہ پڑی۔ جھرجھری سی آئی۔ کچھ بہانہ بنا کر مہلت لے لی۔ اگلی تاریخ 19 اپریل دی گئی اور ہم 17 اپریل کو داخل ہو گئے۔ اٹھارہ کو ہمارے حکیم سعید دہلوی دیکھنے کو آئے۔ ہم نے کہا، ''ابھی وقت ہے، حکیم صاحب، کوئی طبِ مشرق، کوئی جوشاندہ، خیساندہ، کوئی کشتہ، معجون مرکب، کہ نشتر سے جان بچے۔'' فرمایا، ''چڑھ جا بچہ سولی، رام بھلی کرے گا۔ اس کا علاج یہی ہے جو کرا رہے ہو۔'' پھر بھی رات کو جی چاہا کہ بھاگ چلو۔ ہم نے فضل بک ڈپو کے جاسوسی ناول پڑھ

Scanned with CamScanner

رکھے تھے۔ دو چادروں کو گرہ لگائی، ان کے ساتھ ایک تولیے کو جوڑا، پھر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ افسوس کہ ہم تیسری منزل پر تھے۔ آپریشن میں جان جانے کا اتنا امکان نہ تھا جتنا اس فرار کے طریقے میں۔ پھر اور بھی کئی مصلحتیں آڑے آئیں۔ ہم نے تاریخ اسلام سے متقدمین کے شجاعانہ کارنامے یاد کر کے دل کو بڑھاوا دیا۔ سلطان ٹیپو کا قول بھی یاد آیا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ پھر غور کیا تو یہ اپنے احوال کے مطابق نہیں بلکہ کچھ خلاف ہی جاتا نظر آیا۔ کھانا پینا رات ہی سے بند کر دیا گیا۔ صبح دم غسل کے بعد خاص آپریشن کا لباس پہنا دیا گیا۔ پھر اسٹریچر آ گیا اور ایک انجکشن ہمیں وہیں دیا گیا۔ اب آپریشن تھیٹر کی طرف پابجولاں چلے، دست افشاں چلے۔ آگے آپریشن تھیٹر کے دروازے پر پھر ایک ڈاکٹر نے ہمیں انجکشن دیا، اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ بیہوش ہونے سے پہلے ہم نے ان ڈاکٹر کی صورت کو مانوس پا کر پوچھا، ''آپ کہاں کے ہیں؟'' بولے، ''بنگلہ دیش کا ہوں۔'' ''نام؟'' ''ڈاکٹر احمد۔'' ہم نے کہا، ''الحمد اللہ! اگر یہ آخری نظر ہے تو اپنے ایک بھائی پر ہی پڑی ہے۔''

6

گلوکوز کی بوتل کا سٹینڈ چلیپا کی شکل کا ہے اور اس کے نیچے پہیے لگے ہیں۔ ہم اسے لے کر کاریڈور میں ٹہلنے کو نکلتے ہیں تو لگتا ہے حضرت عیسیٰ کا کوئی حواری یا نام لیوا صلیب لے کر نکلا ہو۔ انسان اپنی چھوٹی سی تکلیف کو بھی کتنی بڑی سمجھنے لگتا ہے۔ بیشک ہمارے پیٹ میں بھی آپریشن کے زخم کا احساس یوں ہوتا تھا جیسے کیل گاڑی گئی ہو، لیکن وہاں کیل گاڑنے کا مقصد ہلاک کرنا تھا، یہاں جان بچانا۔ یہاں ہر قسم کی احتیاط اور مرہم پٹی کہ زخم بگڑ نہ جائے، وہاں اس کے برعکس۔ یہاں دم دلاسا، ہمدردی، مزاج پرسی، وہاں طعن و تشنیع۔ وہاں سنگ و خشت، یہاں پھولوں کے گلدستے۔ وہاں چوبیں ٹکٹکی، یہاں نرم و گرم بستر، چائے پانی، دوا دارو۔ یہ سچ ہے کہ ان مصلوبوں اور شہیدوں کو جو شہرت نصیب ہوئی، ہمارے حصے میں نہ آئی۔ آج دنیا میں کروڑوں لوگ ان کے نام لیوا ہیں۔ ان پر کتابیں چھپتی ہیں، فلمیں بنتی ہیں، درود و سلام بھیجے جاتے ہیں۔ لیکن ہم ایسی شہرت سے درگزرے — ہم یہ سب کچھ نہیں چاہتے۔ ہم تو جینا چاہتے ہیں، وہ بھی

Scanned with CamScanner

اپنی دنیاداری کے متعلقات کے ساتھ:

حق اچھا پر اس کے لیے کوئی اور مرے تو اور اچھا
تم بھی کوئی منصور ہو جو سولی پہ چڑھو، خاموش رہو

بستر کی پائینتی کئی بٹن ہیں جو کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔ اکثر نتیجہ خلاف منشا نکلا۔ کئی بار بے ارادہ ہاتھ کسی بٹن پر پڑ گیا تو مشین چلنی شروع ہو گئی اور سر نیچے ٹانگیں اوپر ہوتی چلی گئیں۔ شیطانی کارخانہ ہے۔ ہمارے ملک کے اسپتالوں میں ہتھی گھما کر اوپر نیچے کرتے ہیں، وہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے زیادہ آزمودہ نسخہ یہ ہے کہ جس طرف سے پلنگ اونچا کرنا ہو اُدھر پایوں کے نیچے اینٹیں رکھ دی جائیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اینٹیں وقت کے وقت نہیں ملتیں، تب یہ کام کتابوں سے لیا جاتا ہے۔ ایک پائے کے نیچے بہشتی زیور، دوسرے کے نیچے علی پور کا ایلی (آخر الذکر ذرا اونچا ہو جاتا ہے)۔ یوں کتابیں بھی یکسر بیکار چیز نہیں ہیں، ان کا بھی کوئی نہ کوئی مصرف ہے۔

7

یہاں پر ہر کپڑے پر اسپتال کا نام اور سنہ درج ہے، یعنی جس سنہ عیسوی میں وہ چیز خریدی گئی۔ ہمارا دھاری دار گاؤن جسے پہن کر کبھی کبھی ہم شاہانہ کرّوفر سے نکلتے ہیں، 1962 سے مریضوں کی بے لوث خدمت کر رہا ہے۔ یہاں اوسطاً مریض دو ہفتے ٹھہرتا ہے — کوئی کم زیادہ بھی، لیکن حساب کے لیے دو ہفتے ہی رکھیے۔ اس لحاظ سے کتنے مریض اب تک اس گاؤن کے حصے میں آئے؟ کوئی چار سو۔ یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے! کہیں کہیں سے مسک گیا ہے۔ مریض تو اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں، لانڈری میں ایسا ہوا ہوگا۔ ابھی دو چار سال بخوبی کام دے گا۔ اس کا پٹکا نہیں ہے، اس کی جگہ ہم اپنا ازار بند ڈال لیتے ہیں۔ ازار بند کے ذکر سے نظیر اکبر آبادی کے شہر آشوب کا ایک بند یاد آتا ہے... بعض پیشوں کی کساد بازاری کے مضمون میں: ''دو دو مہینے تک...'' پورا نقل نہیں کر سکتے کہ کہیں بیٹھے بٹھائے تطہیر نہ ہو جائے۔ عاقبت تو ہماری مشتبہ ہی، دنیا بھی خراب کر بیٹھیں۔

Scanned with CamScanner

8

ہم سفر وحضر میں اپنے ساتھ کتابیں ضرور رکھتے ہیں اور ان میں اپنی بھی کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم اپنے محبوب مصنف ہیں۔ اپنی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جو ہم نے نہ پڑھی ہوگی۔ کیا اندازِ تحریر ہے! کئی بار تو اپنے ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے، حالانکہ قاعدے سے یہ کام کوئی اور کرتا، اور صیغۂ تانیث میں کرتا، تو بہتر ہوتا۔

اس بار ہمارے ساتھ چلتے ہو تو چین کو چلیے ہے۔ اس میں ایک گروپ فوٹو ہے جس میں کچھ لوگ مارشل چن ژی کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ان کے بالکل ساتھ ایک طرف پرنسپل ابراہیم خاں ہیں، دوسری طرف ایک شخص ہٹا کٹا، کلے بھرے ہوے، قد میں دوسروں سے کچھ نکلتا ہوا۔ ہم نے غور سے دیکھا، یہ ہم خود تھے۔ ہمیں یقین نہ آیا لیکن نیچے نام بھی لکھا تھا۔ اُس وقت اس جسم پر پینتیس پونڈ زیادہ گوشت تھا۔ مٹن کے حساب سے بھی دام لگایئے، یا کسی قصائی سے لگوایئے، تو کتنے کا نقصان اب تک ہو چکا!

9

آج کل ہمیں ایسے ایسے مرتب اور عالمانہ خواب آتے ہیں کہ بعض اوقات شرمندگی ہوتی ہے کہ ہم اپنے علم کو اتنا سطحی اور دماغ کو اتنا پراگندہ کیوں سمجھتے رہے۔ ہماری حد تک اس کا باعث کسرِ نفسی یعنی طبعی انکسار اور حلم بھی ہو سکتا ہے۔ ستم یہ ہے کہ اوروں کو بھی ہمارے بارے میں ایسے ہی مغالطے میں مبتلا پایا۔ اپنے جوہرِ قابل کی اس ناقدری پر دلی افسوس ہوا۔ بعض خواب تو اتنے بلیغ اور فاضلانہ تھے کہ خود ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ اب یاد بھی نہیں کہ بطور ثبوت یہاں درج کریں۔

10

احباب آتے ہیں تو کوئی نہ کوئی پھل ضرور لے آتے ہیں۔ ہم کچھ کھاتے ہیں، کچھ نرسوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ راقم مصنف کا شعر ہے:

Scanned with CamScanner

جھوٹے سکوں میں بھی اٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچا مال
شکلیں دیکھ کے سودے کرنا کام ہے ان بنجاروں کا

نتیجہ خاطر خواہ نکلتا ہے۔ خبر گیری زیادہ ہوگئی، بستر کی چادر بجائے محض اُلٹنے کے بدلی جانے لگی، تولیے بھی ایک کی بجائے دو آ گئے۔ ایک نرس کو ہم نے ایک اورنج، تین چار کیلے دیے اور کچھ انگور بھی تو اس نے ازراہ شفقت ہمارے ماتھے کو چوم لیا۔ اگر ایک دو سیب اور ایک آدھ ناشپاتی بھی دے دیتے تو شاید اسے اس عمل کے لیے موزوں تر مقامات بھی معلوم ہو جاتے جو چند انچ دور تھے۔ یہ ہمارا قیاس اور خوش خیالی بھی ہو سکتی ہے۔ دراصل ہمارا ارادہ اس حکایت کو تھوڑے سے حسنِ بیان سے لذیذ تر بنانے کا تھا— آخر سب لکھنے والے اپنے سفرناموں اور اسپتال ناموں میں ایسا کرتے ہی ہیں — لیکن خدا کا خوف حائل ہوا۔ اس بیماری میں، کہ ہماری زندگی داؤں پر لگی ہے، ہم نے صدقِ دل سے عہد کیا ہے کہ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتے، جھوٹ کم سے کم بولیں گے، وہ بھی فقط جب اور جہاں ضرورت ہوگی۔ اللہ ہمارے اس ارادے کو استقامت بخشے۔

11

کل بشارت ملی کہ ہماری رپورٹ بڑی اچھی ہے۔ ہمارے زخم تیزی سے مندمل ہو رہے ہیں، چند روز میں ٹانکے کھل جائیں گے۔ رات ساڑھے نو بجے ان ٹانکوں سے خون بہہ نکلا اور اتنا کہ تسلا بھر گیا۔ ڈیڑھ دو سیر تو نکلا ہوگا۔ اس کے بعد تین چار بار پھر، کوئی آدھ آدھ سیر۔ ہمارے پاجامے اور نائٹ سوٹ خراب ہو گئے۔ ہم نے اسپتال والوں سے نائٹ سوٹ مانگا۔ انھوں نے جو دیا اس کے دونوں حصے مختلف رنگوں اور ڈیزائنوں کے تھے۔ ایک کی دھاریاں سیندوری رنگ کی، دوسرے کی سبز۔ پھر دونوں اتنے چھوٹے کہ اندر کفن کے سر ہے تو باہر کفن کے پاؤں۔ پاجامہ تو شرعی سے بھی اونچا۔ ہم نے فرمائش کی کہ ''بابا، یا تو اوپر کے ساتھ کا نیچے کا حصہ لا کر دو یا نیچے کے ساتھ کا اوپر کا حصہ۔'' جواب ملا، ''ناممکن۔'' ہم نے کہا، ''کوئی تیسری صورت؟ مختلف ڈیزائن لیکن ایک ہی رنگ کے دونوں حصے؟'' انھوں نے کہا، ''یہ بھی امرِ محال ہے۔ مختلف پاجاموں یعنی نائٹ سوٹوں کے مختلف بالائی اور زیریں حصے وارڈوں میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کا ذو اضعافِ اقل نکالنے کے لیے

Scanned with CamScanner

کمپیوٹر چاہیے۔" ہم نے کہا، "ہمیں ذو اضعافِ اقل یا عادِ اعظم نہیں، پاجامہ چاہیے۔ مسئلہ ریاضی کا نہیں، جامہ زیبی کا ہے۔" جب تک ہمارے پاجامے نہیں ڈھل گئے، ہم اسی قلندرانہ لباس میں دندناتے رہے:

ترا داغ ہے دل میں چراغ صفت، ترے نام کی زیب گلو کفنی

12

بلمونٹ میں آج کل بہار ہے — پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں، کم کم بادو باراں ہے! ہمارے میر صاحب رہتے لکھنؤ میں تھے، نقشے ولایت کے کھینچتے تھے۔ بلمونٹ لندن میں ہے بھی اور نہیں بھی۔ لندن نے پھیلتے پھیلتے جانے کتنے قصبے اپنے پیٹ میں ہضم کر لیے ہیں۔ وکٹوریہ اسٹیشن سے ریل میں بیٹھیے تو بارھواں تیرھواں اسٹیشن ہے۔ سٹن مشہور جگہ ہے، بس اس سے ایک اسٹیشن آگے۔ ہرا بھرا، سرے کا صوبہ۔ اس پُر فضا ماحول میں کئی اسپتال ہیں۔ یہ اسپتال، رایل مارسڈن اسپتال، انگلستان بلکہ یورپ میں کینسر اور اسی قسم کے دوسرے موذی (میلگننٹ) امراض کا سب سے اچھا اسپتال اور مرکزِ تحقیق گنا جاتا ہے۔

کمرہ ہمارا مائیلز وارڈ میں دوسری منزل پر، بلکہ ہمارے حساب سے تیسری منزل پر، عین سامنے کے رخ ہے۔ ہمارے سامنے درختوں کی کونپلیں پھوٹیں، جھاڑیوں میں شگوفے آئے، لنڈ منڈ درخت ہرے بھرے ہوے اور اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن زیب تن کیے۔ کبھی دھوپ نکلتی ہے، کبھی رم جھم ہوتی ہے۔ پھر بھی اسپتال اسپتال ہے اور گھر گھر ہے۔ پانچ ہفتے ہو گئے، اب چھٹی لیں۔ ہمارے آپریشن کے زخم نہیں بھرے، نہ سہی۔ ہمارے اور کون سے زخم بھرے ہیں! اور زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟ اب رہی پٹی، وہ ہم گھر پر کر لیا کریں گے۔ ہمیں پٹی باندھنی آتی ہے۔ ہم نے زندگی میں کبھی کرنے کے اور نہ کرنے کے کام اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہی کیے ہیں۔ ڈاکٹر سے بات کریں گے۔ دیکھیے کیا کہتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

13

سسٹرز — خصوصاً وہ جو رات کے وقت ڈیوٹی پر ہوتی ہیں — ہم سے پہلی نسل کے رشتے سے تو شاید سسٹرز کہلا سکیں، ہمارے حساب سے ان کو چچیاں، تائیاں، پھوپھیاں وغیرہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بہر حال، ہیں اپنی اپنی جگہ شفیق۔ فائدہ اس عمر کی بیبیوں کو رات کی ڈیوٹی پر رکھنے کا یہ ہے کہ مریضوں کے دلوں میں ناروا ہلچل پیدا نہیں ہوتی۔ وہ چین کی نیند سوتے ہیں بلکہ از خود جلد از جلد سونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسپتال والوں کی خواب آور دوائیں بچتی ہیں۔ شرافت اور پاکیزگی کا دور دورہ رہتا ہے۔ ایک پادری صاحب ہفتے کے ہفتے آتے ہیں۔ لوگوں کو گرجا میں بلاتے ہیں۔ گناہوں کے اعتراف کی تلقین کرتے ہیں۔ ہم نے کہا، ''ہم بھی اپنے گناہوں کا اعتراف کر سکتے ہیں؟ کچھ کردہ گناہوں کا، لیکن زیادہ ناکردہ گناہوں کی حسرتوں کا۔'' بولے، ''تم رومن کیتھلک ہو؟'' ہم نے کہا، ''نہیں۔ نہ رومن نہ کیتھلک۔'' بولے، ''پھر کچھ فائدہ نہیں۔ تمھاری بخشش کا ذمہ میں نہیں لے سکتا۔''

ہمارے اور ان لوگوں کے دین میں بڑا فرق ہے۔ ان کے پادری لوگ اعترافِ گناہ کراتے ہیں، ہمارے ہاں تھانیدار وغیرہ۔ ایک فرق یہ سنا ہے کہ پادری کے سامنے برضا و رغبت اعتراف کیا جاتا ہے، بید یا مرچوں کی دھونی یا برف کی سل اور پولیس والوں کے محاورے اور روز مرے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہمیں یقین نہیں آتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

14

بھانت بھانت کے لوگ اس اسپتال کے عملے میں ہیں۔ انگریز ڈاکٹر اکثر زیادہ کمائی کے لالچ میں امریکہ وغیرہ کو سدھار گئے لہٰذا ڈاکٹر بھی کالے پیلے ملکوں کے، اور نرسیں اور دوسرے خدام بھی کئی ولایات کے، بالخصوص کامن ویلتھ کے ملیں گے۔ کئی نرسیں سیلون کی ہیں، بعض ہندوستان کی لیکن جنوبی ہندوستان کی، ایک دو سنگاپور کی، افریقہ کی کئی ایک، ایک لڑکی ملائیشیا کی لیکن ہندو نژاد، ایک بہت موٹی عورت اسپین کی ماریا لیکن طبیعت کی بہت اچھی، ہر وقت کچھ نہ کچھ گاتی الاپتی ہوئی؛ چربی کی تہیں پگھلائی جائیں تو اندر سے اب بھی خوبصورت نکلے۔ کچھ وارڈ بوائے، بعض ان میں تند خو

بھی، لیکن ایک شخص ڈاڑھی والا افریقی ہمیشہ خوش باش، ہمیں بھلا لگتا تھا۔ اچھے ہاڈ کاٹھ کا اور موزوں اعضا۔ سارے کام خوشی خوشی کرتا تھا۔ ایک روز ہم نے پوچھا، ''کہاں کے ہو؟'' بولا، ''گھانا کا ہوں۔'' ہم نے کہا، ''عیسائی ہو، ہمارے اہل کتاب بھائی ہو؟'' بولا، ''افسوس، اب میں عیسائی نہیں ہوں، مسلمان ہوں۔'' ہم نے کہا، ''ارے اس میں افسوس کی کیا بات ہے! اور تمھارا اسلامی نام کیا ہے؟'' بولا، ''میرا اسلامی نام اور غیر اسلامی نام ملا کر تو بہت لمبا ہو جاتا ہے۔ ویسے علی کہہ لیجیے، الحاج علی کہہ لیجیے۔ یوں پورا نام بتاؤں تو دو سطروں میں آئے گا۔ اس میں ولدیت سکونت کے علاوہ پیدائش کا دن بھی شامل رہتا ہے۔'' ہمارے اصرار پر اس نے ہمیں اپنا نام یوں لکھوایا اور وہ سچ مچ دو سطروں میں آیا:

SOGBOLISA SESESESKO KUKUBEDU

WASANBANGA MENSS MENSAH KWAME

سوگبولیسا سیسی سیکو کوکو بیدو واز ابنگا منس منسا کوامی۔ ہم نے کہا، ''الحاج اور علی تو اس میں نہ آئے۔'' بولا، ''ہاں، وہ اس کے علاوہ ہیں۔ میں نے اختصار سے کام لیا ہے۔ چائے کے برتن چھوڑ کے آؤں تو نام کا ضمیمہ بھی لکھواؤں۔''

15

دانتوں میں بھی درد انھی دنوں اٹھنا تھا، اور درد سا درد کہ ہم اصل تکلیف کو بھول گئے۔ اسپتال سے فراغت ابھی دور نظر آتی تھی۔ پس ہم نے درخواست کی کہ دنداں ساز کا یہیں انتظام کیا جائے، اتنی اسپرین اور درد رُبا دوائیں ہم کہاں تک کھائے جائیں۔ آخر اسپتال کے ماہر سے ہماری اپائنٹمنٹ ہوئی۔ نام تھا مسٹر کافن (Mr.Coffin) یعنی 'جناب تابوت'۔ خاصا نامبارک نام ہے! یہاں ڈاکٹر بس ایک حد تک رہتا ہے، جب بہت سینئر ہو جائے اور کنسلٹنٹ کہلائے تو مسٹر بن جاتا ہے۔ اب اسے ڈاکٹر کہیے تو پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ باکمال سرجن مسٹر غازی (Gazet) بھی جنھوں نے ہمارا پیٹ چاک کیا، مسٹر غازی ہی کہلاتے تھے یا پروفیسر، جیسے ہمارے اصل معالج، عالمگیر شہرت کے مالک پروفیسر پیکم۔ مسٹر کافن نے ہمیں خاصی بے توجہی سے دیکھا اور کہا، ''بس زور

Scanned with CamScanner

زور سے تین بار دن میں برش کیا کرو اور چھ بار غرارے۔ اب جاؤ، پھر بلاؤں گا۔'' پھر انھوں نے نہ بلایا۔ معلوم ہوا کہ دو ہفتے بعد کی اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ شہر کے اسپتال میں اپائنٹمنٹ کر دی ہے اور وہ بھی دانتوں کے علاج کے لیے نہیں، دانت نکالنے کے لیے۔ ہم بہت مایوس ہوئے کہ ہمارا کلہ تو آج سوجا ہوا ہے اور تاریخ دو ہفتے بعد کی ہے۔ وطن عزیز بہت یاد آیا۔ اول تو ہمارے دوست ایسے ہیں کہ اتوار کو گھر سے بلالو، دل جمعی سے کام کر دیں گے۔ اور کچھ نہیں تو عارضی طور پر دانت میں کوئی دوا بھر دیں گے۔ گولیاں بھی دے دیں گے کہ سکون رہے، درد نہ ہو۔ ڈاکٹر کے پاس جانا منظور نہ ہو تو ریڈیو پاکستان کے سامنے بہت سے باکمال فٹ پاتھ پر ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں۔ ایک ٹوٹی ہوئی مشین جس کا پہیہ جانے گھومتا بھی ہے کہ نہیں، ہاتھی کے دانتوں کی طرح کھانے کو کم، دکھانے کو زیادہ۔ چند زنگ آلود زنبور۔ بہت سے دانت، جو جانے خود نکالے ہیں یا قبرستان سے اکٹھے کیے ہیں۔ کچھ لال گلابی جبڑے، جانے اصلی یا مصنوعی۔ اور حق خدمت فقط پانچ روپے۔ خیر، ان ڈاکٹر سے بھی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے انجکشن لگایا اور زاں پیشتر کہ بانگ برآید، ہمارے تین دانت نکال کر ڈھیر کر دیے۔ ہم نے کہا، ''یا حضرت، یہ کیا؟ ہم تو مرمت کے لیے آئے تھے۔ نکالنا تھا تو فقط ایک نکالتے جس میں تکلیف ہے۔'' فرمایا، ''تکلیف تو بیشک ایک ہی میں ہے لیکن باقی میں بھی زود یا بدیر ضرور شروع ہوتی، پھر ہر ایک کے لیے سن کرنے کا انجکشن الگ لگانا پڑتا۔ اب ایک ہی انجکشن سے سارا کام ہو گیا۔ بلکہ اگلے بدھ کو آؤ، تین اور نکالوں گا۔'' ہم نے ان سے جان کی امان مانگی اور ایک پاکستانی ڈاکٹر تلاش کیا۔ اس نے بائیس پاؤنڈ تو لیے لیکن بڑی مہربانی اور دلسوزی سے دیکھا اور دوا لگائی اور افسوس کیا کہ انگریز ظالم نے ناحق اتنے سارے دانت نکال دیے۔ اس کی چارہ سازی کی بدولت اب باقی ماندہ دانت بھلے چنگے کام کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو اصلی دانتوں سے اتنی ضد ہے کہ بعض اوقات شوقیہ بھی اصلی جبڑا نکلوا کر نقلی لگوا لیتے ہیں، حالانکہ سونے کے بھاؤ لگتا ہے بلکہ اس سے بھی مہنگا — ہمارے ڈاکٹر اچھے کہ چاہو تو نقلی دانت اکھڑوا کر اصلی لگوالو۔

16

ہم اپنے بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہیں تو ہمارا پڑوسی فرینک ہمیں بہت غور سے دیکھتا ہے۔

اسے تعجب ہے کہ ہم کیسے بیٹھ لیتے ہیں اور گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ اسے یوگا کا کوئی آسن سمجھا۔ اس نے ایسے بیٹھنے کی بہت کوشش کی لیکن نہ کر سکا، پسینے چھوٹ گئے۔ بولا، ''بڑے جان جوکھوں کا کام ہے جی۔'' ہم نے اسے بتایا کہ ہمارے ہاں تو بیٹھتے ہی ایسے ہیں۔ کھانا کھانے کے لیے، گپ کرنے لیے، شاعروں کا مشاعرہ اور لیڈروں کی تقریریں سننے کے لیے، میلاد شریف کے لیے، جوا اور تاش کھیلنے کے لیے، گیان دھیان کے لیے اور لوگوں کی چغلیاں کرنے کے لیے؛ حتیٰ کہ پنڈت کوکا آنجہانی کی تالیفات میں بھی اس کی تصویریں ہیں۔ بہت حیران ہوا۔

17

شیخ سعدی ایک بار معتکف تھے جامع دمشق کے صحن میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مزار پر، دل خستہ اور ملول کہ ان کے پاؤں میں جوتا نہ تھا۔ اتنے میں ایک شخص مسجد میں داخل ہوا، اس کے پاؤں ہی نہیں تھے، گھسٹتا آ رہا تھا۔ فرماتے ہیں شیخ سعدی کہ میں نے فوراً درگاہ رب العزت میں سجدۂ شکر کیا کہ میرے پاؤں تو ہیں۔

ہمیں اپنی بیماری خاصی سنگین معلوم ہوتی تھی، ہے بھی، اور بیشک ہمیں پچھلے ایک سال اسپتالوں، آپریشنوں، ریڈیو تھراپی اور دوسرے علاجوں کے سلسلوں سے گزرنا پڑا جو خاصا تکلیف دہ عمل ہے، لیکن اسپتال میں اکثر سجدۂ شکر کا موقع آیا کہ خدا کا ہم پر کتنا کرم ہے۔ پاس کے بستر پر مسٹر پاٹرج تھے۔ اچھے خوش باش۔ معلوم ہوا ان کے وہ حصہ جسم ہی نہیں جس سے رفع حاجت کا کام لیا جاتا ہے۔ ایک پلاسٹک کی نالی سے کام لیتے ہیں۔ یوں نیچے گدی باندھ کر اوپر سے پتلون کس لیتے ہیں تو خاصے اسمارٹ معلوم ہوتے ہیں۔ مسٹر جان تھے۔ ان کی ٹانگ کینسر زدہ تھی۔ پوری ٹانگ پر جسم کے دوسرے حصوں کی جلد کے پیوند لگے تھے۔ سامنے والے مسٹر ایرک تیسری بار اسپتال میں داخل ہوئے۔ ان کے زیریں حصے سے خون ہی نہیں رکتا۔ ابھی پاجامہ بدلا، ابھی پھر آلودہ ہوا۔ ہر دم بوتل باندھے باتھ روم آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کا Prostate Gland کا آپریشن ہوا ہے۔ ساتھ والے پلنگ پر مسٹر فرینک ہیں۔ سارا وقت کتابیں پڑھتے رہتے ہیں لیکن جاسوسی ناول۔ ان کے دماغ کے اعصابی نظام میں پھوڑا ہے، اور کینسر کا پھوڑا جس کا آپریشن

ہونا ہے۔ آج یک لخت ان پر تشنج طاری ہوا اور وہ تڑپنے لگے۔ ساتھ کے کمرے میں کوئی سیاہ فام مریض ہے۔ رات بھر روتا کراہتا ہے، ماں کو یاد کرتا ہے، حتیٰ کہ لواحقین اس کا علاج پورا ہوئے بغیر اسے گھر اٹھا لے گئے۔

18

ایرک اسپتال سے رخصت ہوئے تو ان کے بستر پر کسی محکمے کے باس آئے۔ ان کے دفتر کے ماتحت اگلے روز ان کے لیے پھولوں کے گلدستے بلکہ ٹوکریاں لائے۔ ان کے جانے کے بعد صاحب مذکور نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ ''میں اپنے دفتر میں ذرا سخت گیر مشہور ہوں، پھر بھی دیکھو لوگ کس خلوص سے گلدستے لائے ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ لوگوں کو مجھ سے اتنی محبت ہے۔'' ان کو تیسرے ہی روز چھٹی مل گئی۔ چوتھے دن ان کے دفتر ایک آدمی بڑے شوق سے گلدستہ لے کر آیا۔ اس کو سخت مایوسی ہوئی کہ صاحب اچھے ہو کر چلے بھی گئے۔ منھ لٹکا کر کہنے لگا: ''اس کا مطلب ہوا کہ دو ایک روز میں پھر دفتر آنے لگیں گے۔ یا قسمت، یا نصیب!''

19

اس کمرے میں جس میں اب ہم ہیں، ٹیلی وژن بھی ہے۔ آج کل یہاں ایک پروگرام دکھایا جا رہا ہے: دی سیل آف دی سنچری۔ یہ ہمارے ہاں کے پروگرام نیلام گھر کی نقل ہے لیکن ظالموں نے کہیں اعتراف نہیں کیا۔ اس میں بھی سوال وجواب ہوتے ہیں اور انعام دیے جاتے ہیں، تاہم اصل اصل ہے اور نقل نقل ہے۔ اس میں پروگرام پیش کرنے والا ہمارے دوست طارق عزیز کی طرح جابجا اشعار آبدار نہیں پڑھتا، ساری گفتگو نثر میں کرتا ہے۔ اس میں فلمی ستاروں کی ریل پیل بھی نہیں۔ اگر کوئی آتا بھی ہے تو اپنی پوری اولاد کو ساتھ لے کر نہیں آتا اور لدا لدایا نہیں جاتا۔ ایک بات البتہ ہے۔ جو سامان انعام میں دیا جاتا ہے — اور بعض اوقات اس میں پورے گھر کا فرنیچر ہوتا ہے — مددگار لڑکیاں لباسِ نیم لباسی میں لہراتی ہوئی بڑے ناز کے ساتھ مسکراتی اس پر متمکن ہوتی ہیں۔ پر معلوم نہیں انعام پانے والے ریڑھا

Scanned with CamScanner

لاتے ہیں تو ان کو بھی ڈھو کر ساتھ لے جاتے ہیں یا وہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہم ہوں تو فرنیچر وہیں چھوڑ جائیں اور... خیر، بیماری میں ایسے فاسد خیالات زبان قلم پر نہ لانے چاہییں، تندرست ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔

20

ہم جب کبھی ایکسرے کے لیے جاتے ہیں — اور ہمارے اب تک کئی سو ایکسرے ہو چکے ہیں — تو کپڑے اتارنے کی کوٹھڑی میں ایک نوٹس لگا پاتے ہیں کہ اگر کوئی مریض امید سے ہو تو ڈاکٹر کو پہلے سے بتا دے۔ یوں تو دنیا بہ امید قائم، اور ہماری تو ساری زندگی امید ہی امید میں گزری ہے، لیکن کبھی ہمیں ڈاکٹر کو بتانے کا حوصلہ نہ ہوا، جس کی وجہ ہماری مشرقی حیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ایکسرے کرنے والی ہمیشہ کوئی خاتون ہی ہوتی تھی۔ ایک روز ایسی تھیں کہ ذرا بڑی عمر کی تھیں اور ہم نے جھجکتے جھجکتے ان کے سامنے اعتراف کر ہی لیا۔ بہت ہنسیں۔ جانے کیوں؟

21

ابھی ابھی وہ سسٹر تشریف لائیں جو شفٹ کی انچارج ہیں۔ بولیں، ''آپ کون سی زبان بولتے ہیں؟'' خوشی ہوئی کہ کسی کو تو ہماری زبان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ زبان سے ہوئی ہے تو ہمارے ملک سے اور ہمارے کلچر سے ہوگی، اور ہو سکتا ہے ہوتے ہوتے ہم سے بھی ہو جائے۔ پس ہم نے کہا، ''اسے اردو کہتے ہیں اور سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے اور اس کا تعلق زبانوں کے انڈو ایرین قبیلے سے ہے۔ یہ اپ بھرنش اور کھڑی بولی سے نکلی ہے... جب مسلمان ہندوستان میں آئے... لیکن ٹھہریے، کرسی پر بیٹھیے، میں محمد بن قاسم سے بات شروع کرتا ہوں — کہ ہماری ہر بات وہیں سے شروع ہوتی ہے...''

بے صبری سے کہنے لگیں، ''اور کون سی زبان جانتے ہیں آپ؟''

ہم نے کہا، ''تھوڑی سی انگریزی۔ نمونہ کلام اس کا آپ اس وقت بھی دیکھ رہی ہیں۔''

بولیں، ''بات یہ ہے کہ ایک مریض ہے جو ترکی بولتا ہے، اور ترکی بولنے والا ہمیں کوئی ملتا نہیں۔''

Scanned with CamScanner

ہم ترکی میں بند نہیں۔ ہم استنبول میں ہوٹل کے بوائے سے کہتے تھے: ''اکی شیشہ سوک سو،'' اور وہ دو گلاس ٹھنڈا پانی لا دیتا تھا۔ اب اس ترکی مریض کی طرف سے عین مین یہی فرمائش ہوتو اسے دو گلاس ٹھنڈا پانی فراہم کرنے یا فراہم کرانے کا ذمہ ہم لے سکتے تھے، لیکن اس سے آگے کی کوئی تکلیف ہوتی تو ہم خود لسانی تکلیف میں مبتلا ہو جاتے۔ لہٰذا ہم نے آر سی ڈی اور اسلام کے محکم رشتوں کے باوجود اپنی خدمات پیش کرنا مناسب نہ سمجھا؛ بہانہ کر دیا کہ ہمیں یہ زبان نہیں آتی۔

22

فنون میں ہماری نظم ''اب عمر کی نقدی ختم ہوئی'' پڑھ کر بہت سے ہمارے دوست اور ہمدرد اور محبت کرنے والے آزردہ ہوئے اور ہمیں خط لکھے۔ اسے اتنی اہمیت نہ دینی چاہیے۔ ہم نے اپنی زندگی کے نفع نقصان کا گوشوارہ بنایا تو دیکھا، کسی طرح گھاٹے میں نہیں رہے، ہمیشہ اپنے حق سے زیادہ پایا، لہٰذا حتی الوسع افسوس اور رقت سے دامن بچایا، تاہم بندہ بشر ہے۔

آپریشن ٹیبل پر جانے سے پہلے ہم نے ایک زبردست تحریر دنیا اور دنیا والوں کے لیے لفافے میں بند کر کے چھوڑی تھی جس میں اپنا نظریۂ زندگی بیان کرتے ہوئے لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین کی تھی جس پر چند ناگزیر وجوہ سے ہم خود نہ چل سکے تھے۔ افسوس کہ فصاحت و بلاغت کا وہ شاہکار فی الحال منظرِ عام پر نہ آ سکے گا۔ پاکستان سے ہمارے دوست مصلح الدین ٹیلی وژن والے لندن آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بصرفِ زرِ کثیر انگریز کیمرامین ہمارے گھر پر لا کر ہمارا انٹرویو کیا، ہر زاویے سے ہماری تصویریں کھینچیں۔ یوسف کامران نے، کہ وہ بھی یہاں تھے، بڑے بلیغ سوال و جواب ہم سے کیے، بہت سی نظمیں ریکارڈ کیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ کس خوش خیالی میں ایسا کر رہے ہیں۔ جی ہی جی میں ہنستے رہے۔ ان کا دل کیا توڑتے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے قومی ادارے پاکستان ٹیلی وژن کے یہ پیسے ضائع جائیں گے، بلکہ اس انٹرویو کے دکھائے جانے کی حسبِ دل خواہ تقریب جلد نہ نکلی تو شاید ان سے باز پرس بھی ہو، ان کی انکوائری بھی ہو جائے۔ لیکن اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ ــــ یا ہے؟

❁❁

صلاح الدین درویش

فکرِ اقبال کا المیہ

صلاح الدین درویش 1964 میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ بہاالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان سے 1988 میں اردو میں ایم اے کیا اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے 1996 میں ایم فل اور 2004 میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔ 1989 سے اسلام آباد میں تدریس سے منسلک ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں: اردو افسانے کے جنسی رجحانات (1999)، تیسری دنیا کا فلسفۂ افکار (2001)، جدید ادبی تحریکوں کا زوال (2002)، انسان دوستی: نظریہ اور تحریک (2007)، انسان، کائنات اور سماج: جدید مادیت پسند تفہیم (2011)۔ ادب اور مادیت کے عنوان سے ایک کتاب زیرِ طبع ہے۔

صلاح الدین درویش سے ان کے موبائل فون نمبر 0333-5132942 پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

چند باتیں

منبر پر بیٹھے مولوی سے لے کر جمہوریت پسند روشن خیال دانشوروں تک اور اعتدال پسند مفکرین سے لے کر مارکسی انقلابیوں تک مجھے ایک بات ہمیشہ سے حیران اور پریشان رکھتی تھی کہ ان تمام مکتبہ ہائے فکر کے لوگ نظریاتی سطح پر ایک دوسرے کے مخالف ہونے کے باوجود بیک وقت اقبال کی تائید کیسے کر لیتے ہیں؟ اقبال سب کے لیے اس قدر قابلِ قبول کیوں ہیں؟ میں سوچتا تھا کہ یا تو اقبال کی فکر میں ایسی ہمہ گیریت ہو گی کہ سب لوگ اختلافات کے باوجود اقبال کی فکری مرکزیت سے ہم آہنگ رہے، یا پھر فکرِ اقبال کے مختلف اجزا کو اپنے نظریات کی تائید میں بہ سہولت دستیاب سند کے طور پر استعمال کرنے کی روش اختیار کی گئی ہے۔ مادیت پسند روایت کے حوالے سے جب میں نے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تو میرا دھیان مسلسل فکرِ اقبال کی روحانیت پسند روایت کی طرف بھی لگا رہا۔ چنانچہ 2004 سے لے کر 2006 تک ایک تسلسل کے ساتھ جب بھی وقت ملتا، اقبال کے اردو کلام اور خطبات کا مطالعہ شروع کر دیتا۔ اس دوران اہم ترین نکات یہ سوچ کر نوٹ کرتا رہا کہ فکرِ اقبال کو ان کی شاعری اور نثر کے حوالے سے مربوط کرنے کی کوشش کر سکوں۔ اس کوشش میں جب کامیابی کے کچھ آثار نمایاں ہونے لگے تو میں نے اپنے مادیت پسند افکار کی روشنی میں تمدنِ جدید کے مسائل اور ان کے حل کی خواہش کے پیشِ نظر تقابلی مطالعے کی ایک صورت پیدا کرنے کے لیے اقبال پر کھل کر لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ سال 2006 کے آخر میں میں نے اقبال پر ان کے اردو کلام کے حوالے سے ایک طویل مضمون تحریر کیا۔

Scanned with CamScanner

اس مضمون کی تکمیل نے مجھے یہ بات کہنے کا حوصلہ دیا کہ خصوصاً روشن خیال، اعتدال پسند، جمہوریت نواز، ترقی پسند اور مادیت پسند اشتراکی خیالات کے حامل حلقے فکرِ اقبال کی مربوط تفہیم کے بغیر ہی اپنی اپنی نظریاتی تشہیر کے لیے فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں کو اپنی اپنی پسند اور ترجیح کے مطابق استعمال کر رہے ہیں۔ اسے مذکورہ مادیت پسندوں کی روحانی خود فریبی کے سوا کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

فکرِ اقبال کا دوسرا اہم ماخذ اقبال کے خطباتِ مدراس پر مشتمل کتاب **تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ** ہے۔ اس موضوع پر انتقاد بہت احتیاط کا متقاضی تھا۔ ان خطبات پر ہونے والے تحقیقی و تنقیدی کام کے مطالعے کے بعد میرے لیے ایک اور بھی دشواری تھی کہ اس حوالے سے تحقیقی و تنقیدی مقالہ جات میں اقبال کے فلسفیانہ افکار پر مشتمل اس کتاب کو ایک مذہبی کتاب کے طور پر دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی گئی تھی جبکہ خود اقبال نے اپنی اس کتاب کے دیباچے میں خطبات کے مندرجات کو پوری آزادی کے ساتھ قابلِ تنقید اور قابلِ گرفت قرار دیا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اقبال کے دیباچے نے مجھے پوری آزادی کے ساتھ خطبات پر تنقیدی بحث کا موقع فراہم کیا۔

یہ کتاب اقبال شکنی کے لیے نہیں بلکہ اقبال فہمی کے لیے تحریر کی گئی ہے۔ اگر کہیں اقبال شکنی کا تاثر نمایاں ہوتا ہو تو اسے میرے اسلوب کی کوتاہی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ مجھے اختلاف کی جرأت اقبال نے دی ہے اقبالیوں نے نہیں۔

صلاح الدین درویش

Scanned with CamScanner

اجازت نامہ

''یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ غور و فکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں۔ جیسے جیسے جہانِ علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے لیے نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں، کتنے ہی اور، اور شاید ان نظریوں سے جو ان خطبات میں پیش کیے گئے ہیں زیادہ بہتر، نظریے ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہر حال یہ ہے کہ فکرِ انسان کی نشو و نما پر بہ احتیاط نظر رکھیں اور اِس باب میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں۔''

محمد اقبال

(دیباچہ: تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ)

Scanned with CamScanner

پہلا حصہ

فکرِ اقبال کا المیہ

(نقد و نظر بحوالہ اُردو کلامِ اقبال)

1

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال بیسویں صدی کے خوش قسمت ترین شاعر ہیں کہ جن کو عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ اقبال کی شاعری کے عروج کا عہد نو آبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کا نقطۂ عروج بھی ہے۔ قدیم نو آبادیاتی عہد کا تجارتی سرمایہ، جو منڈیوں کی تلاش، حصول اور قبضے تک محدود تھا، یورپ میں جال کی طرح پھیلتی ہوئی صنعت کاری کے باعث صنعتی سرمائے میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ صنعتی سرمائے کے حصول کے لیے جب منڈیوں پر عسکری قبضہ بہت مہنگا پڑنے لگا تو اس کے بجائے صنعتی سرمایہ دار نے ضروری سمجھا کہ منڈیوں پر سیاسی انتظام کے ذریعے گرفت رکھی جائے۔ نو آبادیات کے پاس آزادی کے بعد بھی عالمی منڈی میں بیچنے کے لیے کچھ نہ تھا، پس نو آزاد ریاستوں کے لیے ضروری تھا کہ نو آبادیاتی عہد کے انفراسٹرکچر کی بنیاد پر کسی نہ کسی طور پر کام چلتا رہے۔ بڑی سطح پر ہر وہ صنعت کاری جو بیسویں صدی کے آغاز تک پورے یورپ اور امریکہ کو اپنے پاؤں پر کھڑا کر چکی تھی، اُس کے ساتھ مقابلہ کرنے کی سکت نو آزاد ریاستوں میں بالکل نہ تھی۔ نئی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی یورپ اور امریکہ کی سیاسی سٹریٹجی کے تابع رہ کر حصہ دار بننا نو آبادیات کا نوشتۂ دیوار بن چکا تھا۔

اس بات نے علامہ اقبال کی فکر میں شدید ردعمل پیدا کیا۔ عالمی سرمایہ دارانہ انقلاب کی روح وہ تمدن تھا کہ جس کی بنیاد میں سائنسی علوم کی ترقی اور ٹیکنالوجی نے اہم ترین کردار ادا کیا تھا، اور یہ انقلاب بھی اچانک نمودار نہیں ہو گیا تھا بلکہ اس کے پیچھے یورپی احیائے علوم کی تحریک سے لے کر انیسویں صدی کے آغاز تک کم وبیش چار سو سال کا عرصہ نتائج کا حتمی ذمہ دار تھا۔

چودھویں صدی عیسوی میں احیائے علوم کی تحریک کا آغاز انسانی سماج پر قدیم کلیسائی عہد کے اثرات اور نتائج کا ازالہ اور خاتمہ تھا۔ پس اس تحریک نے اُس قدیم یونانی علمی اور فکری روایت کی طرف مراجعت کی جسے کلیسائی نظام نے کفر اور الحاد سے موسوم کیا ہوا تھا۔ پیٹرارک اور بوکاشیو جیسے جواں ہمت دانشوروں نے قدیم یونانی فلاسفہ کی کتابوں کو جمع کیا، لائبریریاں بنائیں، تراجم کرائے، بحث ومباحثے کیے، دوستوں کے حلقۂ اثر کو وسیع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پندرھویں صدی کے آغاز تک انسان کی فکری، فنی اور تخلیقی جہتوں کے نئے سوتے پھوٹنے لگے۔ قدیم یونان کی فکری اور تعقل پسند روایت کے احیا نے اٹلی کو یورپ کا علمی، فکری اور تہذیبی سطح پر ایک اہم ترین مرکز بنا دیا۔ رفتہ رفتہ ایک نئے انسان کا تصور اُبھرنے لگا کہ جس نے کلیسائی نظامِ فکر کی اپروچ کے متوازی اپنی حیثیت، مقام، مرتبے، صلاحیت، توانائی، اہلیت اور شعور کو خود متعین کیا۔ خیر اور شر کیا ہے؟ اب یہ اس کے اپنے ارادے اور انتخاب کا معاملہ بن گیا۔ ہدایت کے وہ مسلمہ اصول جنھیں کلیسائی نظام کی چھتری تلے تہذیب وتمدن کی بنیاد بنایا گیا تھا، نئے انسان نے نئے انسانی تمدن کی داغ بیل ڈالنے کے لیے ان کے متوازی سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر اپنی عقل اور شعور کے مطابق نئے اصولوں کو بتدریج خود متعین کرنے، انھیں توڑنے، بدلنے اور پھر بنانے کا ارتقائی اصول سیکھ لیا۔

فکرِ انسان جب اعتقادی متعینات و مسلّمات سے آزاد ہو گئی تو گویا فرد کی شخصیت اور اس کا کردار بھی آزاد ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنے سیاہ وسفید اور نتائج کا بھی تنہا ذمہ دار بنتا چلا گیا۔ تہذیب کے جکڑ بند روایتی نظام اور اس کی اجتماعیت کو اس سے شدید دھچکا پہنچا لیکن شاعروں، ادیبوں، فنکاروں، ہنرمندوں، سرمایہ داروں، سیاست دانوں، دانشوروں اور سائنسدانوں کے انفرادی کاموں نے یورپ میں انسانی بیداری کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ گویا قدیم یونان کی فکری روایت کی طرف مراجعت نے نئے انسان کو حقیقی فکری روایت کے ساتھ جوڑا اور پھر اسی کی بنیاد پر انسانیت کو ترقی کے اگلے

Scanned with CamScanner

مرحلے میں داخل کر دیا۔ اس انسان کو کسی نامعلوم باطنی ترقی سے کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ وہ باطنی ترقی کے نام پر صدہا سال سے مسلسل دھوکے میں رکھا گیا تھا۔ باطنی ترقی کی تعلیم نے اس کے مادی، تمدنی مظاہر کو پھپھوندی لگا دی تھی اور اس کے جمالیاتی ذوق کو جامد اور پست کر دیا تھا۔ گبرٹی، ڈوناٹیلو، لیونارڈو اور مائیکل انجیلو جیسے مصوروں اور سنگ تراشوں نے کلیسائی طرز کے بھدے گوتھک آرٹ کے مقابلے میں اپنے اختراعی ذہنوں اور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے حسن و جمال کی ایک نئی دنیا سے انسانیت کو متعارف کرایا۔ اس آرٹ کو ترقی دینے والوں میں بینکار، صنعت کار، تاجر، سرمایہ کار، بلدیہ کے اراکین اور بعض اہل کلیسا بھی شامل تھے۔ غرض نشاۃ الثانیہ کی اس لہر نے تمام بڑے طبقات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دوسری طرف عالمی سرمائے کے ارتکاز کے حصول کی خواہش نے مشرقی اقوام کی جانب پُرخطر بحری مہمات کو مہمیز دی، تجارت کے لیے نئے راستے دریافت ہونے لگے۔ دولت کی نئی چمک دمک نے عقائد کی رسی کو مزید ڈھیلا کر دیا اور اٹلی سمیت یورپ کے دیگر ممالک کو ہندیوں، چینیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کے ساتھ تجارت میں کوئی بھی نادیدہ رکاوٹ محسوس نہ ہوئی۔ سولھویں صدی تک آتے آتے فرانس، جرمنی، ہالینڈ اور سپین میں بھی نشاۃ الثانیہ کے علمی، فکری اور تمدنی فوائد کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کے پھیلاؤ، تجارت، بنکوں اور نئی نئی مالیاتی پالیسیوں کے ذریعے تجارتی و مالیاتی کمپنیوں کو زبردست فروغ حاصل ہونے لگا۔ جبکہ دوسری طرف اپنے اپنے مفادات کے حصول کے لیے تاجروں، صنعت کاروں، ہنرمندوں، پیشہ ور افراد، منتظمین اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے کاریگر مزدوروں کی گلڈز (انجمنیں) بننے لگیں۔ انھی گلڈز کے ذریعے جمہوری حقوق کا تصور بھی رفتہ رفتہ اجاگر ہونے لگا۔ نیا اشرافیہ طبقہ جو گلڈز کے سیاسی اراکین پر مشتمل تھا، اس نے جاگیرداری اشرافیہ کی جگہ لینا شروع کر دی۔

چھوٹے طبقات سے تعلق رکھنے والی مزدور انجمنوں کو شروع میں کسی قسم کے کوئی سیاسی حقوق حاصل نہ تھے۔ مزدوروں اور ان کی تنظیموں پر پابندیاں لگتی رہیں لیکن یہ دونوں چونکہ سرمایہ داری نظام کا بنیادی حصہ تھے لہٰذا انھیں بہت عرصے تک نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ فلورنس میں چودھویں صدی کے آخر تک ان کو بھی ووٹ کا حق حاصل ہو گیا۔ اسی کی تقلید آئندہ سو سالوں میں کسی نہ کسی طور پر باقی یورپ میں بھی ہونے لگی، تاہم غلاموں کے حقوق تو کیا، ان کی انسانی حیثیت کا تعین

Scanned with CamScanner

بھی بہت بعد میں کہیں جا کر ہوا۔

سترھویں صدی عیسوی میں اٹھارھویں صدی کے صنعتی سرمایہ دارانہ انقلاب کی بھر پور تیاری ہو چکی تھی۔ بادشاہوں اور جاگیرداری نظام میں نئے سرمایہ دار گروہوں، ان کی جماعتوں اور تنظیموں نے گہرے شگاف ڈال دیے تھے۔ نیا سرمایہ دارانہ سیاسی نظام اپنے پَر کھول چکا تھا۔ اس کی اقتدار میں شرکت ایک نئے نظامِ ریاست کی داغ بیل ڈال رہی تھی۔ اسی کے بڑھتے ہوئے عالمی رسوخ کے باعث نو آبادیات کی تلاش اور پھر ان پر براہ راست قبضے کو مہمیز ملی۔ پہلی اور دوسری عالمگیر جنگیں دراصل سرمایہ داری نظام پر غلبے کے لیے یورپی اقوام کے درمیان چھڑیں۔ نشاۃ الثانیہ یا تحریک احیائے علوم سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک مشرقی اقوام کی علمی، فکری، سیاسی، معاشی اور عسکری ساکھ کم و بیش ختم ہو چکی تھی۔ مشرق کی بیداری کا سورج اس پورے عرصے میں غروب ہو چکا تھا۔ ان کے علوم و فنون، فکر، فلسفے اور تمدن کی روایات متروک ہو چکی تھیں۔ اس پورے عرصے کے دوران مشرقی اقوام اس جدید تمدن کو استوار کرنے میں بری طرح ناکام رہیں جس کی بنیاد یورپ میں سائنسی علوم کے فروغ، ٹیکنالوجی اور صنعتی انقلاب کے ذریعے رکھی جا چکی تھی۔ روایتی اور فرسودہ نظامِ معیشت کسی قدر تجارتی سرمائے کے حصول کے لیے کارگر ہو سکتا تھا لیکن صنعتی سرمائے کے حصول کے لیے اس میں رتی بھر گنجائش نہ تھی۔ یہ مرحلہ صنعت کاری (Industrialisation) کے بغیر ناممکن تھا، جبکہ مشرق دستکاری کی سطح سے ابھی نہ اٹھا تھا۔ پس یہاں سے خام مال کے حصول کے لیے یورپی اقوام کا آپس میں جنگ کرنا ایک تاریخی نتیجہ تھا۔ خود مشرقی ریاستوں کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنی گرتی ہوئی معاشی ساکھ کو سنبھالا دینے کے لیے یورپی تجارتی کمپنیوں کے ساتھ تجارتی معاہدے کرتیں۔ چنانچہ صنعتی سرمایہ مزید وسعت اختیار کرنے لگا اور تجارتی دلالی میں مشرقی اقوام کی ریاستوں کو جو کچھ ملا اس سے کہیں زیادہ انھیں ادا کرنا پڑا۔ وہ سیاسی گروہ اور افراد جو اس تجارتی دلالی سے منھ کالا نہیں کرنا چاہتے تھے، وہ بھی سرمائے کی حقیقی طاقت یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی سے محروم تھے؛ چنانچہ نسل، زبان، خطے، خاندان، مذہب اور عقیدے کے امتیاز اور افتخار کی بنیاد پر معاشی استحقاق قائم کرنے کے لیے اٹھے اور بہت جلد اپنوں اور غیروں کی سازشوں، کوتاہ ہمتی، بے خبری، دھوکے، فریب اور طاقت کے غلط اندازوں کا شکار ہو کر مشرق کی تاریخ میں ہیرو قرار پائے۔

Scanned with CamScanner

مغربی سرمایہ داری نظام کی پرکار جس نقطے پر رکھی جاتی ہے وہ سرمایہ ہے؛ صرف اسی کے گرد انسانیت، مساوات، جمہوریت، انسانی حقوق، تعلیم، روزگار، صحت، رہائش، تجربہ گاہیں، سکول، کالج، یونیورسٹیاں، سڑکیں، عمارات، شہری زندگی، قوانین، رسائل، کتب، فلسفے، تمدنی مظاہر سے لے کر تہذیب تک کا دائرہ تشکیل پاتا ہے۔ دنیاوی ترقی، آسودگی، مسرت، محنت، جدوجہد، اختراع، تخلیق، سیاست، معیشت اور انتظام و انصرام سے متعلق امور اور اخلاقی اقدار کی نشوونما سب کا بنیادی محرک سرمایہ ہے۔ انسان ہی چونکہ اس تمام ترعمل کا ذمہ دار ہے، یہی وجہ ہے کہ نفرت، انتقام، حسد اور لالچ جیسے امراض بھی اسی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ دنیاوی اور مادی ترقی انسان کے لیے دیوتاؤں نے آسمان سے نازل نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ انسان ہی اس بات کا ذمہ دار ہے کہ وہ روایات، اقدار، اخلاقیات اور قوانین کی تشکیل بھی خود کرے۔ انسان اور اس کا اپنا بنایا ہوا مادی تمدن ہمیشہ ارتقاپذیر رہتا ہے، لہٰذا اس تمدن سے متعلق وہ کوئی حتمی اور آفاقی اصول بھی دریافت نہیں کرسکتا۔ جیسے جیسے مادی تمدن کے مظاہر بدلتے چلے جاتے ہیں ویسے ویسے سچائیوں کے نئے دَر وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسان ابھی محوِ سفر ہے؛ وہ کسی آفاقی منزل کی جستجو میں سرگرداں نہیں ہے۔ اسے اپنے مادی تمدن کی ضروریات نو بہ نو صورت حال سے دوچار رکھتی ہیں اور وہ انھی کے حل کے لیے ایک بے انت مستقبل کی بنیادیں بتدریج رکھتا چلا جارہا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ سرمایہ ہمیشہ چند امیروں، طبقاتِ اعلیٰ یا آج کے دور کی اصطلاح میں چند ملٹی نیشنلز کے پاس رہا ہے، لیکن ساری دنیا میں انسانی زندگی کی ہماہمی ان چند امیروں اور ملٹی نیشنلز کے ذہنِ عظیم کی پیداوار نہیں ہے بلکہ مختلف طبقات — جن میں سائنس دان، ہنرمند، مزدور، انجینئر، ڈاکٹر، پروفیسر، وکیل، دانشور، ادیب، صحافی اور محقق وغیرہ شامل ہیں — سب انسانی تمدن کی تشکیل میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا حصہ ڈالتے ہیں۔ اسی طرح سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت اور دیگر تمام علوم و فنون بھی اپنے اپنے حصے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ سیاسی، سماجی اور معاشی ادارے اور ان سے منسلک افراد محض امیروں کی جیبیں بھرنے کے لیے صبح سے شام نہیں کرتے بلکہ خود ان کی تسکین اپنی صلاحیتوں کے بہترین استعمال میں مضمر ہے۔ یوں پورا انسانی نظامِ زندگی عالمی سطح پر رواں دواں رہتا ہے۔ یہ کہہ دینا کہ تمام سرمایہ دار فراڈیے اور تمام مزدور، کسان، وکیل، طالب علم، پروفیسر، انجینئر،

Scanned with CamScanner

سائنس دان، ادیب، منیجر، محقق، ریاضی دان، فلاسفر اور علوم فنون کے سارے ماہرین دھوکے میں رکھے گئے یا بیوقوفوں کی ایک فوج ظفر موج ہیں — تو اس سے آخر کیا مطلب لیا جائے؟ ظاہر ہے کہ انسانی جدوجہد کی تاریخ کے ساتھ اس سے بڑا مذاق اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ پٹرول کی قیمتیں بڑھنے سے جن ممالک میں آٹا، دال اور چینی مہنگی ہو جاتی ہے ان ممالک اور ان کے عوام کو ابھی اپنی ریاستی ترجیحات کے تعین پر نئے سرے سے غور کرنا ہوگا۔ ان ممالک میں غربت اور افلاس کا بڑھتا ہوا گراف سیاسی زوال کی علامت ہے؛ وہ سیاسی زوال کہ جس کے سامنے یہ اقوام بے دست و پا ہیں۔ ابھی یہاں معاشی حقوق کے حصول کی جدوجہد کے لیے عوامی سطح پر سیاسی بیداری کا موثر آغاز نہیں ہوا۔ یہاں بھی جب تک انسانی تمدن کی پرکار کو سرمائے کے مرکز پر رکھ کر تہذیب کا دائرہ تشکیل نہیں دیا جائے گا، صورت حال میں بڑی تبدیلی مستقبل قریب میں ناممکن ہے۔ ''سرمایہ دار مردہ باد'' کے نعرے کی سنسنی عموماً سرمائے کی طاقت اور اس کے مادی زندگی میں اثر و رسوخ کو ذہن سے محو کر دیتی ہے، جبکہ سرمایہ ہی انسان کی مادی زندگی کا بدل ہے۔ کل نہ آج، کوئی بھی قوم دوسری قوم پر اس لیے نہیں چڑھ دوڑی تھی کہ وہاں کوئی اعلیٰ اخلاقی یا سماوی نظام تمدن قائم کرنا تھا بلکہ سرمائے کا زیادہ سے زیادہ حصول ہی تمام مقاصد میں مقصدِ اولیٰ رہا تھا اور ہے۔ یہ ایک تاریخی سچائی ہے جو مفتوح کے لیے بہت تلخ اور فاتح کے لیے شیریں ہے۔ انسانی دانش کا کمال یہ ہے کہ وہ ان ذائقوں میں تمیز کرے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایک عظیم ترین دورِ فتوحات ختم ہوگیا۔ بڑی جنگوں کے سلسلے جو معاشی حوالوں سے جارح اور براہ راست توسیع پسندانہ عزائم کے حامل ہوا کرتے تھے، ان کی شکل بالکل بدل گئی۔ کم از کم یورپ کی حد تک ایسی لڑائیوں کا سلسلہ رک گیا۔ یورپ نے وہ سبق سیکھ لیا جو سرمایہ داری نظام کے کُل نے اسے سمجھایا تھا۔ اب جدوجہد کا میدان عسکری طاقت میں برتری نہیں تھا بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی، جمہوری اداروں کا فروغ، انسانی حقوق کا تحفظ، بڑے پیمانے پر صنعت کاری اور سیاسی مکالمے کے ذریعے عالمی منڈیوں تک رسائی تھا۔ اس سب کے نتیجے میں آئندہ چند ہی برسوں میں یورپ کی کم وبیش تمام ریاستوں نے فلاحی ریاست کا ہدف پورا کرلیا۔ اس ہدف کے حصول میں ایک بڑا حصہ جنگی اسلحے اور سازوسامان کو مشرقی ممالک میں فروخت کا تھا۔ سرمائے کے حصول کا یورپ کے لیے یہ سب سے آسان اور محفوظ ذریعہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ مشرق

ممالک نے آخر اتنا ڈھیروں اسلحہ کہاں سے خریدا؟ ظاہر ہے کہ خود مشرقی ممالک کے پاس اتنے وسائل تھے کہ وہ یورپی ممالک سے مسلسل اسلحہ خریدتے رہے اور ان کی قومی آمدنیوں کا ایک بہت بڑا حصہ فوجی اور عسکری مصارف پر اُٹھتا رہا۔ یورپ نے تو اسلحے کی فروخت سے حاصل ہونے والے سرمائے کو فلاحی ریاست کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے پر صرف کیا، لیکن مشرقی اقوام نے اس اسلحے سے مصنوعات کی فیکٹریاں تو نہیں لگائی تھیں — اسلحے کے یہ ذخائر نصف صدی سے ڈمپ پڑے ہوئے ہیں، جن کی شکست و ریخت کے اخراجات بھی جاری و ساری رہتے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی سے اسلحے کے یہ بڑے ذخائر جوں کے توں پڑے ہیں اور کوئی بھی بڑی جنگ نہیں لڑی گئی۔ مشرقی ریاستوں کو ان غیر پیداواری شعبوں پر کثیر سرمائے کے اسراف نے معاشی حوالے سے ایک خاص سطح سے اٹھنے نہ دیا۔ مشرقی ممالک میں آج بھی بے پناہ مادی، معدنی اور انسانی وسائل موجود ہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں کروڑہا لوگ اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ لوگ دن رات محنت کرتے ہیں اور اپنی اور آئندہ آنے والی نسلوں کے تحفظ کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں اپنی صلاحیتوں اور مہارتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔ وہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں وہی علوم پڑھ رہے ہیں جو یورپ میں پڑھائے جا رہے ہیں، یہاں خواندگی کا تناسب بھی بڑھ رہا ہے، لیکن پھر بھی ترقی پذیر یا پسماندہ ہیں۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ بیشتر مشرقی ممالک کی قومی آمدنیاں غیر پیداواری شعبوں خصوصاً افواج اور سامانِ حرب پر صرف ہو جاتی ہیں۔ بادشاہتیں، فوجی اور نیم فوجی حکومتیں اور جاگیردارانہ روایات مشرقی ممالک میں اس نوع کی حکمت عملی کے براہ راست ذمہ دار ہیں۔ ان قوتوں سے نجات کا مطلب سرمائے کو سماجی اور معاشی زندگی کے شعبوں میں کھپا کر مزید سرمائے کا حصول ہے۔ مزید سرمایہ ترقی اور خوشحالی کے نئے دروازے خود بخود کھولتا چلا جاتا ہے۔ یورپ نے یہی کیا؛ مشرقی اقوام کو بھی یہی کرنا ہوگا۔ سرمایہ داری نظام کے جدید مارکیٹ اکانومی کے تصور نے مشرق کی بعض ریاستوں خصوصاً چین، انڈونیشیا، ملائیشیا، تائیوان، ہانگ کانگ اور کوریا کو جو درس دیا اس کے نتائج ان ممالک نے بھرپور طریقے سے حاصل کیے۔ ان ممالک میں محض دو تین دہائیوں میں عظیم انقلابات رونما ہوئے اور وہ ترقی اور خوشحالی کی دوڑ میں یورپ کے کسی قدر ہم قدم ہو چکے ہیں۔

Scanned with CamScanner

مندرجہ بالا سطور میں انتہائی اختصار کے ساتھ یورپ اور سرمایہ داری نظام کا جو تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے اس کا مقصد تمدنِ جدید، یورپ، سرمایہ داری نظام، ہندوستان اور عالمِ اسلام سے متعلق فکرِ اقبال کا احاطہ کرنا ہے اور اس حوالے سے اقبال نے جن خدشات اور امکانات کی نشاندہی کی تھی ان کا جائزہ لینا ہے۔

2

اقبال کی ابتدائی دور کی شاعری پر اگر نگاہ دوڑائی جائے تو وہ ہمیں ایک رومان پسند آدمی دکھائی دیتے ہیں، ایک سرور بخش یاسیت ان کے قلب وذہن پر چھائی دکھائی دیتی ہے۔ اس دور کی شاعری اپنی رومانوی فضا اور دردمندی کے باعث دلوں کو موہ لیتی ہے۔ یہاں دنیا کے غم کا کانٹا ان کے دل کو کبھی بے چین، کبھی بے قرار، کبھی مایوس تو کبھی متفکر کر دیتا ہے۔ پناہ کی غرض سے وہ شہری تمدن سے کہیں دور فطرت کی گود میں بسیرا کرنے کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر کا جوشِ طبیعت کسی قدیم سادہ طرزِ زندگی کی طرف مراجعت کی خواہش رکھتا ہے۔ ان کی نظمیں ''ہمالہ'' اور ''ایک آرزو'' اس کی بہترین مثالیں ہیں:

اے ہمالہ داستاں اُس وقت کی کوئی سنا — مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح وشام تُو — دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو

(''ہمالہ'')

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں، عزلت میں دن گزاروں — دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

(''ایک آرزو'')

تہذیبی اور تمدنی زندگی سے گریز کی یہ خواہش محض شاعر کی اپنی افتادِ طبع کا معاملہ نہ تھا بلکہ

Scanned with CamScanner

زندگی، موت، کائنات، انسان، مظاہر فطرت، سورج، چاند، ستارے اور کہکشائیں، یہ سب کیا ہیں، اور ان کا باہمی ربط کیا ہے؟ اقبال یہ جاننے کی آرزو بھی رکھتے ہیں۔ شاعر کی حیرانی اور رازِ حیات کو پا لینے کی خواہش اور جستجو کسی حتمی نتیجے تک لے جانے میں ناکام رہتی ہے تو اس ناکامی کے پہلو بہ پہلو دیگر مخلوقات اور جانداروں کے مقابلے میں اقبال کو انسان کی عظمت کا معترف ہونا پڑتا ہے کہ یہ بھید وہ نہیں پا سکا لیکن اس کے سوا بھی تو کوئی نہیں پا سکتا۔ اپنی نظم ''انسان'' میں کہتے ہیں:

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں
انسان کی ہر قوت سرگرمِ تقاضا ہے
اس ذرّے کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہردم
یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

(''انسان'')

لیکن اِس دانا، بینا اور توانا ہستی کے پاس کائنات، انسان اور انسانی تمدن کو سمجھنے کے لیے اور ان کے ربط کی ماہیت کو جاننے کے لیے کائنات، انسان اور انسانی تمدن کے معروضی مطالعے، مشاہدے اور علم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کی جانکاری محض اتنی ہی بڑھتی ہے جتنی کہ محض معروضی مطالعے، مشاہدے اور علم کے ذریعے بڑھ جاتی ہے۔ انسانی علم کچھ نتائج اشیا اور اپنے سمیت دیگر جاندار مخلوقات کے ظاہر، ان کے خدوخال اور دیگر اشیا اور جانداروں کے ساتھ بظاہر دکھائی دینے والے تعلق سے حاصل کرتا ہے اور کچھ نتائج جانداروں اور اشیا کی اندرونی ماہیت سے متعلق جانکاری سے حاصل کرتا ہے۔ غرض انسان ایک وقت میں کائنات کے جاندار اور بے جان مظاہر اور ان کے درمیان تعلق کے لامحدود حیاتی چکر کے ایک چھوٹے سے گوشے یا حصے کو سمجھنے اور پرکھنے کی جستجو کرتا ہے۔ مثلاً وہ جانتا ہے کہ کائنات میں بہت سی اشیا پیدا ہوتی ہیں، پھلتی پھولتی ہیں اور پھر معدوم ہو جاتی ہیں۔ بہت سی اشیا ثابت و سالم رہتی ہیں اور بہت سی اشیا ٹوٹتی پھوٹتی اور شکست و ریخت کے طویل دورانیے سے گزرتی رہتی ہیں۔ بہت سی جاندار مخلوقات جو کبھی ہوا کرتی تھیں، وقت نے ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا، اب ان کے محض آثار باقی ہیں۔ یہ علم کسی باطنی عقیدے، تصور یا وجدان کے نتیجے میں حاصل نہیں ہوتا —— ورنہ نہ سائنسی علوم وفنون کی ضرورت رہ جاتی اور نہ ہی انسانی تمدن کی پیش رفت کے لیے معروضی حقائق کی جستجو برقرار رہتی۔ باطنی انکشاف چونکہ ظاہری تجربے کے نکتوں اور باریکیوں سے یکسر محروم ہوتا ہے،

Scanned with CamScanner

یہی وجہ ہے کہ انسانی تمدن کے مادی ارتقا میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ایٹم کے ذرے کو توڑے بغیر اس کی ماہیت کا علم انسان حاصل ہی نہیں کرسکتا، پس انسانی تجربہ ہی ایٹم کی طاقت کو دریافت کرنے پر قادر ہوسکتا ہے۔ اقبال کا ''دانا اور بینا انسان'' اس عظیم تر حقیقت کے اس ایک انتہائی چھوٹے سے جزو سے بھی گریز کا راستہ اختیار کرتا ہے چہ جائیکہ وہ حقیقتِ مطلق کے راز سے آگاہ ہو جائے۔ اقبال ''سرگزشتِ آدم'' میں حقیقت اور باطنی انکشاف کی اسی دوئی کے باعث افسردہ بھی ہیں اور مجسم حیرت بھی:

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئنۂ عقلِ دوربیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں کو، برقِ مضطر کو
بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے
مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہہِ نگیں میں نے
ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اُسے مکیں میں نے

گویا خرد کا سارا اثاثہ چشمِ مظاہر پرست کی دین ہوتا ہے مگر یہ رازِ ہستی سے آگاہی میں ناکافی ہوتا ہے۔ انسانی جستجو جو چشمِ مظاہر پرست کے ذریعے کائنات اور اس کے مظاہر کو دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہے، اس کا مقصد کسی عظیم ترین رازِ ہستی کو پانا نہیں ہوتا، کیونکہ چشمِ مظاہر پرست جانتی ہے کہ کائنات اس قدر وسیع، ہمہ گیر اور اپنے مظاہر میں مناسبات، تضادات، تعلقات اور اشتراکات کی اس قدر نوع بہ نوع صورتیں رکھتی ہے کہ اس کے دائرۂ تکمیل سے متعلق رائے دینا محض دعوائے خام ہے۔ یہ چشم جتنا کچھ دیکھتی ہے اُتنا ہی جانتی ہے؛ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ اس کے موجود دائرۂ وسعت سے باہر ہوتا ہے۔ اقبال نے چشمِ مظاہر پرست سے جو توقع کی تھی وہ اصولی طور پر غلط تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کو خانۂ دل میں رازِ ہستی منکشف ہوا۔ ہماری مخصوص علمی روایت میں دل ایک ایسا مقام سمجھا جاتا ہے جس کے انکشاف میں انسانی عقل، تدبر، عمل اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دل ہمیشہ، انسانی تمدن کے معروضی اور مادی علم پر مبنی افکار کے متضاد، اپنے تصورات اور خیالات کی دنیا کو منکشف کرتا ہے۔ انسان کا مادی تمدن، کائنات اور اس کے مادی مظاہر

Scanned with CamScanner

کی بے ثباتی ایسے تصورات کے رگ و ریشے میں مقدس خون بن کر دوڑتی ہے۔ انسانی تمدن اور کائنات کے مظاہر اس لیے بے معنی نہیں ہوتے کہ انسان ان کے درمیان موجود ربط، تضاد یا اشتراک کو سمجھنے کی اہلیت اور لیاقت سے محروم ہوتا ہے، بلکہ بے معنی اس لیے قرار دیے جاتے ہیں کہ انسانی علم، مطالعے، مشاہدے اور جستجو کو بطورِ اصول کار بیکار سمجھا جانے لگتا ہے۔ اقبال بھی اسی اصول کے گرویدہ ہیں۔ اس کی بہترین مثال ان کی نظم ''خفتگانِ خاک سے استفسار'' ہے۔ زندہ انسانوں کی صحبت تو ان کے سوالوں کی تشفی نہیں کر پاتی چنانچہ خفتگانِ خاک سے استفسار کرتے ہیں۔ انسانی زندگی کا انجام چونکہ موت ہے، انسانی علم اور عقل و فہم نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن اقبال کو جب ابدیت کی خواہش چڑ کے لگاتی ہے تو وہ ان زندہ انسانوں کو خاطر میں نہیں لاتے جو ابدیت کی خواہش کی بجائے اِسی زندگی کے شب و روز میں الجھے رہتے ہیں اور اپنی موت کی حقیقت سے آگاہ ہو کر ہر دم رستخیزِ حیات میں سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ اقبال ایسے انسانوں سے استفسار کرتے ہیں جو سوال و جواب کے تمام چکروں سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اقبال زندہ انسانوں کی تڑپ، جستجو، جدوجہد کی دنیا کو ''قتیلِ ذوقِ استفہام'' سمجھتے ہیں، کائنات کو ایک اندھیر نگری سمجھتے ہیں، اور ان کی ابدیت کی خواہش کائنات کے ہر مظہر کی نفی کر دیتی ہے، جبکہ اقبال بھول جاتے ہیں کہ کائنات کا ہونا بجائے خود ایک عظیم ترین اثبات ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا — واں بھی انساں ہے قتیلِ ذوقِ استفہام کیا
آہ! وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے — یا محبت کی تجلّی سے سراپا نُور ہے
تم بتا دو راز جو اِس گنبدِ گرداں میں ہے — موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

(''خفتگانِ خاک سے استفسار'')

ظاہر ہے کہ انسانی عقل کو ایسے سوالات سے جن کا معروضی حقائق کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔ تمام انسانی عقلی علوم کی بنیاد معروضی اور مادی تجربے، مشاہدے اور مطالعے پر ہوتی ہے اور ایسے تمام تصورات جو اس واحد کڑے معیار پر پورے نہیں اترتے، اوہام کی ذیل میں چلے جاتے ہیں یا باطنی علوم کے ماہرین عقلی دلائل کے زور پر ان کی پرکھ پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ وہ عقل محض کو بروئے کار لاتے ہیں اور مادی و معروضی سطح پر تجربے اور مشاہدے کو دخل اندازی کی اجازت

Scanned with CamScanner

نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک عقلی تجربے اور مشاہدے سے گزرا ہوا علم خام اور ناپختہ ہوتا ہے لہٰذا جب تک اسے عقلِ محض، وجدان، باطن یا معرفت کا تڑکا نہ لگے اس وقت تک تجربے اور مشاہدے سے گزرا ہوا معروضی علم یا اندازِ فکر کی سائنسی تشکیل بے مزہ اور کرکری رہ جاتی ہے۔ اقبال اسی نقطۂ نظر کی واشگاف حمایت کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''عقل و دل'' ایک عمدہ مثال ہے۔ دل عقل کے روبرو ہو کر اسے کہتا ہے:

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے   اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے   تُو خدا جو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے باکی   اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

بہ تغیرِ الفاظ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے   خرد کیا ہے چراغ راہ گزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا   چراغ رہگزر کو کیا خبر ہے

عقل مظاہر کی پرستش نہیں کرتی بلکہ مختلف اقوام میں تو مظاہر کو عقائد نے دیوتا کا درجہ دیا ہے۔ عقل مظاہر میں دلچسپی اس لیے لیتی ہے تاکہ اس کے ظاہر کے متعینات اور امکانات سے آگاہ ہو سکے۔ پھر یہاں محض ظاہر داری نہیں چلتی بلکہ عقل ان مظاہر کے اجزا کی Decodification کر کے مختلف اجزا کی خاصیتوں، توانائیوں اور بعض اجزا کے بعض ذیلی حصوں کو کائنات کے متوازی انسان کے مادی تمدن کی تعمیر و تشکیل میں بروئے کار بھی لاتی ہے۔ مظاہر کا باطن ان اجزا کے سوا اور کہیں نہیں ہوتا۔ اس علم کو معرفت نہیں سمجھا جاتا اور معرفت کہیں اور ہی دریافت کی جاتی ہے۔ وہ کہاں ہوتی ہے؟ مادی زندگی کی تفہیم اور اس کے مظاہر میں تمیز کرنے والی زبان اس کو بیان کرنے سے بھی معذور ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معرفت کی ذیل میں جو کچھ الفاظ کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے اس کے وہ معانی بھی نہیں سمجھے جاتے کہ جن کا احاطہ معروضی مادی زندگی سے متصف زبان کرتی ہے۔ پس ''درونِ خانہ'' ہنگاموں کی خبر خرد کو کبھی بھی نہیں ہو پاتی۔ یہ المیہ خرد کا نہیں بلکہ معرفت کا ہے۔ اقبال اگر علم کی انتہا کو بے باکی کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہیں، اور اُن کا اسے مرض قرار دینا بھی بے جا نہیں، کیونکہ علم معرفت کے سربستہ یا خفیہ رازوں کے بخیے ادھیڑ دیتا ہے۔

Scanned with CamScanner

3

انسان بنیادی طور پر مادیت پسند واقع ہوا ہے۔ اگر اسے روحانیات سے اتنی ہی زیادہ گہری اور سنجیدہ دلچسپی ہوتی تو مادی تمدن کی جدید ترین عمارات تک کے سفر کی اسے کوئی حاجت نہ ہوتی۔ روحانیت کا فلسفہ مادی زندگی کی ترقی کو حقارت کی نگاہ سے اس لیے دیکھتا ہے کہ اس کے باعث روحانی ترقی کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے، جبکہ انسان مادی زندگی میں ترقی کی خواہش اس لیے کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مادی زندگی کی تعمیر و ترقی ہی ہر مرض اور ہر دکھ کا ازالہ کرنے میں حقیقی اور عملی سرگرمی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ پس انسانی سماج میں جیسے جیسے مادی ترقی کا دائرۂ کار وسیع ہوتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے روحانی ترقی رو بہ زوال ہوتی چلی جاتی ہے۔ روحانی ترقی کا زوال اگر کبھی اس کے تہذیبی حافظے کو کچوکے لگاتا بھی ہے تو بعض رسمیات کی ادائیگی کے فوراً بعد وہ دوبارہ اپنے ڈھرے پر آ جاتا ہے۔ پھر وہی مادی زندگی، اس کا جوش، آرزوئیں، تفکر، تدبر، کوشش، عمل اور تحریک، سب کے سب لوٹ آتے ہیں۔ مادی علوم و فنون کی تعلیم چونکہ مزید مادی ترقی کا باعث بنتی ہے، اور مزید مادی ترقی چونکہ روحانیت کا مزید صفایا کر دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال جدید تعلیم اور مادی ترقی کے زبردست ناقد ہیں۔ اس بات پر آئندہ سطور میں بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ مادی علوم و فنون اور ان کے باعث مادی تمدن میں ہونے والی ترقی جن تہذیبی اقدار اور روایات کو فروغ دیتی ہے ان تمام میں سائنسی معقولیت پسندی کا رجحان غالب ہوتا ہے۔ یہ رجحان عظیم روحانی یا باطنی دعووں کو خاطر میں لائے بغیر انسانی تہذیب و تمدن کو اپنی شاہراہ پر لے آتا ہے۔ سائنسی معقولیت کو روحانی دعووں سے رجوع کرنے کی اصولی طور پر کوئی ضرورت نہیں رہتی، اور نہ ہی وہ ایسا کرتی ہے۔ البتہ مذہبی، روحانی اور صوفیانہ فکر اور مسالک سے وابستہ حکما، فلاسفہ اور محققین کے لیے — کلامی مباحث کے اشاریے تیار کرنے اور جدید مادی تمدن کی ''پست'' گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے انسانوں کو ایسے فلسفے کی معقولیت کے جواز فراہم کرنے میں — سائنسی انکشافات اور اسناد سے رجوع کرنا مجبوری بن جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

عقل کائنات کے مادی مظاہر اور ان میں چھپے اسرار و رموز سے آگاہی میں دلچسپی رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ عقل انسانی تمدن کے لیے جو اساس بناتی ہے اس کی بنیاد بھی مادیت پسند فکر پر رکھتی ہے۔ روزگار، صحت، تعلیم، رہائش، ریاستی قوانین، شہری زندگی کی سہولیات اور دیگر تمام معاملات میں یہی مادیت پسند فکر جلوہ گر ہوتی ہے۔ دنیاوی زندگی میں ترتیب اور نظم وضبط کے تمام اصول مادی سطح پر وضع کیے جاتے ہیں تاکہ انسان کی دنیاوی مادی زندگی میں کوئی بڑا خلل پیدا نہ ہو سکے۔ انسانی حقوق سے متعلق تمام مسلمہ تصورات انسان کی مادی زندگی اور اس کے مادی تمدن کے تحفظ کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ مابعد الطبیعیاتی تصورات اور خیالات کا براہ راست یا بالواسطہ طور پر انسان کی مادی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایسے تمام تصورات چونکہ انسان کی مادی زندگی کے تاروپود پر اثر انداز نہیں ہوتے اس لیے یہ تصورات، کائنات کی مادی سطح سے ماورا جن حقائق کو افشا کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ حقائق انسان کے مادی تمدن میں ہمیشہ تنہائی کا شکار رہتے ہیں۔ ان کا ربط انسان کی مادی زندگی کے ساتھ مسلسل کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ غار کی کنج میں بیٹھے ہوئے انسانوں کو یقیناً دیوتاؤں کی ضرورت تھی کیونکہ ان کی بے بسی کا ازالہ اس کے سوا ممکن ہی نہ تھا؛ دیوتاؤں سے متعلق 'اساطیری مابعد الطبیعیات' نے خود ان کے اپنے حوصلے، ہمت اور طاقت کی جگہ لے لی تھی۔ لیکن جب انسان نے اپنی اور آنے والی نسلوں کے تحفظ کے لیے خود اپنی اہلیت، لیاقت اور صلاحیت کی آزمائش کے لیے اپنے مادی تمدن کو خود اپنے ہاتھوں استوار کرنا سیکھ لیا تب اسے پتا چلا کہ وہ تمدن جسے اس نے اپنے خونِ جگر سے کشید کیا تھا، اس کی حقیقت کا منکشف کوئی اور نہیں، وہ خود ہے۔ اسی انکشاف کے باعث انسان کے اپنے تعمیر کردہ مادی تمدن نے مابعد الطبیعیات کی جگہ لے لی۔ انسان اپنی ساری زندگی دیوتاؤں کی مرضی اور منشا سے بے نیاز ہو کر اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں اور خدمات کے ذریعے اپنے مادی تمدن کی آبیاری میں بسر کر دیتا ہے۔ انسان کی مادی زندگی میں بچے کھچے عقائد کا شیشہ پاش پاش ہو کر رہ گیا ہے۔ اقبال کو مومن اور عالم اسلام سے گلہ یہی ہے کہ اس نے روحِ مشرق، مذہب، عقائد یا روحانیت سے روگردانی اختیار کی ہے اور مغربی تعلیم چونکہ منبع مادیت ہے، یہی وجہ ہے کہ اس طرف رجوع نے اسے اصولِ دینداری یا عقائد سے دور کر دیا ہے۔ گویا جدید مغربی تعلیم سے جتنی زیادہ رغبت بڑھتی چلی گئی اتنی ہی زیادہ عقائد کی روح کمزور پڑتی چلی گئی۔ گویا

Scanned with CamScanner

روحانیت اور عقائد کی دشمن مادی تعلیم ہے — اگر مادی علوم وفنون کی تحصیل کی طرف امت مائل نہ ہوتی تو شاید اس کے عقائد محفوظ رہتے۔ اقبال کھلے لفظوں میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

تعلیم پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ ناداں ہیں جن کو ہستیِ غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش
محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی اس دور میں ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش
(''مذہب'')

یہاں اقبال نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ علومِ جدید کی بنیاد چونکہ محسوس پر ہے لہٰذا وہ روایت پر یقین کی بجائے کسی بھی پیکر کو تجربے، مشاہدے اور خصوصی مطالعے کے بغیر تسلیم نہیں کرتے۔ اقبال کے نزدیک جدید علوم کا یہ خرد افروز سرچشمہ باطن کی بجائے خارج کے جس جہانِ معنی سے پھوٹا ہے اس کی تعلیم نے ہستیِ غائب کی تلاش کو ممنوع کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شیشۂ عقائد جو باطن کی راہ سے ایک نامحسوس دنیا دکھاتا ہے، پاش پاش ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب علم حواس کو بنیاد بنائے گا تو لامحالہ اسے مادی دنیا کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اور تمام علوم وفنون جو اس بنیاد پر ترقی پذیر ہوں گے ان میں مسلسل دلچسپی عقائد کے باطنی نظام پر بوجھ بن جائے گی۔ فکرِ اقبال کا المیہ یہ ہے کہ مادی علوم وفنون کی ترقی کی وہ روایت جو ساکت وجامد مذہبی روایت کے متوازی مسلسل ارتقا پذیر رہی، اس کے متعلق ان کا علمی رویہ تعصبانہ اور جارحانہ رہا ہے۔ اقبال جدید تعلیم میں مادیت کے عنصر کے بار پا جانے کے باعث اس پر الحاد کا فتویٰ صادر کر کے اپنے اندر کے رجعت پسند انسان کو مطمئن کر دیتے ہیں:

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
(''تعلیم اور اس کے نتائج'')

طبیعیات، کیمیا، ریاضی، ارضیات، جغرافیہ، حیاتیات، فلکیات، سیاسیات، معاشیات، سماجیات، غرض علوم کے تمام جدید شعبوں میں تحقیق اور درس وتدریس کا مقصد کفر والحاد یا ایمان ویقین سے متعلق تعلیمات پر شرح لکھنا نہیں ہے بلکہ یہ تمام علوم خطۂ ارض اور کائنات کے مادی مظاہر کو سمجھنے، ان کے اسرار ورموز کو دریافت کرنے، انھیں انسان کے مادی تمدن کی تعمیر میں بروئے کار لانے اور عقلِ انسانی

Scanned with CamScanner

کو خود آگاہ بنانے کی انسانی کوشش میں مدد دیتے ہیں۔ ان مادی علوم کو کفر و الحاد یا ایمان و یقین سے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہر علم کے ہر شعبے کی بنیاد خود اپنے وضع کردہ علمی دائرۂ کار اور فکری نظام پر ہوتی ہے، کفر یا ایمان کے متعلق تصورات سے مستعار نہیں ہوتی۔ پس اقبال نے ان علوم کے اثرات کے متعلق غلط نتائج اخذ کیے ہیں۔ ہمیں اس بات پر شدید حیرت ہوتی ہے کہ اپنے پورے کلام میں اقبال نے عقائد کی کمزوری کے اسباب کو کہیں بھی خود عقائد میں دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی اور اپنی شاعری میں کم و بیش سارا ملبہ جدید علوم، جدید معاشرت، جدید تہذیب اور مادی تمدن پر گرا دیا، اور خود ہی عجیب و غریب نتائج اخذ کر لیے۔ اپنی ایک نظم ''تہذیبِ حاضر'' میں یوں شعلہ بیاں ہوتے ہیں:

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں
بھڑک اُٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی

کیا ذرّے کو جگنو دے کے تابِ مستعار اُس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتابِ جلوہ فرما کی

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بے باکی

اسی نظم میں آگے چل کر خود ہی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خودفروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

(''تہذیبِ حاضر'')

اس پوری نظم میں تہذیبِ حاضر سے متعلق ایک شدید تمسخر انگیز طنزیہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ اقبال کو مسلم کے خستہ تنِ خاکی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؛ اس کے مادی وجود کی بقا سے اقبال کو کراہت ہوتی ہے۔ اس وجود کی سیاسی، سماجی اور معاشی احتیاجات کو اقبال یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ روحانیت کے نام پر اسے جس موج میں غرق رکھا گیا اس نے مسلم کے وجود کے تمام تخلیقی سوتے خشک کر دیے، علوم و فنون میں دلچسپی سے محروم کر دیا اور تقلید پرستی نے اسے محکوم بنا دیا۔ اب جبکہ تہذیبِ حاضر نے اس کے تنِ خاکی میں رعنائی، بیداری، آزادی اور بے باکی کی موج دوڑا دی تو اقبال نے اسے قلبِ مومن کے خلاف گہری سازش قرار دے دیا، کہ قلبِ مومن کو جدید ترقیات راس نہیں آ سکتیں۔ وہ ان انسانی ترقیات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ آخر اقبال مسلم سے کیا چاہتے ہیں؟ اقبال کو خود بھی معلوم نہیں ہے۔ یہی مخمصہ ان کی بہت سی نظموں میں اعتراف کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ آزادی اور بیداری

Scanned with CamScanner

کے نتیجے میں تہذیبِ حاضر پر جو اثرات مرتب ہوئے، اقبال نے ان کے نتائج بھی غلط نکالے ہیں اور عصرِ حاضر کی اچھی باتوں کو غلط عنوانات دیے ہیں۔ جسے رقابت کہا گیا ہے وہ رقابت نہیں بلکہ مقابلے کا رجحان ہے۔ ہر فرد اپنی پوری آزادی اور علمی، تحقیقی و فکری بیداری کو بروئے کار لاتے ہوئے جہاں تمدنِ جدید کو ترقی دیتا ہے وہاں اپنی ذاتی زندگی کی مادی مسرتوں سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ جسے خود فروشی کہا گیا ہے وہ دراصل اپنے تہذیب و تمدن اور اُس کے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام پر مکمل اعتماد کا مظہر ہے، کہ جمہوری، سیاسی اور معاشی ادارے پورے سماج کے تحفظ کی تگ و دو میں ہیں۔ جسے ناشکیبائی کہا گیا ہے وہ انسان کا دراصل اپنے فن، تخلیق، علم، تجربے اور مشاہدے سے عدم اطمینان ہے۔ ہر لحہ بدلتی ہوئی نو بہ نو صورتِ حال اسے آتش زیرِ پا رکھتی ہے۔ وہ انسانی تمدن کے نئے امکانات کی جستجو میں مضطرب رہتا ہے۔ اقبال نے جسے ہوس کا نام دیا ہے وہ دراصل عصرِ حاضر کے ہر انسان کی خواہش ہے کہ وہ مزید ترقی کرے، اپنے لیے اور اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کے تحفظ کے لیے۔ ظاہر ہے کہ تہذیبِ حاضر کی یہ تمام خصوصیات چونکہ فکرِ اقبال کے مخصوص دائرے کو چیلنج کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ان خصوصیات کو غلط ناموں سے موسوم کر دیا۔ 1857 کے بعد جو صورتِ حال یہاں ہندوستان میں درپیش آئی اور علومِ جدید کے مکتب کھلنے سے فہمِ انسانی ایک اور منطقے سے دو چار ہوا تو انتخاب کا مرحلہ درپیش ہوا۔ نوجوان مسلم کے پاس جو فکری اثاثہ تھا وہ نئے سوالات کی تشفی سے عاری تھا، بلکہ جن مادی علوم نے انسانی زندگی کو نئی رمز سے آشنا کیا وہ براہِ راست ان کا موضوع ہی نہیں تھا۔ چنانچہ پیرویِ مغربی سے انسان کو اپنی نئی شناخت کا جو شعور حاصل ہوا وہ بہت جلد اس کے تجزیاتی اور تنقیدی ذہن کا سرچشمہ بنتا چلا گیا۔ یہ مرحلہ مشرق اور مغرب کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنے کا نہیں تھا بلکہ پورے عالمِ انساں کی ایک نئی سمت کے تعین کا تھا، اور اس نئی سمت نے آنے والے چند ہی برسوں میں اپنے آپ کو موثر بھی بنالیا۔ اس کی وجہ روحِ مشرق سے بیزاری ہرگز نہیں تھی بلکہ تاریخی اعتبار سے عالمی سطح پر بدلتے ہوئے منظر نامے کی نزاکتوں سے علومِ جدید اور تہذیب و تمدن کے مادی تصورات کے ساتھ مناسبت اور موافقت تھی۔ انسانی تاریخ کے اس نئے موڑ پر سرسید احمد خاں کے برعکس عبدالحلیم شرر، ڈپٹی نذیر احمد، علامہ راشد الخیری، اکبر الہ آبادی اور اقبال نے اسے روحِ مشرق، عقیدے، ایمان، اسلام، اقدار و روایات کے قدیم نظام اور اپنے مخصوص تہذیبی تشخص

Scanned with CamScanner

پر ایک حملہ سمجھ لیا۔ یہ تمام لوگ ایک ہی فکر کے پروردہ ہیں۔ اس حوالے سے ان سب کے درمیان کوئی بھی خطِ امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا۔ خود اقبال کی شعری فسوں کاری کے پیچھے اکبر الہ آبادی کا رجعت پسند دماغ، عبدالحلیم شرر کے دین وملت کے محافظ اور اقدارِ کہنہ کے نمائشی ہیروز، ڈپٹی نذیر احمد کا نصوح اور حجۃ الاسلام اور علامہ راشد الخیری کی نسیمہ اور پھوپھی سنجیدہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ سب کے سب اس نفسیاتی کرب میں مبتلا ہیں کہ ملک وملت سے دردمندی کے باوجود عہدِ حاضر کی ''خرافات'' کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے پاس معروضی شکست وریخت کے اس عہد میں کوئی بھی زندہ نظامِ فکر یا نسخۂ کیمیا نہیں ہے۔ سب ماضی کے سحر میں گرفتار اور عصرِ حاضر کی فضا میں پژمردہ اور دل گرفتہ ہیں۔ یہ سب نئے تقاضوں کی مناسبت سے عملی زندگی اختیار کرنے والوں کو مغرب کے مقلد اور ہمنوا سمجھتے ہیں اور عمل سے محروم لوگوں کو مسلمانوں کے شاندار ماضی یا دورِ عروج کی حقیقی تہذیبی و مذہبی روح سے محروم سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے اقبال کی مایوسی اور بے بسی دیدنی ہے:

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں ایک بھی صاحب سرور نہیں

ظاہر ہے کہ زمانہ اپنی چال چل چکا ہے اور کل کے شاہانِ ارض وفلک مات کھا چکے ہیں۔۔ ان حالات میں اقبال کے تصورات کی بنیاد پر ملّتِ بیضا کی بیداری آخر کیا معنی رکھتی ہے؟ چنانچہ اقبال ملّتِ بیضا کو معجزات کے انتظار میں تنہا اور بے بس چھوڑ دیتے ہیں:

ربط و ضبطِ ملّتِ بیضا ہے مشرق کی نجات ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر اُستوار لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

(''خضرِ راہ'')

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

مشام تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اُس کا ظن وتخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوے تاتاری
مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری
تو اے مولاے یثرب آپ میری چارہ سازی کر مری دانش ہے افرنگی، مرا ایمان زناری

اقبال جب قدیم وجدید اور مشرق ومغرب کے سوال پر اپنے تنقیدی اور تجزیاتی ذہن کے ذریعے غور وفکر کرتے ہیں تو ان کو دو سچائیوں کا بیک وقت سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک طرف عہدِ جدید کی

Scanned with CamScanner

زندہ حقیقتیں ہیں، دوسری طرف عہدِ قدیم کا وہ تابناک منظر نامہ ہے جس کی چمک اب معدوم ہو چکی ہے۔ اب ایک طرف عہدِ جدید کی صورت گری ناقابلِ قبول ہے، دوسری طرف شاندار ماضی کے احیا کی خواہش ہے، جبکہ تیسری طرف ملّتِ بیضا کی محکومی، بے عملی اور گمراہی ہے۔ اقبال ان تینوں انتہاؤں کو اپنی اپنی سطح پر برقرار رکھتے ہیں اور تینوں انتہاؤں کے فکری پہلوؤں سے ردوقبول اور اخذ واستفادہ کر کے فکری ونظریاتی بحرانوں سے نکلنے کی کوشش کرنے اور کوئی مربوط نظامِ فکر یا Synthesis قائم کرنے کی بجائے اپنے افکارِ پریشاں میں خود بھٹک جاتے ہیں:

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اس کی وجہ محض یہ ہے کہ انھوں نے علومِ جدید اور عصرِ جدید کے تقاضوں کی مادّی تشفی کو کفر وایمان کی جنگ کا معاملہ سمجھ لیا تھا، لہٰذا وہ خود ایسے سوالات کی زد میں آ جاتے ہیں کہ جن کا جواب ان کی روحِ باکمال بھی نہیں دے پاتی:

مسلمِ خوابیدہ اٹھ، ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق، گرمِ تقاضا تو بھی ہو
وسعتِ عالم میں رہ پیما ہو مثلِ آفتاب
دامنِ گردوں سے پیدا ہوں نہ یہ داغِ سحاب
کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرمِ ستیز
پھر سکھا تاریکیِ باطل کو آدابِ گریز
تُو سراپا نور ہے، خوشتر ہے عریانی تجھے
اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے
ہاں نمایاں ہو کے برقِ دیدۂ خفاش ہو
اے دلِ کون ومکاں کے رازِ مضمر، فاش ہو

یہاں باطل سے مراد مغرب ہی ہے کہ جس کا آفتاب چمک اٹھا ہے۔ اقبال مسلمِ خوابیدہ کو سرگرمِ ستیز کرنا چاہتے ہیں — مسلم یہ مقابلہ آلاتِ خرد اور مغربی سامانِ حرب سے نہیں بلکہ تجلیات سے کرے گا۔ لیکن مومن سے یہ معجزہ کب سرزد ہو گا؟ جب دلِ کون ومکاں کا چھپا ہوا راز ظاہر ہو گا۔ پس یہاں بھی اقبال معجزاتی تیقن کا شکار ہیں۔

4

اقبال کے یقین نے ان کے کلام میں ایک عجیب وغریب سوگوار فضا قائم کر رکھی ہے جو اپنے

Scanned with CamScanner

اثبات کے لیے کائنات کے مادی مظاہر اور انسانی تمدن کے علمی و عقلی ترقیات اور شعور و آگہی کے دیگر مظاہر کو خاطر میں نہیں لاتی بلکہ اقبال ان کو عروجِ آدمِ خاکی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں ؛ پس ان کا یقین خرد کی بجائے جنوں سے رجوع کرتا ہے اور بعض صورتوں میں وہ جنوں کو بھی صاحبِ ادراک سمجھتے ہیں۔ اقبال جسے جنوں کا ادراک سمجھتے ہیں وہ خود ایک اندیشہ ہے، جسے یقین کی چھتری سے ڈھانپ دیا گیا ہے:

نصیبِ مدرسہ یارب! یہ آبِ آتش ناک　　مۓ یقیں سے ضمیرِ حیات ہے پُرسوز
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک　　عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک　　یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک　　زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ

کلامِ اقبال میں عقل و دل کی بحث جو تخیلی تموج دکھاتی ہے اس میں حاصلاتِ عقل سے انکار بہت نمایاں ہے۔ عقل بھی اگر کوئی منزل ہے تو عقل کے لیے اپنی صفت کے بموجب کائنات کے مادی مظاہر اور ان کے اسرار سے مکمل آگاہی بنیادی شرط ہونی چاہیے۔ تہذیبِ انسانی کی تاریخ میں عقل اپنے ہنر اور کمالات کے مظاہرے سے کبھی باز بھی نہیں آئی اور اس کی انتہا کے بارے میں بھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔ پس جب تک انسان عقل کی اس منزل سے پورے طور پر گزر نہیں جاتا، وہ چرخِ نیلی فام سے پرے کی منزل تک رسائی کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ یہ معجزاتِ عقل و ہنر چونکہ آج اقوامِ مغرب کے پاس ہیں، یہی وجہ ہے کہ اقبال اپنے فکری و نفسیاتی عارضے سے شفا پانے کے لیے اس منزل سے بغیر کاہش و خواہش گزر جانے کی تعلیم دیتے ہیں:

ترا دم گرمیِ محفل نہیں ہے　　ترے سینے میں دم ہے، دل نہیں ہے
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے　　گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور

اقبال عقل و خرد کی ہنر کاری کا مذاق اڑاتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں جز گمراہی کے اور کچھ نہیں دھرا:

کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا　　یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا
یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا　　نہ خود بیں، نے خدا بیں، نے جہاں بیں

Scanned with CamScanner

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی
دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

اقبال کی ایک نظم ''زمانۂ حاضر کا انسان'' اس سلسلے میں ایک بہترین مثال ہے:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اصل مسئلہ یہ ہے کہ مذہبی ایمان و یقین کی دنیا تغیراتِ زمان و مکاں کی قید سے آزاد سمجھی جاتی ہے۔ بہرحال اس کا اثبات دائمی رہتا ہے، اس میں نفی کی گنجائش کفر و ضلالت سمجھی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ محکم و جامد تصورات کو مسلسل علمی و فکری چیلنج درپیش رہتے ہیں۔ دوسری طرف سائنسی اور تعقل پسند انسانی نظریۂ ارتقا ہے جو کفر و ایمان کے مسائل کو خاطر میں لائے بغیر مسلسل ارتقا پذیر رہتا ہے۔ انسان کے فکر و شعور اور ہنر کی دنیا ہمیشہ خام حالت میں رہتی ہے۔ اس کے پاس نفع و نقصان کا کوئی حتمی پیمانہ نہیں ہوتا۔ تغیراتِ زمان و مکاں کے ساتھ ساتھ نظریے، فکر، تکنیک، مہارت اور اصول و مبادی میں مسلسل تبدیلی کے عمل کو وہ برقرار رکھتا ہے۔ اس کا یہ سفر رجعت کی طرف کبھی نہیں ہوتا، ہمیشہ ترقی کی سمت رہتا ہے۔ زندگی کی شبِ تاریک کو سحر کرنے کا اس کے پاس کوئی دائمی نسخہ نہیں ہوتا، ماسوائے تگ و دو اور جدوجہد کے۔ پہیے کی ایجاد سے لے کر کمپیوٹر تک سب اسی تعقل پسند اور سائنسی اندازِ فکر کی ارتقا پذیر روایت کی کڑیاں ہیں۔ انسان کے علاوہ دیگر جانداروں کی شبِ تاریک تو فطرت سحر کر دیتی ہے، لیکن انسان کی شبِ تاریک کو انسان کے سوا کوئی سحر نہیں کر سکتا۔ ایسا اگر کبھی اس نے کیا ہے تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے، اور نہیں کیا تو بھی وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔ وہ اپنے حصے کا بوجھ کیسے اتارتا ہے، یہ اس کی اپنی صوابدید پر ہے۔ فکرِ اقبال کا المیہ یہ ہے کہ وہ پختہ افکار کی ضربِ کلیمی سے آنِ واحد میں کوئی معجزہ دکھانے کی مشتاق ہے۔

اقبال اپنی نظم ''عصرِ حاضر'' میں اسی مخمصے میں گرفتار نظر آتے ہیں:

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام

اقبال کے نزدیک جدید تعلیم جب عقل کو آزاد کردیتی ہے تو اس کے باعث فکر بے ربط و نظام ہو جاتی ہے۔ یہاں اقبال کی مراد یہ ہے کہ جذبۂ عشق انسان کی ذات کے نہاں خانوں میں موجود کوئی ایسا معجزاتی عنصر ہوتا ہے کہ جو خیالات کو حتمی طور پر ترتیب دے کر اسے ایک نظام کی شکل دے دیتا ہے۔ اس عشق کو اقبال نے بندۂ مومن کا خاص وصف قرار دیا ہے۔ اس عشق کے بغیر حیاتِ نو کا ہر نظریہ فاسد اور ناپائیدار ہے۔ دل اس عشق کا مرکز و محور ہے، دل کا تعلق جذبے اور احساس کے ساتھ ہے۔ پس وہ عمل جس کا تعلق جذبہ و احساس کے ساتھ ہو گا وہ نہیں ہو گا کہ جسے ظن و تخمین کی شکار عقل سرانجام دیتی ہے:

گرچہ تو زندانیِ اسباب ہے قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

اسباب کی دنیا چونکہ ہر معاملے میں علت کا تقاضا کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اس کے مقابلے میں عشق، جذبے، احساس یا دل کو اہمیت دی ہے۔ اقبال کے نزدیک جذب و مستی سے سرشار عشق، عقلی نتائج اور اس کے عواقب و جوانب سے آزاد، ایک قدر ہے جو پائیدار اور دائمی ہے۔ مغربی علوم و فنون چونکہ عقل اور سائنسی اندازِ فکر کے حامل ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ پائیدار اور دائمی نتائج کے حامل نہیں ہو سکتے:

سرور و سوز میں ناپائیدار ہے ورنہ مئے فرنگ کا تہ جرعہ بھی ناصاف نہیں

جدید علوم و فنون کا مرکز چونکہ مغرب ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال اس ذیل میں مغرب کی ہر کوشش کو تشکیک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسے سعیِ لاحاصل قرار دیتے ہیں:

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام وائے تمنائے خام وائے تمنائے خام

مغرب کے جدید تصورِ انسان کے مقابلے میں اقبال بندۂ مومن کو ایک اور دنیا میں دریافت کرتے ہیں کہ جو علم و جستجو اور تحقیق و تنقید کے تعقل پسند سائنسی لوازمات کی دلدل میں اترنے کی بجائے لذتِ عشق سے سرشار، دنیائے اسباب سے ماورا ہے:

Scanned with CamScanner

لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے
علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لیے

اس بات کو اقبال نے یوں بھی بیان کیا ہے:

ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب
کبھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا

عالم رنگ و بو بھی چونکہ مغرب کے دستِ تحقیق میں ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال اس عالم سے گزر جانے کی تلقین کرتے ہیں اور ان جہانوں کی طرف نگاہِ التفات اٹھانے کا پیغام دیتے ہیں جنھیں اقبال کے خیال میں عقلی یا سائنسی انسانی تدبر سے مسخر نہیں کیا جا سکتا۔ دنیاوی زندگی کے وہ مسائل کہ جن کو عقل یا تدبیر سلجھانے کی کشمکش میں مبتلا ہے، اقبال ان سے مکمل اجتناب اور گریز کی تعلیم دیتے ہیں:

چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر

کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
اِسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا

ستاروں سے آگے کے جہانوں کی فکرِ اقبال کی شاعری میں صد ہا سال پر محیط عالمِ اسلام کی پستی، مسلمانوں کی محکومی اور غلامی، ملائیت، خانقاہ کے فریب، علوم وفنون، حکمت و دانائی اور عقلی، سائنسی اور مادیت پسند فکری روایات کے زوال کے نتیجے میں ردِ عمل کے طور پر ابھری ہے۔ اسی ردِ عمل نے نہ صرف فکرِ اقبال کو بری طرح متاثر کیا ہے بلکہ عالمِ اسلام کو بھی فکری اعتبار سے ایک دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے، جہاں ایک طرف تو مغربی علوم وفنون کا مسلسل بڑھتا ہوا عالمی پھیلاؤ ہے (جس میں اب مشرقی اقوام بھی بڑھ چڑھ کر پیش رفت کر رہی ہیں) جو عالمی سطح پر تمدنِ جدید کو مختلف جہتیں عطا کر رہا ہے؛ یہ تمدنِ جدید ایک زندہ اور ٹھوس حقیقت بھی ہے، جبکہ دوسری طرف حقیقتِ دین کا اقبالی فلسفہ ہے کہ جس کی رو سے وہ مغربی تمدنِ جدید کی، جس کے آثار مشرق میں بھی نمایاں تر ہوتے چلے جا رہے ہیں، مکمل نفی کرتے ہیں اور اسے انسانیت کے لیے ہلاکت اور مومن کے لیے گمراہی قرار دیتے ہیں۔ محض اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اقبال دین اور دنیا میں دوئی کے قائل ہیں۔ اپنی نظم ''سلطانی'' میں کہتے ہیں:

وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے

خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی
مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود

مغرب کی خرد افروز جستجو اور تحقیق کو اقبال نے ''مردہ لادینی افکار'' سے تعبیر کیا ہے؛ یہ تعبیر ہی احساسِ

Scanned with CamScanner

کمتری کی دین ہے۔ ایسا دراصل مجدد الف ثانی اور امام غزالی کی فکری روایت کے اقبال تک تسلسل کے باعث ہوا ہے کہ وہ تمام علوم جو شرح دین میں براہ راست معاون نہیں ہوتے چونکہ انسانی جستجو کا حاصل ہیں اور الہیاتی تعلیمات کے متوازی اپنے نظامِ فکر کو تشکیل دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ سب علوم خرافات کی ذیل میں آ جاتے ہیں۔ ایمان و یقین کی دنیا جب انسانی علوم کے متوازی اپنی حیثیت اور کاملیت کے تعین میں انسانی علوم کے ارتقا سے موازنہ کرتی ہے یا مدد لینے کی کوشش کرتی ہے تو تشکیک کے کھلے دروازے ایک ایسا جہانِ معنی آشکار کرتے ہیں کہ اس ایمان و یقین کی عمارت متزلزل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اقبال الہیاتی تعلیمات اور انسانی علوم کی الگ الگ نوعیت اور حیثیت کا ادراک کرنے کی بجائے ان دونوں کے درمیان کوئی معنی خیز ربط قائم کرنے میں بری طرح ناکام ہوے ہیں۔ اپنی ایک نظم ''علم اور دین'' میں اقبال ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہیں:

وہ علم کم بصری جس میں ہم کنار نہیں — تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

پیغمبر کے علاوہ کوئی بھی انسان پیغمبر نہیں ہوتا۔ حکمت و دانائی کا پھل ایک پیغمبر غائب سے حاصل کرتا ہے، جبکہ ایک عام انسان کو وہی پھل عالم اسباب میں مشاہدات و تجربات کے مرغزاروں میں تحقیق و جستجو کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ اگر پیغمبر کے لیے معجزہ ہی رہنمائی کا واحد وسیلہ ہوتا تو یقیناً اسے مشاہدات و تجربات کے واحد وسیلے سے خود اپنے ذہن اور ہاتھوں سے علوم و فنون کو ترقی دینے کی کوئی ضرورت نہ رہتی۔ اقبال اس سادہ سی حقیقت کے اعتراف سے بھی اپنی شاعری میں محروم ہیں۔ کہیں تو انسانی علوم کو الحاد قرار دے دیا اور کہیں ان کو مردِ مومن کے ذوقِ یقیں کی تسکین کا ساماں قرار دے دیا۔ نظم ''طلوعِ اسلام'' میں اقبال مردِ مومن اور اس کے یقین کی سربلندی کے لیے ایسے ہی فکری الجھاؤ کا شکار ہیں:

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا — تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری — یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

مغرب کی وہ جدید تعقل پسند علمی و فکری روایت کہ جسے مشرق نے بھی اپنے سیاسی، سماجی، معاشی اور

Scanned with CamScanner

تہذیبی مسائل کے حل کے لیے قابلِ قبول بنایا، اس نظم میں اقبال نے اُس روایت کو رد کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اقبال نے اس روایت کو قرآنی تعلیمات کا متبادل سمجھ لیا تھا۔ ظاہر ہے اگر اسے 'متبادل' سمجھ لیا جائے تو کسی بھی طور اقبال کے لیے اس روایت کا اثبات ممکن نہ تھا، چنانچہ اس روایت سے یکسر انحراف ان کا مذہبی کم اور نفسیاتی مسئلہ زیادہ بن گیا۔ اس کے نتیجے میں مسلمان آفاق اور مابعد آفاق کا شہزادہ تو بن گیا لیکن عہد کے زندہ حقائق کی تفہیم سے معذور اور بیگانہ رہا اور جہانِ خاکی کی تخریب کو تعمیرِ جہاں گمردانتا رہا:

ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تُو ہے　　پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
خدا کا آخری پیغام ہے تُو، جاوداں تُو ہے　　مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تُو ہے　　حنابندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا

وہ ارضِ خاک کہ جس کی نیرنگیاں انسانی صفات کو دادِ نظارہ ہی نہیں تحقیق و جستجو کی دعوت بھی دیتی ہیں، اقبال اُس زمین پر مردِ مومن کے پاؤں نہیں ٹکنے دیتے، اور انسان کا مادی تمدن جو اس تحقیق و جستجو کے نتیجے میں آباد ہوا، اُس تمدن کی تحقیر کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔ انسان افلاک میں بھٹکتا ہوا کوئی سیارہ نہیں، بلکہ زمین کے ساتھ اس کی نسبت خود انسان اور کائنات کے تعلق کا قابلِ فہم اثبات ہے۔ اقبال اس کائنات کو خاطر میں نہیں لاتے اور بے پَر کے انسان کو خلاؤں کی سیر کراتے ہیں۔ اپنی نظم ''مومن (دنیا میں)'' میں اقبال کہتے ہیں:

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش　　خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں　　جبریل و سرافیل کا صیّاد ہے مومن

اقبال نے تو اس بات کو مومن اور کافر کا فرق قرار دیا ہے کہ مومن کی بے کراں اور بے حد و شمار باطنی صفات میں آفاق اور ان کا راز گم ہے اور اسے کسی تسخیر کی بھی کوئی حاجت نہیں، جبکہ کافر کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ آفاق میں غور و فکر، تحقیق اور تجربات کے ذریعے ان کے اسرار کو پانے کی سعیِ لاحاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں بھی اقبال دراصل بیسویں صدی میں عالمِ اسلام کی علمی، فکری، سیاسی، سماجی، معاشی، سائنسی اور تہذیبی و تمدنی شکست، زوال، بے بسی اور مایوسی پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنے احساسِ برتری کو نمایاں کرنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ اپنی نظم ''کافر و مومن'' میں خضر کی زبانی

کہتے ہیں:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے — مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اسی بات کو اقبال نے اپنی معروف نظم ''لا الٰہ الا اللہ'' میں زیادہ موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ دراصل کلمہ طیبہ کا پہلا حصہ ہے۔ اقبال کا اپنی مخصوص کلامی بحث کے لیے اس حصے کا انتخاب بہت معنی خیز ہے، یعنی کوئی نہیں ہے معبود سوائے اللہ کے۔ اگر اس سے مراد معروف ترین معنوں میں یہی لیا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا عبادت کے کوئی لائق نہیں تو اس بات سے نہ تو کائنات کی نفی ہوتی ہے اور نہ ہی انسانی علوم و فنون اور انسان کے مادی تمدن کی نفی ہوتی ہے، بلکہ کائنات تو اپنے وسیع تر مفہوم میں خالق کائنات کے اثبات کی بیّن دلیل ہے، لیکن اقبال نے اپنے مخصوص نظریے کی تائید کے لیے کلمہ طیبہ کے اس حصے سے معروف معنوں کی بجائے اپنے مخصوص فکری نظام کی تشکیل کے لیے معانی اخذ کیے ہیں۔ نظم میں کہتے ہیں:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے — صنم کدہ ہے جہاں، لا الٰہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند — بتانِ وہم و گماں، لا الٰہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری — نہ ہے زماں نہ مکاں، لا الٰہ الا اللہ

یہاں اقبال نے دراصل عہد جدید کی ان مغربی ترقیات کی جو سائنسی علوم و فنون مادیت پسند حکمت و دانائی اور انسانی تحقیق و جستجو کے نتیجے میں بشمول مشرق تمام اقوامِ عالم میں اپنے واضح نقوش مرتب کر رہی تھیں، مکمل نفی کرنے کے لیے حضرت ابراہیم کی بت شکنی کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس بت شکنی سے مراد اللہ کے سوا معبودوں کا خاتمہ اقبال نے نہیں لیا بلکہ تمدنِ جدید کے تمام مادّی مظاہر کا خاتمہ مراد لیا ہے۔ چنانچہ اقبال ابراہیم ثانی کے منتظر ہیں کہ جو تمدنِ جدید کے تمام مادی مظاہر کو پاش پاش کر دے۔ فکرِ اقبال مسئلے سے دو چار تب ہوتی ہے جب وہ ان مظاہر کو بتوں سے تعبیر کر بیٹھتی ہے۔ سوئی سے لے کر ہوائی جہاز اور کمپیوٹر تک کے تمدنی مظاہر انسان کے مادی علوم و فنون کی لازمی ترویج کے باعث معرضِ وجود میں آئے ہیں؛ یہ مادی مظاہر انسانی زندگی میں اپنے افادی پہلوؤں کے باعث فروغ پذیر ہوتے ہیں نہ کہ ان کے ذریعے ان کی عبادت مقصود ہوتی ہے، لیکن اقبال نے اپنی نفسیاتی تشفی کے لیے خود ہی ان مظاہر کو بت قرار دے دیا اور تمدنِ جدید کو صنم کدہ۔ تمدن جدید چونکہ مغربی علمی و

Scanned with CamScanner

فکری روایات کی عطا ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال اس پورے تمدن کو کفر سے تعبیر کرتے ہوئے مردِ مومن کو اس تمدن کی تکذیب کی نصیحت کرتے ہیں۔

اقبال نے دنیاوی مال و دولت اور اس کے نتیجے میں استوار ہونے والے سماجی تعلقات کو بتانِ وہم وگماں قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال اگر تمدن کے مادی مظاہر، ان سے حاصل ہونے والی مادی مسرت اور مادی تعلقات کار کے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کو ٹھوس اور زندہ حقیقت قرار دے دیتے تو اس سے لامحالہ مغربی علوم وفنون اور تمدنِ جدید کی تائید کا پہلو نکل آتا جو اقبال کے نظامِ فکر میں خرابی کا باعث بن جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب سے بلا جواز تعصب، نفرت اور حقارت کے باعث تمدنِ جدید کی تمام زندہ اور ٹھوس حقیقتوں کو اقبال نے وہم وگماں سے تعبیر کر دیا۔ اسی طرح انسانی عقل جو زمان ومکان کو سمجھنے، پرکھنے، اس کے قوانین اور اصولوں کو دریافت کرنے اور سائنسی بنیادوں پر زمان ومکان کے تعلق کو دریافت کرنے کی جستجو میں انسانی علوم وفنون کو ترقی دیتی ہے، اقبال انسانی عقل کے اس اثاثے کو اہمیت نہیں دیتے۔ فکرِ اقبال اس سوال کی توضیح سے عاری ہے کہ کائنات کے مادی وجود اور انسان کی عقل، تجربے اور مشاہدے سے تصورِ خدا پر کیا اثر پڑتا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ کلمہ طیبہ کا دوسرا حصہ ''محمد رسول اللہ'' ہے۔ اس حصے میں کائنات کے افضل ترین انسان اور ان کی رسالت کا اثبات کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ یعنی ایک طرف اگر اللہ کے سوا دیگر تمام اشیا، قوتوں، مخلوقات اور خداؤں کی نفی کی گئی ہے تو دوسری طرف حضور پاکؐ اور اُن کی رسالت کا اثبات کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسی اثبات سے انسان اور کائنات کے مادی تعلق کا اثبات ہوتا ہے۔ یہ اثبات انسان کے مادی تمدن کو براہِ راست موضوع بناتا ہے اور انسانی تمدن کے خارجی مظاہر کی معنوی تفہیم بھی کرتا ہے۔ قرآن مجید رسالت کا منتہا ہے جو کائنات کے مادی مظاہر اور انسانی تہذیب و تمدن میں غور وفکر اور تحقیق کرنے کا داعی ہے، جبکہ اقبال اپنی شاعری کے عمومی مزاج میں کائنات اور انسانی تمدن کے مادی مظاہر کی نفی کرتے ہیں اور صوفیانہ طرزِ فکر پر تنقید کے باوجود خود فنا کی تعلیم دیتے ہیں۔ افسوس اسی تعلیم کو اقبال کی انقلابی روح قرار دے دیا گیا۔ مثلاً نظم ''خضرِ راہ'' میں کہتے ہیں:

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

Scanned with CamScanner

اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے — پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار

اقبال یہاں بھی زمین و آسمان کے مادی وجود کی نفی اور فنا کو صداقت کا اعلیٰ معیار قرار دے رہے ہیں۔ جسے مستعار کہا گیا ہے، وہ انسان کے لیے دنیاوی زندگی میں سب سے بڑا انعام ہے: اس کی نفی سے خود انسان کی نفی ہو جاتی ہے، اور خود انسان اپنا اثبات کائنات کے متوازی اپنے تمدن کی تشکیل کے ذریعے کرتا ہے۔ پس انسانی وجود کو کائنات کے مادی وجود سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

5

اقبال جب یورپ میں تھے تو بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کا جدید ترین تمدن ان کی آنکھوں کے سامنے تھا لیکن اقبال نے اسے انسان کی عظمتِ کردار قرار دینے کی بجائے لطیف پیرائے میں ویرانہ کہہ دیا:

مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ — فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں

غرض اقبال کسی بھی طور تمدنِ جدید کی عمارات کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں۔ یوں ان کے ذہن نے عجیب و غریب منطقے دریافت کرنے شروع کر دیے:

سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف — خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ

خاکِ مدینہ و نجف ہر مومن کی آنکھ کا سُرمہ ہے، اس میں کوئی کلام نہیں، لیکن مدینہ و نجف کے فکری اثاثے کا دانشِ فرنگ سے موازنہ کر کے آخر اقبال کیا باور کرانا چاہتے ہیں؟ جبکہ دانشِ فرنگ بھی ایک اور سچائی کی کھوج کا پل صراط ہے جس کے ارتقا میں انسانی محنت اور دانش کا ایک صبر آزما اور طویل عہد سانس لیتا ہے۔ اس کے سوا کیا کہا جائے کہ اقبال نے مسلمانوں کے زوال کا انتقام دانشِ فرنگ کو بلا جواز ٹھوکر مار کر لیا ہے۔ اور اگر اقبال دانشِ فرنگ کی 'سیاہ کاریوں' کے باعث اس سے مطمئن نہیں ہیں تو پھر اقبال کے پاس دوسرا راستہ کیا ہے؟ اقبال کے نزدیک وہ مسلمانوں کے دورِ عروج کا وہ عرصہ ہے جب ان کی سیاست، دانش، افکار، معیشت اور عسکری طاقت کا سکہ عرب، ہندوستان، افریقہ اور یورپ میں چلتا تھا۔ اقبال کے خیال میں، سلامیوں کی روحانی قیادت نے پوری دنیا کو

حکمت و دانش سے معمور کر دیا تھا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا دورِ عروج جس کا آغاز عرب کے خیمہ نشینوں سے ہوتا ہے اور انتہا اندلس کا الحمرا قرار پاتا ہے، اس پورے عہد کے مسلمان فلسفی، حکیم اور سائنسدان سب کے سب مادی علوم وفنون کی ترقی میں گہری دلچسپی لینے والے، خردمند اور مادیت پسند تھے اور انھی کی کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں کو دنیا میں سرفرازی نصیب ہوئی۔ اقبال مسلمانوں کے اس دورِ عروج کی مادی ترقی اور خوشحالی سے محض اس لیے صرفِ نظر کر جاتے ہیں کہ ان کے اثبات سے یورپی مادی ترقی وخوشحالی کی نفی کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔ اقبال کی فکر کا یہ تضاد ایک بڑا المیہ ہے۔ اقبال نے خود سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا ہے کہ مسلمانوں کے عظیم ماضی کی بنیاد مادی ترقی پر نہیں تھی بلکہ وہ کچھ اور تھا، جو زمان ومکاں کا پابند نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ خودی تھی یا کچھ اور تھا؟ جو بھی تھا، ماضی کے پُراسرار بندوں کا یہ عرصہ بھی زمان ومکاں کی بھینٹ کیوں چڑھ گیا؟ 'یادِ ماضی' سے آخر کیا مراد ہے؟ کیا اقبال ان سوالوں کی نزاکتوں سے آگاہ نہیں تھے؟ ''ساقی نامہ'' میں ان کی فکری بے بسی دیدنی ہے:

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا وہی جام گردش میں لا ساقیا
خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات خودی کیا ہے؟ بیداریِ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے نہ حد اِس کے پیچھے نہ حد سامنے

مسلمانوں کے دورِ عروج کو زمان ومکاں کے مادی متعلقات سے جدا کر کے اقبال اپنے تصوراتی سومنات کے خود مجاور بن جاتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ کسی بھی نظامِ فکر جسے ابدی یا دائمی قرار دیا جاتا ہے، اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کائنات اور انسانی سماج کے حقائق بھی ابدی رہیں؛ ان میں کسی بھی قسم کی تبدیلی یا ارتقا کا امکان معدوم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ منطقی اعتبار سے یہ بات درست نہیں ہے۔ بعض کائناتی اور سائنسی معاملات پر یہ بات صادق آسکتی ہے، مثلاً نظامِ شمسی کا محکم ابدی اصول، یا H_2O کا ہمیشہ پانی بننا، وغیرہ۔ اسی طرح انسانی سماج میں چوری، جھوٹ، تعصب، ملاوٹ، دھوکا دہی وغیرہ کے معاملات میں انسانی قدروں کا استحقاق ابدی ہوسکتا ہے۔ لیکن سائنسی علوم، ٹیکنالوجی، آرٹ، ادب، فلسفہ، تمدنی مظاہر اور عمرانی علوم مسلسل حقائق کی نئی پرتوں کو دریافت کرنے کے لیے تبدیلی، ردوقبول اور ترامیم واضافے کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ انھی کے ارتقا اور فروغ

Scanned with CamScanner

کے باعث حقائق کی نئی صورتیں سامنے آتی ہیں جو سابقہ حقائق کی نوعیت کو بدل دیتی ہیں، اور خود یہ نئی صورتیں علوم وفنون سے متعلق فہم انسان کو تبدیلی پر اکساتی ہیں۔ اقبال چونکہ رواداری کے کسی عالمی نظام کو خاطر میں نہیں لاتے، یہی وجہ ہے کہ وہ تہذیبی تصادم کو مذہبی تصادم سے قریب تر کردینے کے قائل ہیں اور اس کے داعی بھی ہیں۔ وہ حقائق کو ابدی سمجھتے ہیں اور وہ تمام امور جو حقائق کی ابدیت کے سوال کو متاثر کرتے ہیں، اقبال حقائق کے اس نئے منظرنامے کو دین ومروت کے خلاف سازش قرار دیتے ہیں۔ اپنی نظم ''دین وتعلیم'' میں کہتے ہیں:

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم ایک سازش ہے فقط دین ومروت کے خلاف

ظاہر ہے کہ اہل کلیسا (یعنی اہل مغرب نہ کہ عیسائی اہل ایمان) کی تعلیم مادی سطح پر تمدن جدید کی آبیاری کرتی ہے اور اس محاذ پر عقل وسائنس پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ اس میدان میں اترنے اور مقابلے کا مطلب اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہوسکتا کہ مسلمان مشرقی اقوام عقل اور سائنس پر مبنی علوم و فنون کو مزید ترقی دیں یا ان کے تمدن کے مقابلے میں اپنے مادی تمدنی مظاہر کو وسعت دیں۔ اقبال اگر اس حقیقت کو تسلیم کرلیتے تو لامحالہ انھیں مغرب کی عقل، سائنس اور علوم وفنون میں ترقی کا معترف اور قدردان ہونا پڑتا۔ اقبال کا خود اختیار کردہ مذہبی تفاخر کا تصور اس بات کی اجازت دے ہی نہیں سکتا تھا۔ پس وہ ملول و پریشان ہوکر اپنے عہد میں عقل اور سائنسی علوم کی مغربی برتری کا جواب عقل اور سائنس کی مشرقی ترقی سے دینے کی بجائے معجزات دکھانے والوں کے نوحہ خواں بن جاتے ہیں۔ اپنی نظم ''خانقاہ'' میں کہتے ہیں:

رمز وایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن

'قم باذن اللہ' کہہ سکتے تھے جو، رخصت ہوئے خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

ہمارے ہاں ایک دستور یہ بھی ہے کہ اقبال کو ان کے فکری سباق وسیاق کی نزاکتوں سے یکسر کنارہ کرتے ہوئے اپنے مطلب کے معانی اخذ کرلیے جاتے ہیں۔ مثلاً اقبال جب یہ کہتے ہیں کہ ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' تو اس کا مطلب مشرقی ادیان کی سیاست سے علیحدگی نہیں ہے بلکہ کلیسا کی سیاست سے علیحدگی ہے۔ اقبال تو مسلمان کے سیکولر ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتے؛ اس حوالے سے ان کی تنقید براہِ راست مغربی طرزِ سیاست پر ہوتی ہے۔ وہ عالم اسلام

Scanned with CamScanner

کو سیکولرازم کی لعنت سے آگاہ تو کرتے ہیں لیکن یہ بتانا بھول جاتے ہیں کہ کلیسا کے ہزار سالہ عہد کو خود اہل کلیسا یعنی اہل مغرب نے عہد تاریک سے موسوم کیا ہے۔ اس پورے عرصے میں مغرب کے انسان نے وہ کون سا انسانیت سوز دکھ تھا کہ جسے نہ جھیلا ہو۔ یورپی تاریخ کا یہ عرصہ ننگِ انسانیت کا کھلا باب ہے۔ مذہب کے نام پر جو ظلم وستم انسانیت پر روا رکھا گیا اس کی تفصیلات دینا مقصود نہیں ہے، لیکن اقبال ان تاریخی تفصیلات سے مکمل صرف نظر اس لیے کر جاتے ہیں کیونکہ مغرب کے انسان کی تہذیبی وتمدنی ترقی کا سارا راز مذہبی تعلیمات کی بجائے انسانی علوم وفنون کی ترقی میں مضمر ہے۔ اقبال مغربی انسان کی علوم وفنون میں ترقی کو گوارا کیسے کر سکتے تھے؟ پس اقبال نے مغرب کے انسان کی مذہب کے مقابلے میں انسانی علوم وفنون کی ترقی وترویج سے قطع نظر کرتے ہوئے، اسے مغربی انسان کے لیے نامرادی اور بے بصیرتی قرار دے دیا۔ اپنی نظم ''دین وسیاست'' میں کہتے ہیں:

چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری — سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری — ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری — دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی

اقبال نے مغربی انسان کے حکمت وکمال کے مادی تمدن کے معجزے کو شاخِ نازک پر آشیانہ قرار دے دیا اور ایران وعرب کو خبردار کرتے ہوئے اپنی نظم ''اقوامِ مشرق'' میں کہتے ہیں:

آنکھ جن کی ہوئی محکومی وتقلید سے کور — نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور — زندہ کر سکتی ہے ایران وعرب کو کیونکر

اقبال اپنی شاعری میں مسلمانوں کو ہمیشہ یہی تاکید کرتے رہے کہ وہ اپنے تشخص کو پہچانیں اور مغرب کی تقلید سے گریز اختیار کریں۔ مغرب جس راہ پر چل پڑا ہے وہ سرتاسر گمراہی اور دین سے دوری ہے۔ انھیں ہمیشہ اس بات کا خوف رہا کہ جس طرح مغرب نے مذہب سے کنارہ کر لیا اور محض انسانی اور تمدنی ترقی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا، کہیں مسلمان بھی مذہب سے بیگانہ ہو کر پیروی مغرب میں اپنے دین سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ اسی خوف کے باعث وہ مغرب کی کسی بھی خوبی کی، خواہ وہ کتنی ہی حقیر ترین خوبی کیوں نہ ہو، قدردانی سے یکسر گریز اختیار کر جاتے ہیں۔ چنانچہ مغرب کی انسانی اور مادی ترقی کے مقابلے میں دوسری انتہا پر وہ مذہب کو لے کر آتے ہیں۔ اقبال دنیاوی زندگی کی

Scanned with CamScanner

مسرتوں، ترقی اور خوشحالی کو اس خوف سے اپنی فکر کا حصہ نہیں بنا پاتے کہ کہیں اس سے مغرب کی ترقی اور خوشحالی کی تائید کا کوئی پہلو نہ نکل آئے۔

6

اقبال نے مسلم شناخت کو، مادی زندگی کی ترقی کے بالکل متوازی، صرف اور صرف مذہب پر قائم کیا ہے اور اس شناخت پر مادی ترقی کا شائبہ تک نہیں پڑنے دیتے۔ نظم ''مذہب'' میں وہ کھلے الفاظ میں اس بات کا اعلان کرتے ہیں:

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اقبال کا خیال ہے کہ مذہب ایک ایسی قوت ہے کہ جو رنگ و نسل، وطن، قومیت اور زبان جیسی تمام تفریقات کو ختم کر دیتی ہے۔ حقیقتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ مذاہب پر اعتقاد رکھنے والے سب گروہ اور معاشرے، مذاہب کی آفاقی تعلیمات کے باوجود، رنگ و نسل، وطن یا قوم سے تعلق رکھتے ہیں — یہاں تک کہ خود مذہب بھی اس تفریق میں شامل ہوتا ہے۔ جہاں دیگر تفریقیں الگ شناخت کا مطالبہ کرتی ہیں، وہاں خود مذہب بھی الگ شناخت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اقبال جب ''قومِ رسولِ ہاشمی'' کی ترکیب کو استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب بھی مذہب کی بنیاد پر دیگر انسانی معاشروں کے مقابلے میں الگ تشخص کے قیام کا مطالبہ ہے۔ اگر مغرب اپنی جمعیت کے استحکام کے لیے ملک و نسب پر انحصار کو شناخت کا وسیلہ سمجھتا ہے تو اصولی طور پر اس میں بھی کوئی قباحت نظر نہیں آنی چاہیے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر مسلم تشخص مغرب سے تعصب کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے تو مغربی تشخص کو ملک و نسب کی بنیاد پر استوار ہونے میں ممانعت نہیں ہونی چاہیے۔ خود مسلم مذہبی تشریحات کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا بھی ہے کہ جو دیگر مذاہب اور اقوامِ عالم کو گمراہ، فاسق و فاجر اور ارذل قرار دیتا ہے اور ان سب کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مذہب کی بنیاد پر جب اقبال جمعیت کے قیام کے آرزومند ہوتے ہیں تو وہ اس بات کو بھی خوب سمجھتے ہیں کہ دیگر مذاہب اور اقوام سے نفرت اور حقارت

کا جذبہ انتہائی موثر اور کارگر ثابت ہوگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود مذہبِ اسلام کے ماننے والوں نے مذہبی تشخص کو نسلی اور قومی بنیادوں پر نہ صرف قائم کیا بلکہ ان بنیادوں پر فرقے بھی تشکیل پائے۔ دوسری طرف اسلامی ریاستوں کے قیام اور مسلم نو آبادیاتی نظام کی وسعت اور عہدِ فتوحات میں کبھی عرب اسلامی تشخص کارگر ہوا، کبھی ایرانی اسلامی تشخص اُبھر کر سامنے آیا، کبھی ترک اسلامی تشخص موثر ہوا تو کبھی ہند اسلامی تشخص نے کل پرزے نکالے؛ جبکہ چھوٹی سطح پر ذات برادری اور طبقاتی تفریق جیسے مسائل کو کم کرنے یا ختم کرنے میں بھی مندرجہ بالا تشخص کے تمام بڑے حوالے بری طرح ناکام رہے۔ خود اقبال کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ انتہائی دکھ اور ملال کے عالم میں کہتے ہیں:

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

لیکن ایسا سمجھتے ہوئے اقبال بھول جاتے ہیں کہ وہ خود گروہی اور مذہبی تفریق کے قائل ہیں؛ ان کے پاس کوئی ایسا نسخۂ کیمیا نہیں کہ جس کے ذریعے سارا عالم انسان، ہر نوع کے تفرقات سے بالاتر ہو کر، تفکر اور تدبر کے عالمی معیارات کو فروغ دے سکے۔ اقبال اپنی فکر کے ہاتھوں اس قدر مجبور تھے کہ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر نوع کے تفرقات سے آزاد مذہبی تعلیمات نہیں بلکہ جدید مغربی علوم وفنون ہیں جو عصرِ حاضر میں تمام بنی نوع انسان کا عالمی اثاثہ قرار پا چکے ہیں۔ ان علوم و فنون کا کوئی مذہب، رنگ، نسل، قومیت، جغرافیہ، فرقہ یا مسلک نہیں ہے۔ مذہبی، قومی یا نسلی تفرقات سے ماورا ان علوم وفنون کی تحصیل نے پورے عالمِ انسان میں وحدت کے نئے امکانات کو فروغ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تفریق پسند مذہبی تعلیمات کا دائرۂ کار سکڑتے سکڑتے معدوم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ افسوس یا خوشی کا معاملہ بھی نہیں ہے بلکہ دنیا میں انسانی تمدن کے ارتقا کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تاریخی حقیقت ہے جس کا سامنا کرنے کی جرأت چونکہ اقبال میں نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو'' کا اعادہ کرتے رہتے ہیں اور تمدنِ جدید کے مادی مظاہر اور تہذیبی قدروں کے نئے عالمی نظام کو ''بتانِ وہم وگماں'' قرار دے کر اس ٹھوس تاریخی سچائی سے صرفِ نظر کر جاتے ہیں۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کی ساری تشکیل بھی اسی سیاق وسباق میں ہوئی ہے۔

Scanned with CamScanner

7

اقبال نے اپنی فارسی مثنوی ''اسرارِ خودی'' میں ایک فرد میں خودی کی استواری کے تین مدارج بیان کیے ہیں، اوران کے بقول جوفرد ان تین مدارج سے گزر جاتا ہے اسے خود بخود اپنی صلاحیتوں، طاقتوں، مقاصد اور آفاقی پروگرام کی تکمیل سے مکمل آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو پہچان جاتا ہے اور خدائی اوصاف سے متصف ہو کر دنیا کو بدل ڈالنے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔ پہلا مرحلہ ضبطِ نفس کا ہے، کہ راہِ حق کا متلاشی شر کی پیروی سے آزاد ہو کر حق اور باطل میں تمیز کی لیاقت اپنی روح میں بیدار کرے۔ اقبال کے نزدیک حق اور باطل میں یہ تمیز ظواہر کی مادی دنیا کی مختلف صورتوں اور جہتوں میں تمیز کے ذریعے پیدا نہیں ہوتی کیونکہ ظواہر انسان کو دھوکا دیتے ہیں؛ ان کے خیال میں مادی زندگی کے تصوراتِ سود و زیاں سے ماورا ہو کر ایک فرد اپنے دل، مَن یا روح کی اتھاہ گہرائیوں میں غلط اور صحیح یا حق و باطل کا عرفان حاصل کر سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہی ضبطِ نفس ہے اور زندگی کا عرفان اسی سے حاصل ہوتا ہے:

اپنے مَن میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

دوسرا مرحلہ خودی کے دستور یا ضابطۂ حیات کی پیروی ہے۔ اقبال کے نزدیک قرآنِ مجید قلبِ مومن کا آئین ہے۔ اس آئین کی قلبی پیروی دنیاوی زندگی کے ہر ڈر اور خوف سے آزاد کر دیتی ہے۔ یہ وہ ضابطۂ حیات ہے جس میں انسانی تدبیر اور تعقل کو کوئی عمل دخل حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال مذہبی تاویلات کے بھی شدید مخالف ہیں۔ اس کی پیروی ہی تفکر کا الٰہیاتی نظام خود بخود انسان کی روح میں پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال صریح الفاظ میں کہتے ہیں:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اقبال نباتات و جمادات کو تقدیر کا پابند قرار دے کر دراصل کائنات کے مادی وجود کو سطحی اور ارذل قرار دینا چاہتے ہیں، گویا احکامِ الٰہی کا تقاضا کائنات کے سطحی اور ارذل وجود میں انسانی تحقیق اور جستجو کو کھپانا نہیں ہے، جیسا کہ اہلِ مغرب نے کیا، بلکہ اس کا مقصود کچھ اور ہے جس کی تفہیم سے ''افرنگی دانش کا مقلد اور زناری ایمان کا حامل'' نوجوان مسلم آگاہ نہیں ہے۔ فکرِ اقبال

Scanned with CamScanner

یہاں بھی مسئلے سے دو چار ہے کہ اگر احکامِ الٰہی کی پیروی سے کائنات کے مادی مظاہر میں تحقیق اور دلچسپی مراد لی جاتی تو اس حوالے سے انھیں مغربی قیادت و سیادت کو کچھ تسلیم کرنا پڑتا، جو فکرِ اقبال کی ساری عمارت کو منہدم کرنے کا اعلامیہ بن جاتا۔ پس احکامِ الٰہی کی پیروی جس خودی کو بیدار کرتی ہے اُس کے دائرۂ عمل سے انسان کے مادی تمدن کی تشکیل خارج ہے۔

خودی کی استواری کے لیے اقبال نے تیسرا مرحلہ نیابتِ الٰہی کو قرار دیا ہے، کہ ایسا فرد جو پہلے دونوں مراحل سے بہ حسن وخوبی عہدہ برآ ہو جاتا ہے وہ خود بخود تیسرے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اِس مقامِ ارفع پر متمکن فرد حقیقی معنوں میں اللہ کا نائب بن جاتا ہے—اس کی تدبیر اور تقدیر آمیخت ہو جاتے ہیں۔ یہی اقبال کا مردِ مومن، قلندر، فقیر، صاحب سرور، انسانِ کامل یا سُپر مین ہے۔ اسی کے بارے میں اقبال کہتے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

اللہ کی ذات چونکہ مادی وسائل کی محتاج نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ مردِ مومن کو بھی اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کسی بھی نوع کے مادی وسیلے کی احتیاج نہیں ہوتی۔ اس کے پاس چونکہ ایمان و یقین کی حرارت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کی ہر رزم میں مقابلے کے لیے بے تیغ وسپر اُتر پڑتا ہے۔ اقبال کے نزدیک ایسا قوتِ ایمان کی موجودگی میں ہی ہو جاتا ہے لہٰذا مادی وسائل کی کھوج کے لیے مادی علوم وفنون کے ذریعے انسان کے نظری مشاہدے، تجربے، تحقیق اور ٹیکنالوجی کو بروئے کار لانے کی بھی اصولی طور پر کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ اقبال اپنی شاعری میں اسی بات کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں:

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گونا گوں
ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستی و شوق نہ مال و دولتِ قاروں، نہ فکرِ افلاطوں
علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

یہاں اقبال کی خودی کا تصور بالکل نمایاں ہے۔ وہ انسانی زندگی کو خیال ونظر کی مجذوبی قرار دیتے ہوئے ایمان ویقین کی اُس بنیاد سے رجوع کرتے ہیں جس کا تعلق باطن کے نہاں خانوں سے ہے۔ دراصل وہ یہاں مادی علوم وفنون کو، جو آتشِ تشکیک کو بھڑکاتے ہیں، رد کر رہے ہیں۔ وجہ اس کی

Scanned with CamScanner

صرف یہ ہے کہ تشکیک، جو مادی علوم وفنون کی روحِ رواں ہے، خودی کے اُس تصور کو فنا کرنے کا باعث بن جاتی ہے جس کے اقبال شارح ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جدید مادی علوم وفنون کے بغیر آج اقبال وہ کون سا جنگل آباد کرنا چاہتے ہیں جو انسان کے مادی تہذیب وتمدن کی جگہ لے سکے؟ اقبال کی فکر ایسا یوٹوپیا قائم کرنے میں ناکام ہے۔ انسانی تاریخ میں ایسے کسی گوشے کے آثار محفوظ نہیں ہیں۔ خود جدید فرنگی علوم وفنون کے ارتقا کا باعث بھی قدیم مادیت پسند یونانی دانش وحکمت، مسلمانوں کے دورِ عروج میں مسلمان فلاسفروں اور سائنسدانوں کے مادی علوم وفنون (جن میں تعقل پسند فلسفے کی روایت کے زیر اثر طب، فلکیات، علم ہندسہ، جغرافیہ، ریاضی، کیمیا، طبیعیات وغیرہ جیسے علوم میں ترقی، تجربہ گاہوں، لائبریریوں اور درس گاہوں کا قیام شامل تھا) اور پھر چودھویں صدی عیسوی سے مغربی احیائے علوم کی تحریک کا بتدریج فروغ اور تسلسل ہے۔ جدید مغربی علوم وفنون راتوں رات ہونے والا کوئی معجزہ نہیں ہیں؛ ان کے فروغ میں قدیم یونانیوں کا حصہ بھی ہے اور دورِ عروج کے مسلمانوں کا بھی۔ اس کے باوجود اقبال جدید مادیت پسند علوم وفنون کو کچھ اس انداز سے دیکھتے ہیں کہ جیسے عالمِ انسان سے کوئی بھیانک جرم سرزد ہو گیا ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ جن کتب کو یورپ میں دیکھ کر اقبال کا دل سی پارہ ہو جاتا ہے، مسلمانوں کی تحریر کردہ انھی مادی علوم وفنون پر مبنی کتب سے یورپ استفادہ کر کے اگر دنیا میں سرفراز ہوتا ہے تو پھر اقبال کو گلہ کیوں ہوتا ہے؟ مادی علوم وفنون، جن کی بنیاد تشکیک، تجربے، مشاہدے اور عقل پر ہے اور جنھیں اقبال مسلمانوں کے لیے زہر سمجھتے ہیں، اگر مسلمان کلامی، الٰہیاتی یا تاویلاتی مباحث میں الجھنے کی بجائے اپنے مادی علوم وفنون کو ترقی دیتے تو کیا جدید مادیت پسند تمدن کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہوتی؟ پھر اقبال کیا کرتے، کسے مطعون کرتے اور کسے ملعون قرار دیتے؟ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اقبال کا فلسفۂ خودی سوائے خود فریبی کے اور کچھ نہیں ہے۔ آتش رومی تو اپنے ناسوروں کے معالجے میں ناکامی کی معترف ہے؛ وہ ہندی مسلمان کے زخموں کا علاج کیسے کر سکتی تھی؟ وہ مولانا روم جو خود اپنے باطنی تجربات کے اظہار سے محروم تھے، ان کی فکر اوروں کے درد کا مداوا کیسے بن سکتی تھی؟ مثلاً ذیل میں دیے گئے ان کے شعر سے ان کی یہ بے بسی عیاں ہے:

کاش کہ ہستی زبانے داشتے   تا زمستاں پردہ ہا برداشتے

اے خدا بنما تو جاں را آں مقام کاندراں بے حرف می روید کلام

اقبال کا فکری المیہ بھی وہی ہے جو ان کے مرشد کا ہے۔ کہتے ہیں:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

اقبال کا فلسفۂ خودی زمانے کی حرکت اور تغیر سے بے نیاز ہے؛ نہ وہ اس کے ساتھ مقابلہ وموازنہ چاہتا ہے اور نہ ہی مکالمے کا خواہش مند ہے۔ ان کے نزدیک بندۂ خدا اور بندۂ زمانہ دو مختلف اور متضاد اوصاف کی حامل شخصیات ہیں، ان میں یکجائی ناممکن ہے:

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ

اے لاالٰہ کے وارث، باقی نہیں ہے تجھ میں گفتار دلبرانہ، کردار قاہرانہ

اقبال کا فلسفۂ خودی من کی دنیا کو آباد کرتا ہے جس کا کوئی خارجی یا مادی مظہر نہیں ہوتا، اس کے مظاہر بھی باطنی ہوتے ہیں جو سوز و مستی اور جذب و شوق کے نشے سے سرشار ہوتے ہیں جبکہ مادی علوم وفنون کے نتیجے میں مادی مظاہر پر مبنی انسانوں کا خارج میں مادی تمدن معرضِ وجود میں آتا ہے۔ خارجی زندگی میں صحت، تعلیم، روزگار، رہائش، انصاف، بنیادی شہری سہولیات، تعمیرات، صنعت، حرفت، سائنس، ٹیکنالوجی، پیداوار، انتظام وانصرام وغیرہ، زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق مادی علم اور تمدن کے مادی مظاہر کو بروے کار لایا جاتا ہے۔ باطنی زندگی میں ترقی کا تعلق چونکہ انسان کے داخل کے ساتھ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر فرد کا یہ ذاتی معاملہ ہوتا ہے؛ خارجی زندگی کے مظاہر پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ خارجی زندگی پر صرف خارجی امور سے متعلق شعور ہی کارگر ہوتا ہے۔ اقبال کا تصورِ خودی خارجی زندگی اور اس کے تمام شعبوں اور امور سے متعلق منفی رویہ رکھتا ہے اور فردِ واحد کی من کی دنیا کی سرمستیوں اور سرشاریوں کو مثبت قرار دیتا ہے:

من کی دنیا! من کی دنیا سوز و مستی، جذب و شوق تن کی دنیا! تن کی دنیا سود و سودا، مکر و فن

8

اقبال جب اپنے مخصوص فلسفۂ خودی کی تشریحات اور توضیحات کے ذریعے مغرب کے مادی

Scanned with CamScanner

علوم وفنون اور تمدنِ جدید کی حیثیت اور مقام کو نیچا دکھانے اور رد کرنے میں ناکام ہو گئے اور عہدِ حاضر کے مسلمانوں کی حالتِ زار نے انھیں مایوس، رنجیدہ، ملول اور ماضی پرست بنا دیا تو انھوں نے مغربی سرمایہ داری نظام کی مخالفت کو اپنے افکار و نظریات کے بچاؤ کے لیے بطور ڈھال استعمال کیا۔ اقبال نے اس بات کا جائزہ لینا ضروری نہ سمجھا کہ جس طرح جاگیرداری نظام راتوں رات قائم نہیں ہوا تھا اور نہ ہی وہ آنِ واحد میں رو بہ زوال ہو گیا، بالکل اسی طرح سرمایہ داری نظام بھی چند سرمایہ داروں کی سازش کے نتیجے میں اچانک معرضِ وجود میں نہیں آ گیا — اس کا آغاز چودھویں صدی عیسوی کی مغربی نشاۃ ثانیہ کی علمی و فکری تحریک سے ہوا اور اس کی انتہا بیسویں صدی کا پورا دورانیہ ہے۔ سرمایہ داری نظام کی ترقی اور کامیابی میں اگرچہ سرمائے ہی نے مرکزی کردار ادا کیا لیکن اس کے پہلو بہ پہلو مغربی دانش و حکمت، تعقل پسندی، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ہمہ وقت ترقی، سائنس دانوں، انجینئروں، منتظمین کی محنتوں، جاگیرداری اور شہنشاہی روایات و اقدار کے خلاف بغاوتوں، بڑی صنعتوں کے قیام، بینکوں، تجارتی و مالیاتی نظم و ضبط سے متعلق اداروں، نئی نئی زمینوں کی دریافت، سیاست و معیشت کے ماہرین، مادیت پسند فلاسفہ، مزدوروں اور کسانوں نے ایک بہت بڑے ہدف کے حصول کے لیے انسانی ہمت، جرأت اور لیاقت کی عظیم تاریخ کو مرتب کیا۔ اس بڑے کُل کے اجزائے ترکیبی میں وطنیت اور قومیت پرستی، نسلی افتخار اور احساسِ برتری اور مغربی نو آبادیاتی نظام کے تحت محکوم اقوام کے ساتھ جبری تجارتی معاہدوں کی سیاست بھی شامل ہے۔ محض آخر الذکر ہی کو کُل قرار دے دینا سرمایہ داری نظام کی تاریخ کو تعصب کی آنکھ سے دیکھنے کے مترادف ہے۔ 1917 کے اشتراکی انقلاب کے بعد تو یہ آنکھ کچھ زیادہ ہی بیدار ہو گئی، یہاں تک کہ اسی بنیاد پر اقبال تو کیا، ان جدید دانشوروں سے لے کر کٹھ ملاؤں تک میں سرمایہ داری نظام کی مخالفت فیشن کی طرح سرایت کر گئی جو خود جاگیرداری نظام میں زندہ تھے۔

یہاں سرمایہ داری نظام کی مخالفت یا موافقت میں دلائل دینا مقصود نہیں ہے، صرف اس بات کا جائزہ مطلوب ہے کہ قبائلی و جاگیرداری نظام کے مقابلے میں سرمایہ داری نظام کے ارتقا کو ٹھوس مادی تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ وہ مغربی اقوام کہ جنھوں نے جاگیرداری اور بادشاہی نظام کے خلاف طویل اور صبر آزما جدوجہد کی، انھوں نے جاگیرداری اور

Scanned with CamScanner

بادشاہی نظام کو ختم کر دیا۔ جس طاقت نے صدیوں پر محیط کہنہ جاگیرداری نظام اور بادشاہی روایات و اقدار کا خاتمہ کیا اس کا نام صرف سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ یہ نئی ابھرنے والی طاقت اپنے جلو میں انسانی مستقبل کے نئے امکانات اور اہداف کو لے کر منظر عام پر آئی۔ ان اہداف کے حصول کے لیے محض 'مزدور کا خون نچوڑنا' جیسی اصطلاح ہی کارگر نہیں تھی بلکہ اس طاقت کو موثر بنانے کے لیے جدید طرزِ معیشت کے تقاضوں کے پیش نظر مادی علوم و فنون کے فروغ کے لیے سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، پولی ٹیکنک اداروں، تحقیق کے اداروں اور لیبارٹریوں کی ضرورت کے ساتھ ساتھ موثر سماجی اور معاشی انفراسٹرکچر کی بھی ضرورت تھی۔ لہٰذا اس کے لیے سڑکیں، پُل، ہسپتال، ریلوے ٹریک، انڈسٹریل زون، رفاہِ عامہ سے متعلق ادارے اور سپر سٹرکچر کی تشکیل کے لیے آزاد عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ کے اداروں کے قیام کے عمل کو بھی وسعت دی جاتی رہی۔ یہ محض سرمایہ دار کے دو ہاتھوں یا اپنے معروف معنوں میں محض 'مزدور' کی محنت کا اعجاز نہ تھا، اس میں معاشرے کے تمام طبقات کی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں اور لیاقتوں کی کھپت ہوئی۔ جاگیرداری نظام میں رہنے والے ہمارے فیشن پرست اشتراکیوں کی فکری جارحیت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ وہ جدید مادی تمدن جس کی بنا طبقاتی معاشرے کی اجتماعی جدوجہد کے ثمر پر رکھی گئی، اس پر صرف ایک طبقے یعنی 'مزدور' کو مسلح جدوجہد کے ذریعے مکمل قبضے کی دعوت دے دی گئی۔ اگر کسی کارخانے، فیکٹری یا مل کو محض مزدور کی محنت اور لیاقت نے قائم کیا ہوتا تو یہ قبضے کی بات درست بھی لگتی۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہیں تھا— سرمایہ دار کے علاوہ صنعتوں کے قیام میں سائنسدان، انجینئر، فنی ماہرین، منتظمین اور دیگر شعبوں سے متعلق افراد اور ادارے بھی اپنی اپنی ذمہ داریوں کو موثر بناتے ہیں۔ تنہا مزدور نہ سائنسدان ہے نہ انجینئر، نہ فنی ماہر، نہ منتظم اور نہ مالیاتی و تجارتی شعبوں کا کارپرداز۔ لیکن سرمایہ دار کو کمینہ اور ہوس کا بندہ، اور سائنسدانوں، انجینئروں، پروفیسروں، فنی ماہرین، منتظمین اور مالیاتی و تجارتی شعبوں سے متعلق افراد کو دلال یا پیٹی بورژوا قرار دے دیا گیا۔ مزدوروں کو ایسی استحصال زدہ مخلوق قرار دیا گیا جس میں پورے سرمایہ داری نظام میں لٹنے، پٹنے اور برباد ہونے کا کوئی شعور نہ تھا۔ مزدوروں کے ساتھ محبت و الفت کے اظہار میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر یہ محبت و الفت معاشرے کے دیگر طبقات کی قیمت پر فراہم کی جاتی ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ مزدوروں کی حکومت میں بھی پروفیسر، انجینئر، وکیل، سائنسدان اور تجارتی و

مالیاتی امور کے ماہرین مزدور نہیں بن جاتے؛ ان سب کی سرگرمیاں ان کے مخصوص شعبوں کو ترقی دیتی ہیں اور مزدور اپنے شعبے میں ترقی کرتا ہے۔

مزدوروں کو برا یا اچھوت سمجھنا سرمایہ داری نظام کے ارتقا میں ایک وقتی اخلاقی بحران کی صورت میں آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سرمایہ دار نے جاگیرداری نظام کو شکست فاش دی تو کچھ عرصے کے لیے اس میں بھی اس کے تہذیبی حافظے میں موجود جاگیردارانہ رعونت نے اپنا اثر دکھایا۔ سرمایہ داری نظام نے جدید تمدن کی استواری کے لیے جو انفراسٹرکچر اور سپر سٹرکچر وضع کیا تھا اس کے نتائج نے بالآخر سرمایہ دار کو نئی تہذیبی قدروں سے ہم آہنگ کرنے میں مدد فراہم کرنا شروع کردی۔ ایسا نظام جس میں مزدوروں کی ہتک کو بنیاد بنایا گیا ہو، کسی بھی نوع کی فلاحی ریاست کے قیام کے لیے مکمل طور پر ناموزوں ہوتا ہے۔ جمہوریت کے جدید ریاستی تصور نے جاگیرداری نظام یا کمیونزم سے درس حاصل نہیں کیا بلکہ اس نے سرمایہ داری نظام میں مختلف طبقات کی اجتماعی جدوجہد کے شعور سے جنم لیا ہے۔ جمہوری حقوق کے نام پر آج جن مختلف دانشوروں یہاں تک کہ مذہبی سکالروں کی رال ٹپکتی ہے، وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جدید علوم وفنون کے حصول، سائنس اور ٹیکنالوجی میں مختلف طبقات کی اجتماعی جدوجہد، جاگیردارانہ نظام کے خاتمے اور سرمایہ داری نظام کے قیام کے بغیر ان جمہوری حقوق کا حصول ناممکن ہے۔ ان سب عناصر کی موجودگی کے بغیر محض جمہوری اداروں کے قیام سے نہ تو جمہوری حقوق حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی جدید فلاحی ریاست کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یورپی اور امریکی سرمایہ داری نظام کی تاریخ کے ٹھوس شواہد اور حقائق نے ہمیں یہی سبق دیا ہے۔

سرمایہ داری نظام کی تاریخ کا وہ حصہ جو نوآبادیاتی نظام کی اصطلاح سے یادگار ہے، تاریخ کے اس حصے کے متعلق بھی جذباتی اور سطحی نوعیت کی دانش کو اکثر بروئے کار لایا جاتا رہا ہے۔ اس کا تجزیہ تاریخ کے ٹھوس اور مادی حقائق کی روشنی میں کرنے سے گریز کی روش کو اختیار کیا گیا اور تاریخ کا مطالعہ وقوعات کی بجائے اخلاقی بنیادوں پر کیا گیا۔ اٹھارھویں صدی میں مغربی صنعتی انقلاب کا برپا ہونا شاہانہ اور جاگیردارانہ نظامِ معیشت کی شکست کی نوید ثابت ہوا۔ سرمایہ دارانہ نظام، جو ایک واحد نئی قوت کے طور پر سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر ابھر رہا تھا، جس نے خود بادشاہ اور جاگیردار کا لینے والا ہاتھ توڑ دیا تھا اور کسی بھی طور ان کے ساتھ شراکت پر آمادہ نہ ہوا، جب علاقائی سطح پر کامیاب و

Scanned with CamScanner

کامران ہوا تو ضروری تھا کہ وہ اپنی سرحدوں سے باہر نکلے۔ چنانچہ عالمی سطح پر وہ تمام ممالک جو ابھی تک جاگیردارانہ اور شاہی طرزِ سیاست اور نظامِ معیشت پر انحصار کر رہے تھے، سرمایہ داری نظام کا منطقی طور پر ہدف بن گئے۔ وہ سرمایہ داری نظام جس نے اپنے قومی جاگیرداروں اور بادشاہ کو معاف نہیں کیا اور بطور ایک نئی قوت کے ان کی جگہ لے لی، اس سے یہ اخلاقی توقع رکھنا کہ وہ 'اغیار' کے جاگیردارانہ اور شاہانہ نظاموں کو اکیلے مال ہڑپ کرتے رہنے کی کھلی اجازت دیے رکھتا، تاریخی منطق کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صنعتوں کو اپنے پیداواری اہداف کو پورا کرنے کے لیے خام مال کی لازمی ضرورت تھی، اس لیے اس ضرورت نے سرمایہ داری نظام کو اپنی سرحدوں سے باہر نکلنے میں مدد دی؛ جبکہ تیسری دنیا کی جاگیردارانہ اور آمرانہ طرزِ معیشت خام مال کی پیداوار اور دستکاری کی سطح سے نہ اٹھی تھی، لہٰذا اس طرزِ معیشت کا عالمی معاشی مسابقت میں صنعتی ممالک کے ساتھ مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تاریخ درست اور غلط فیصلوں کا انتخاب نہیں کرتی بلکہ یہ فیصلہ خود اقوام کو کرنا پڑتا ہے۔ یہ فیصلے بھی اچانک نمودار نہیں ہوتے بلکہ ایک تسلسل کے ساتھ سیاسی، سماجی اور معاشی سرگرمیوں کے نتائج مرتب ہوتے رہتے ہیں جو بالآخر ایک خطے میں صنعتی انقلاب کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں اور دوسرا خطہ اس تمدن جدید کے تمام تقاضوں سے محروم رہ جاتا ہے جسے صنعتی انقلاب فروغ دیتا ہے۔ اقوام کو جرمِ ضعیفی کی سزا کوئی دوسری قوم آ کر نہیں دیتی بلکہ سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی ضعف خود اقوام کو مجرم بنا دیتا ہے؛ دوسری قوم آ کر محض کردار ادا کرتی ہے۔

تیسری دنیا کے جاگیردارانہ اور شاہی تہذیب و تمدن میں عالمی سرمایہ دارانہ بنیادوں پر ابھرنے والی نئی قوت کے مقابلے کے لیے بیداری نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ تیسری دنیا کی بیشتر اقوام ڈیڑھ دو سو سال گزر جانے اور آزادیوں کے حصول کے باوجود نوآبادیاتی مقاصد کے حصول کے لیے قائم کیے جانے والے یہاں کے انفراسٹرکچر کو دیکھ کر آج بھی محوِ حیرت ہیں۔ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو چیلنج کرنے کے لیے آج بھی کوئی موثر متبادل نظام نہیں ہے۔ تیسری دنیا کی جن اقوام نے اس زندہ حقیقت کا ادراک کر لیا انھوں نے خود سرمایہ دارانہ بنیادوں پر اپنے تمدن جدید کو استوار کیا اور اپنے قبائلی و جاگیرداری نظاموں اور ان پر قائم نوآبادیاتی تسلط کو توڑ کر عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ معاشی مسابقت کی دوڑ میں شریک ہو گئیں۔ دوسری طرف تیسری دنیا کی وہ اقوام ہیں جو سرمایہ داری نظام کی بنیادوں پر قائم تمدنِ

جدید کے مظاہر کو گناہِ کبیرہ سمجھتی ہیں لیکن امریکی استعمار کے جدید نوآبادیاتی تسلط کو بھی کمزور نہیں ہونے دیتیں۔

اقبال نے اپنی شاعری میں سرمایہ داری نظام کی تاریخ سے تاریخی مادی حقائق کی روشنی میں نتائج اخذ کرنے کی بجائے اپنے من پسند نتائج اخذ کیے ہیں۔ ان کے ان نتائج کو ان کے مخصوص نظامِ فکر کی ماورائیت سے جدا کر کے دیکھنا بہت بڑی فکری بددیانتی ہے۔ ہمارے اکثر ترقی پسند ناقدین اور دانشور حلقے اس بددیانتی کے پورے پورے مرتکب ہوئے ہیں۔ وہ ترقی پسند فکر جس نے سائنسی علوم وفنون، جمہوری اداروں اور انسانی حقوق کے شعور کے ذریعے جدید مغربی مادی تمدن کی آبیاری کی، اقبال اس کے سخت مخالف بلکہ دشمن ہیں۔ جب وہ سرمایہ داری نظام کی مخالفت کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ جدید سرمایہ دارانہ مادی تمدن کے مقابلے میں کسی دوسرے مادی تمدن کے تصور کو پیش کرنا چاہتے ہیں؛ وہ سرمایہ داری نظام کے خلاف بھی صرف اور صرف اس لیے ہیں کہ وہ سرے سے مادی تمدن ہی کے خلاف ہیں۔ مادی تمدن کے جدید ترین تصور نے چونکہ سرمایہ داری نظام کی کوکھ سے جنم لیا، یہی وجہ ہے کہ اقبال کے ہاں قبائلی، جاگیردارانہ اور شہنشاہی تمدن پر تنقید مقابلتاً کم ہے جبکہ جدید سرمایہ داری تمدن کو انھوں نے آڑے ہاتھوں لیا۔ اسی سرمایہ داری نے مادیت پسند فکر کو ایک بھرپور اور جیتا جاگتا فلسفۂ حیات فراہم کر کے جدید مادی تمدن کی عمارات کو استوار کیا۔ اقبال سرمایہ داری نظامِ فکر کے دشمن کم لیکن اس کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والی مادی تمدن کے دشمن زیادہ ہیں۔ ان کے سوز وسازِ رومی، عشق ومستی، رازہائے درونِ مے خانہ، افلاک اور ان سے پرے کی دنیاؤں، خلاؤں اور ان کی انتہاؤں، تصورِ خودی اور ذوقِ آگہی کے باطنی مدارج کا سب سے بڑا دشمن بھی جدید مادی تمدن ہے۔ یہ تمدن ان کے روحانی رومان کو مجروح کرتا ہے۔ وہ اپنی رجعت پسند روحانی شناخت کے احیا کے لیے تمدنِ جدید اور سرمایہ داری نظام کے مخالف ہیں۔ مادی تمدن کی کوئی بھی جدید شکل ان کے فکری منطقے سے خارج ہے۔ پس جب ترقی پسند دانشوران کی سرمایہ داری نظام کی مخالفت کو اپنے فکری مقاصد کے فروغ کے لیے استعمال کرتے ہیں تو خود بھی ایک دھوکے کا شکار ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس میں شریک کر لیتے ہیں۔ لیکن مسئلہ اس سے بھی زیادہ تب سنگین ہوتا ہے جب فکرِ اقبال کو ایک مقدس صحیفہ قرار دینے والے اقبال پرست، جدید مادی تمدن کی فیوض و

Scanned with CamScanner

برکات سے 'فائدہ ومنافع' اٹھانے کے باوجود، فکرِ اقبال کے تحت مادی تمدن کی بے راہ روی، فحاشی و عریانی، اخلاقی زوال، دائمی اقدار کی شکست اور روحانیت کے ضعف کا رونا روتے ہیں۔ فکرِ اقبال سے متعلق ترقی پسند دانشوروں سے بھی کہیں زیادہ گمراہ یہ لوگ ہیں۔ اقبال آج زندہ ہوتے تو ان منافقین کی خوب خبر لیتے اور ان کی نام نہاد 'جدید اسلام پسندی' کا خوب مذاق اڑاتے۔

بیسویں صدی کی چالیس کی دہائی سے برصغیر پاک وہند اور عالمی سطح پر سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے خود مشرق اور اسلامی دنیا میں اقبال کے فکر وفلسفہ کو متروک قرار دے دیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس عرصے میں سرمایہ داری نظام، جدید مادی تمدن، مادی علوم وفنون میں ترقی، ٹیکنالوجی کی نئی نئی شکلوں اور جہتوں، انسانی حقوق کے عالمی معیارات اور جمہوریت کی سیاسی، سماجی اور معاشی حکمت عملیوں کی موجودگی میں ان سب سے انکار کے لیے اقبال جیسا جگر کسی بھی دانشور کے پاس نہ رہا۔ چنانچہ یہی ضروری سمجھا گیا کہ فکرِ اقبال سے مسخ شدہ رہنمائی لے کر مادی تمدنِ جدید کے عالمی پھیلاؤ کی زندہ حقیقت کے پیشِ نظر اس کی بیماریوں کا علاج تجویز کیا جاسکے، جبکہ فکرِ اقبال کے تحت اس کا علاج بجز فریب اور دھوکے کے کچھ نہیں۔ اقبال اپنی نظم ''طلوعِ اسلام'' میں واشگاف اور دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اقبال تہذیبِ حاضر کے تاریخی ارتقا اور اس کے فروغ اور حصول میں انسانی عظمتِ کردار کو خاطر میں لائے بغیر، تمدنِ جدید، سائنس، ٹیکنالوجی، مادی علوم وفنون میں ترقی، انسانی حکمت ودانش کے کمال، تدبر، تعقل اور سرمایہ داری کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک کر لے جاتے ہیں اور اس سب کو محض سرمایہ داری نظام کی سازش، خون خرابے اور ہوس سے تعبیر کردیتے ہیں۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ اقبال انسانی لیاقت کے اس جوہر کو جو انسانی تمدن کے لیے مادی مظاہر کی تشکیل وتعمیر میں معاون ثابت ہوتا ہے، ہوس، فریب، کمینگی، کوتاہ اندیشی اور ظلم سے تعبیر کرتے ہیں۔ مادی علوم وفنون چونکہ اس جوہر کو مزید نکھارنے اور چمکانے کی تعلیم دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

انسانی عقل کے خلاف محاذ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اپنی مخصوص طرزِ فکر کے باعث مغرب سے ان کی مخاصمت اور عہدِ حاضر کے مسلمان علما کی حالتِ زار نے ان کے احساسِ کمتری کو دوآتشہ کر دیا۔ ان کی معروف نظم ''شکوہ'' تمدنی تقابل سے اٹھنے والے اس احساس کی بہترین ترجمان ہے۔ ان کی ایک غزل کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں:

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں　　مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند
احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر　　تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند
فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا　　افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند
چُپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال　　کرتا کوئی اِس بندۂ گستاخ کا منھ بند

اقبال کی مایوسی اور افسردگی کی وجہ محض عہدِ حاضر کے مسلمانوں کی پریشان کن حالتِ زار کو بھی قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ تمدنِ جدید کی نیرنگیوں اور اس کے بغیر کسی چھوٹی بڑی رکاوٹ کے ہمہ گیر پھیلاؤ نے فکرِ اقبال کے اونٹ کو کسی کروٹ نہ بیٹھنے دیا۔ اس بے چینی کا ردعمل یہ نکلا:

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں　　نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت　　بنائے خوب آزادی نے پھندے

9

آج بہت سے اقبال خواں جمہوریت کا راگ الاپتے ہیں — اس کی وجہ اقبال کی فکر سے روگرانی نہیں ہے بلکہ جمہوری اداروں اور حقوق کا شعور ہے۔ اقبال اپنی نظم ''خضرِ راہ'' میں سرمایہ داری نظام اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والی جمہوریت، دونوں کے بارے میں اپنے تحفظات کا اعادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق　　طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

Scanned with CamScanner

یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں!
آہ اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تُو اِس سرابِ رنگ و بُو کو گلستاں سمجھا ہے تُو

اس پورے بند میں اقبال نے سرمایہ داری نظام اور اس کی جمہوریت کو ایک ہی سکّے کے دو رُخ قرار دیا ہے۔ یہ بات تاریخی اعتبار سے درست بھی ہے لیکن اس بات کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ جمہوریت کی آڑ میں دراصل سرمایہ داروں کی آمریت چھپی ہوئی ہوتی ہے، تو یہ درست نہیں ہے۔ مغرب میں بھی سرمایہ دارانہ اشرافیہ بہت قلیل تعداد میں ہے جبکہ درمیانہ اور نچلے درمیانہ طبقات اپنی عددی حیثیت کی بنا پر جمہوری اداروں میں موثر ترین کردار ادا کرتے ہیں۔ قانون سازی، مالیاتی و تجارتی معاملات اور دیگر سیاسی و سماجی امور میں، بشمول سرمایہ دار طبقہ، مشترکہ اکثریتی فیصلوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ سرمایہ دار ہی کی من مانیوں پر پورے ریاستی ڈھانچے کو اگر چھوڑ دیا جائے تو یقیناً آمریت کی ہر مکروہ شکل کو سامنے آنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ دیگر طبقات کی سیاسی و معاشی جدوجہد مساوی جمہوری حقوق کے حصول کے لیے بتدریج موثر ہوتی چلی گئی ورنہ سرمایہ دار کو فلاحی ریاست کے قیام کا بخار ہرگز نہ چڑھتا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی حاصلات میں محض سرمایہ دار کی محنت، توجہ اور لیاقت کو ہی دخل حاصل نہیں ہوتا بلکہ دیگر طبقات بھی اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان سب کی سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر مجموعی عملی سرگرمیوں کے نتیجے میں جمہوریت اور رفاہِ عامہ کے تمام ادارے ترقی پذیر ہوتے ہیں اور معاشرے کو اجتماعی سطح پر ترقی اور خوشحالی کی جانب لے جاتے ہیں۔ جس طرح سرمایہ دار اپنی ضروریات اور مفادات کے حصول کے لیے ریاستی اور نجی سطح پر اقدامات کا خواہش مند ہوتا ہے بالکل اُسی طرح معاشرے کے دیگر طبقات ریاستی اور نجی سطح پر اپنے مفادات کے حصول کے لیے اقدامات کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ جمہوریت تمام طبقات کی خواہشات میں قدرے توازن کی سطح کو استوار کرنے کے بعد کوئی نہ کوئی مشترکہ لائحۂ عمل تلاش کر لیتی ہے جسے بعد میں قانون کی شکل میں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ یہاں محض سرمایہ دار کی چالبازی اور مکروفریب کام نہیں آتے اور نہ ہی دیگر طبقات کم عیار ہوتے ہیں۔ مزدور بھی ایسی سادہ و معصوم مخلوق نہیں ہوتے، وہ بھی اپنے طبقاتی حقوق کے شعور سے آگاہ ہوتے ہیں۔ یہ آگاہی انھیں سرمایہ داروں اور دیگر طبقات کی طرح جدوجہد، طریقۂ کار، فکری اور عملی ارتقا کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ مجالسِ آئین و اصلاح میں اگر گرمیِ گفتار

رنگ لانے میں ناکام ہو جاتی تو یقیناً مغربی تہذیب وتمدن کی حالت مشرق سے بھی بدتر ہوتی۔ اقبال جب مغربی اصولِ جمہوریت کی مخالفت کرتے ہیں تو یہ اجازت نہ تو اسلام کے نظامِ خلافت کا ہے اور نہ ہی مارکسی تنقید کا؛ بلکہ اقبال کے نزدیک اس کا مطلب مادی تمدن کے قیام کے لیے بروئے کار لائے جانے والے انسانی فہم وتدبر کی نفی کرنا ہوتا ہے، جمہوریت کے مقابلے میں حسبِ حال کوئی دوسرا نظریۂ سیاست جو مادیت کو بنیاد بناتا ہو، پیش کرنا نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کو اقبال کا پیغام ان کی مخصوص فکر کا عکاس ہے کہ کہیں مسلمان بھی جمہوریت کے راستے اپنے حقوق کا شعور حاصل کرتے ہوئے انسانی فہم وفراست کے تحت تمدن جدید کی مادی دنیا کی خرافات میں پڑ کر عاقبت نہ تباہ کرلیں۔ وہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والوں سے محبت کرتے ہیں مگر کائنات کی تسخیر سائنس اور ٹیکنالوجی کے مادی وسائل کی بدولت نہیں بلکہ محض باطنی حوالے سے کرنے کو کہتے ہیں، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ نوجوانوں کی نگاہ ستاروں پر ہے اور پاؤں زمین سے بندھے ہوئے ہیں۔

10

نظم ''خضرِ راہ'' میں ایک جگہ اقبال عجیب صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں اور ان کے کلام سے وہ بات بھی سرزد ہو جاتی ہے کہ جو ان کے پورے فکری ڈھانچے کو گرا دینے کے لیے کافی ہے:

کیا سناتا ہے مجھے ترک وعرب کی داستاں — مجھ سے کیا پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز وساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

یعنی میراثِ خلیل کے وارث وہ ترک وعرب مسلمان کہ جنھوں نے مادی علوم وفنون میں زبردست ترقی کی اور اقوامِ عالم میں ممتاز ہوئے، اُن کے سائنسدانوں اور حکیموں نے کائنات اور انسانی سماج کا مطالعہ کیا اور انسانیت کو نسخہ ہائے وفا عطا کیے: اب وہ میراث ان سے چھن چکی ہے اور اسی علمی، فکری اور فنی میراث پر مغربی تمدن نے اپنی بنیادیں استوار کرلیں۔ یہاں اس سے مراد اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اپنے عہد کا جدید ترین مادی تمدن مسلمانوں کے جن سائنسی، سماجی اور معاشی علوم کی بنیاد پر قائم

Scanned with CamScanner

ہوا تھا، اب وہی علوم مغربی مادی تمدن کی آبیاری کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ اقبال کی مغرب سے محض مخاصمت نہیں تو اور کیا ہے؟ مسلمان اگر مادی سطح پر دنیا میں ترقی کریں اور سرفراز ہوں تو سبحان اللہ! اگر مغربی اقوام کریں تو لعنت اللہ! یہ کہاں کا انصاف ہے؟ بظاہر اقبال کا دعویٰ تو یہ ہے:

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ خواجگی نے خوب چُن چُن کر بنائے مُسکرات

لیکن وہ خود اپنے فکری حوالوں میں نسل، قومیت، حرم، سلطنت، تہذیب اور رنگ کی خواجگی میں پیش پیش ہیں۔ مشرق اور مسلمانوں کے لیے عرب، ترک، افغان بنیادوں پر نسل پرستی، مذہبی بنیادوں پر احساسِ قومیت، حرم کی پاسبانی، سلطنت کا عروج، تہذیبی فتح اور طاقت کا غرور سراسر جائز اور حلال ہے، لیکن مغرب کے لیے حرام ہے؟ اقبال اگر اپنی فکر میں ان نسلی، قومی، مذہبی اور تہذیبی بنیادوں پر مغرب سے تصادم نہیں چاہتے تو پھر کیا چاہتے ہیں؟

اقبال کے شارحین بھی فکرِ اقبال کے تعصبات سے ہم آہنگ ہیں۔ اس نوع کے سوالات کا جواب بھی ان کے ذہنی دائرے کی تشکیل سے باہر ہے۔ علی عباس جلالپوری نے اپنی کتاب اقبال کا علمِ کلام میں کسی قدر ان جوابات کی فراہمی کی جرأت مندانہ کوشش کی ہے لیکن وہ بھی اپنے ترقی پسند تصورِ جہاں بینی کے باعث اقبال کے سرمایہ داریت کے خلاف فکری محاذ کے مداح ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے تمدن جدید کی تاریخ کو سائنسی اندازِ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے سے قدرے گریز کیا ہے۔ اسی طرح اقبال: ایک نئی تشکیل کے عزیز احمد اور چند دیگر دانشوروں نے مغربی تہذیب و تمدن کی شدید مخالفت کے باوجود اقبال کی نطشے، فشٹے، برگساں، کانٹ اور ہیگل جیسے جدید سرمایہ دارانہ مغربی تمدن کے نمائندوں کی خوشہ چینی کو جرأت کے ساتھ واضح کیا ہے۔ یہی بھول خود ان اقبال پرستوں نے اقبال کو عظیم ثابت کرتے ہوئے بھی کی ہے جن کا اوڑھنا بچھونا مدحِ اقبال کے سوا کچھ نہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم اس نوع کے ماہرینِ اقبالیات کے سرخیل ہیں۔

11

دانشوروں کے بعض حلقوں میں اقبال کی نیم اشتراکیت پسندی کو بھی موضوع بنایا جاتا ہے اور

Scanned with CamScanner

اقبال کے اشتراکیت سے فیض حاصل کرنے کو عظمتِ اقبال سے تعبیر کیا جاتا ہے، کہ اقبال ایسے مومن ہیں جو حکمت کی تلاش میں کہاں کہاں نہیں بھٹکے! ایسے دانشور نہ اقبال دوست ہیں نہ اقبال دشمن؛ وہ اقبال کو جیسا بنانا چاہتے ہیں ویسا بنا لیتے ہیں۔ سرمایہ داری نظام اور تمدنِ جدید کے تاریخی ارتقا میں اشتراکیت واحد سیاسی و معاشی نظریہ ہے کہ جس نے بھرپور طریقے سے سرمایہ داری نظام کی مخالفت کو سائنسی اندازِ فکر پر استوار کرنے کی مربوط کوشش کی۔ اشتراکیت کا یہ نظریہ اور تحریک اپنے اندر آزادیِ افکار کا توانا اور غیر لچکدار عنصر رکھتی ہے۔ اس نظریے نے مذہب، کلیسا، جاگیردار، کسان، سرمایہ دار اور مزدور کی اصطلاحات کے نئے معنی متعین کیے اور تاریخ کے مادی تصور کو جدلیات کے نظریے پر استوار کیا۔ طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور خصوصاً معاشی حالات و واقعات کی روشنی میں عہد بہ عہد تاریخ کا جائزہ لیا گیا اور تاریخ کے عہدِ جدید یعنی سرمایہ دارانہ نظام کے فروغ کے عہد میں چھوٹے اور پسماندہ طبقات یا پرولتاریہ کو سرمائے اور پیداوار کے حصول کا تقریباً واحد محرک قرار دیا۔ افسوس کہ سرمایہ داری نظام میں اسی پرولتاریہ کو سرمائے اور پیداوار سے الگ رکھا گیا۔ پرولتاریہ کی محنت پر شب خون کے نتیجے میں جو قدرِ زائد حاصل ہوا، کارل مارکس نے اسے مزدوروں کے معاشی استحصال کی بدترین وجہ قرار دیا۔ بیسویں صدی میں سرمایہ دار مغربی ممالک میں انسانی حقوق کے شعور کی بنیاد پر مزدوروں کی جدوجہد اور جمہوری اداروں کے استحکام نے بھی اشتراکیت کو بطور 'اینٹی تھیسس' مقبول ہونے کی راہ میں بند باندھ دیا۔ سرمایہ داری نظام کے معاشی اور جمہوری نظام کے سیاسی ملاپ نے مغرب میں ایک ایسے مادی تمدن کو متعارف کرایا کہ جس کی تعمیر و تشکیل میں، بشمول سرمایہ دار اور مزدور، تمام طبقات کا اشتراکِ عمل شامل تھا۔

آزادیِ افکار کا وہ تصور جس کی بنیاد اشتراکی دانشوروں نے رکھی، اور آزادیِ افکار کا وہ تصور کہ جسے جمہوری حقوق کی ذیل میں مغربی سرمایہ دارانہ تمدن میں فروغ دیا، اقبال بنیادی طور پر اپنے مخصوص طرزِ فکر کے باعث آزادیِ افکار کے دونوں تصورات کے مخالف ہیں۔ مادی تمدن کی تشکیل میں، جسے اقبال کے اعتقادات اور نظامِ فکر کی حدود و قیود ناپسند کرتی ہیں، دونوں تصورات معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اپنی نظم ''آزادیِ افکار'' میں دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں:

جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
اُس قوم میں ہے شوخیِ اندیشہ خطرناک

گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

اقبال نے اپنی نظموں ''اشتراکیت''، ''کارل مارکس کی آواز''، ''بلشویک روس'' اور ''لینن (خدا کے حضور میں)'' میں اشتراکیت کی انقلابی روح، سرمایہ داری نظام پر اس کی تنقید اور مغرب میں اس کے باعث ہونے والی امکانی تبدیلیوں سے اپنی فکر کو موزوں کرنے میں کام تو لیا ہے لیکن اسے بطورِ نظام اپنے فکری ماخذات میں شامل کرنے پر ایک لمحے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ اشتراکی نظامِ معیشت وسیاست بھی انسان کے مادی علوم وفنون، انسانی اہلیت ولیاقت اور ان کی بنیاد پر مادی تمدن کی تشکیل ہی کا ایک ذریعہ اور، بقولِ مارکس، سرمایہ داریت کا ناگزیر اگلا مرحلہ ہے۔ چنانچہ اپنی نظم ''لینن (خدا کے حضور میں)'' میں وہ فیضانِ سماوی سے محروم تمدن کے کمالات کو ناپائیدار قرار دیتے ہیں اور مشین کو انسانیت کا دشمن قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و اِفلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

اقبال کے پختہ افکار یا آفاقی عقائد کا اپنا رومان ہے جو ارتقاپذیر انسانی علم وحکمت اور تدبر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ یہ رومان مادی حقائق وشواہد کے زندہ تغیرات سے فکر کی تشکیل پذیری نہیں کرتا بلکہ آفاقی متعینات سے متصف ہو کر ہمیشہ تنہائی اور بے بسی کا شکار ہو کر سوائے تماشائی بنا رہنے کے کچھ نہیں کر پاتا۔ اقبال ایک ایسے ہی تماشائی ہیں کہ جس کا تماشے کے بدلتے ہوئے مناظر کو دیکھ کر خون کھولتا رہتا ہے لیکن جو اس تماشے کی حقیقت سے ناآشنا رہتا ہے۔ ''مسجدِ قرطبہ'' میں اقبال ایک ایسے ہی تماشائی ہیں کہ جو کبھی ماضی کے دھندلکوں میں بھٹک کر عظمتِ رفتہ کے آثار کو بے بسی سے دیکھتے ہیں اور ''اوّل و آخر فنا'' کے منطقے پر پہنچتے ہیں اور کبھی عماراتِ محکم کو انسانی فہم وتدبر کی بجائے اپنے مخصوص فلسفۂ عشق کے معجزات قرار دے دیتے ہیں۔ عہدِ حاضر کی فکر کو ''کشتیِ نازک رواں'' سمجھتے ہوئے روحِ مسلمانی کو بیداری کا نسخہ تجویز کرتے ہیں لیکن افسوس یہاں بھی اقبال اپنے اس چہرۂ افکار سے پردہ نہیں اٹھاتے کہ جسے دیکھ کر فرنگ دنگ رہ جاتا۔ غرض اقبال انسانی تمدن کے مسائل کو انسانی

Scanned with CamScanner

تمدن کے زندہ وسائل سے حل کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ ان کی آفاقی روح عہدِ نو کا جو خواب دیکھتی ہے، عہدِ حاضر کا تفکر و تدبر اس خواب کی تعبیر کے لیے ناکافی بلکہ رکاوٹ ہے۔ یہ درست ہے کہ جمہوریت نے غربت و افلاس اور بے کاری پر مکمل قابو نہیں پایا لیکن یہ کہنا بھی غلط ہے کہ غربت و افلاس کو ختم یا کم کرنے کی تدابیر انسان کے ارتقاپذیر جمہوری حقوق کے تصورات، علوم و فنون اور تمدنِ جدید کے مظاہر نے اختیار نہیں کیں۔ عریانی و بے خواری اقبال کا اپنا کوئی اخلاقی مسئلہ ہے، تہذیب مغرب کا اس مسئلے کی خاص نوعیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ تعلیم مساوات دینے والے بعض سیاسی و معاشی حلقوں اور طبقات نے انسانی خون پسینے پر دادِ عیش دی لیکن ایسے ہی انسانی سماج میں ایسے سیاسی و معاشی حلقے اور طبقات بھی موجود تھے کہ جنھوں نے اس استحصال کے خلاف مسلسل جدوجہد کی، یہاں تک کہ ان کے مساوی نہ سہی، طبقاتی حقوق کے تحفظ کو ریاستی قوانین اور دساتیر میں محفوظ کیا۔ جمہوری حقوق کا تصور آسمانوں سے نازل نہیں ہوا بلکہ انسانی جدوجہد کے نتیجے میں فروغ پذیر ہوا ہے۔ فرنگی مدنیت ہرگز آئیڈیل نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی ارتقاپذیر تمدن آئیڈیل ہو سکتا ہے۔ اس میں تدبر بھی ہے حماقت بھی، کمال بھی ہے لغزش بھی، عیاری بھی ہے سادگی بھی، جھوٹ بھی ہے سچ بھی، ظلم بھی ہے ناانصافی بھی، اور تعمیر بھی ہے تخریب بھی۔ انسانی تہذیب ان تمام عناصر کے عالمِ انسان کو پہنچنے والے فوائد اور نقصانات کے پیشِ نظر تہذیب و تمدن کی بہتری کے لیے معیارات بھی قائم کرتی ہے اور قوانین بھی، اقدار کو بھی فروغ دیتی ہے اور روایات کو بھی۔ کیا فرنگی مدنیت ان اعلیٰ معیارات، قوانین، اقدار اور روایات سے یکسر خالی ہے؟ اقبال ان کا موازنہ روحِ مشرق سے کرتے ہوئے کیوں گھبراتے ہیں؟ تمدنِ جدید کو حیا سوز قرار دیتے ہی ماضی ہائے بعید اور مستقبل ہائے دور دراز میں کیوں بھٹکنے لگتے ہیں؟ گنبدِ نیلوفری کا راز داں حقائق کے دوسرے رُخ سے آنکھیں کیوں چراتا ہے؟ فکرِ اقبال کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس میں زمینی حقائق سے شعور کی نشوونما کی جرأت اور سلیقہ نہیں ہے۔

رہی بات فیضانِ سماوی کی، تو کم و بیش تمام اقوامِ عالم مختلف ادوار میں ہدایت کے سماوی سرچشموں سے فیض حاصل کرنے اور انھی سرچشموں کے طفیل تہذیب و تمدن کے لیے اعلیٰ معیارات قائم کرنے کی دعویدار رہی ہیں۔ انھی معیارات کی بنیاد پر انسانی تہذیب و تمدن نے اپنی ارتقائی

Scanned with CamScanner

منزلوں کو طے کرتے ہوئے نو بہ نو معیارات قائم کیے۔ وہ معیارات قصہ ہائے پارینہ بھی نہیں ہیں: ان کی مختلف فکری جہتیں آج بھی تہذیب وتمدن کے بعض شعبوں میں ایک تسلسل کے ساتھ موجود ہیں۔ انسانی تہذیب وتمدن کے وہ شعبے جو انسانی علوم وفنون اور مادی تمدن کے ارتقا کے نتیجے میں روحِ عصر کو متاثر کرتے ہیں، ان شعبوں میں رہنمائی کا وسیلہ عصر کے مسائل کی واقفیت، نوعیت، حیثیت، ہیئت، طریقۂ کار اور ذرائع سے حاصل ہوتا ہے، ماضی کے احیا کی خواہش سے نہیں۔ فکرِ اقبال انسانی تاریخ کی اس منطق کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

❄❄❄

دوسرا حصہ

فکرِ اقبال کا المیہ

(نقد ونظر بحوالہ تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ)

علامہ اقبال کے زیرِ بحث خطبات 'مدراس مسلم ایسوی ایشن' کی دعوت پر مرتب ہوئے اور مدراس، حیدر آباد اور علیگڑھ میں علامہ اقبال نے اپنے اِن خطبات کو پیش کیا۔ اِن خطبات کی پہلی اشاعت آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے زیرِ اہتمام 1930 میں منظرِ عام پر آئی؛ اس میں ابتدائی چھ خطبات شامل تھے لیکن ساتویں خطبے کے ساتھ دوسری اشاعت 1934 میں عمل میں لائی گئی۔ اقبال کے یہ خطبات زبانِ انگریزی میں ابتداً **Six Lectures on the Reconstruction of Religious Thought in Islam** کے عنوان سے شائع ہوئے، لیکن طبع دوم میں ساتویں

خطبے کی شمولیت کے بعد Six Lectures کے الفاظ حذف کر دیے گئے۔ سیّد نذیر نیازی نے خود اپنی خواہش اور علامہ اقبال کی فرمائش پر ان خطبات کے ترجمے کا بیڑا اٹھایا اور علامہ اقبال ہی کی تجویز پر تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کا عنوان ان خطبات کے لیے تجویز ہوا۔ کم از کم پہلے تین خطبے علامہ اقبال کی آرا کی روشنی میں ترجمہ ہوئے۔ ترجمے کی اس کتاب پر کام 1930 کے لگ بھگ شروع ہوا تھا جو ستائیس سال کے بعد طبع ہوئی۔ مذکورہ خطبات پر نقد و نظر کے لیے اسی ترجمے (تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ترجمہ سیّد نذیر نیازی، بزمِ اقبال، لاہور، 1983) کو منتخب کیا گیا ہے۔ ان خطبات کے دیباچے میں اقبال نے عصرِ حاضر میں سائنسی منہاج کے متوازی مذہبی یا صوفیانہ منہاج کو دریافت کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور مذہبی علم کو سائنس کی زبان میں سمجھنے کی کوشش کا دعویٰ کیا۔

اقبال نے اپنے اس دعوے کی بنیاد مذہب اور سائنس میں ہم آہنگیوں کے امکانی انکشاف کے تصور پر رکھی ہے۔ اقبال نے اسے مذہب کے حوالے سے ''تشکیلِ جدید کی خواہش'' کا نام دیا ہے۔ اپنے اس تصور کی وضاحت میں وہ کس حد تک کامیاب رہے؟ آئندہ بحث میں اس بات کا کھوج لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔

1

اپنے پہلے خطبے بعنوان ''علم اور مذہبی مشاہدات'' میں علامہ اقبال نے مذہبی مشاہدات کا مطالعہ صوفیانہ افکار و خیالات کی ذیل میں کیا ہے اور پھر اس بات کا موازنہ عام انسانی عقلی علوم کے ساتھ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال نے وائٹ ہیڈ کے حوالے سے یہ بات درست لکھی ہے کہ مذہب کے باعث انسان کے سیرت و کردار میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس بات کا اطلاق تو علوم کے دیگر شعبوں پر بھی کیا جا سکتا ہے؟ اقبال نے اپنے مذکورہ خطبے میں اس جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ انسانی زندگی مذہب کے ساتھ ساتھ دیگر سماجی علوم سے بھی رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ ان علوم کو اگر انسانی زندگی کے ارتقا سے نکال دیا جائے تو محض مذہبی افکار کے باعث

Scanned with CamScanner

انسانی سیرت اور کردار میں تبدیلی فرد کے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے عمل کو انتہائی محدود بنا دے گی۔ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے انسان کے خودساختہ تمدن پر اگر نگاہ دوڑائی جائے تو اس بات کا فوراً احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ مذہب کی نسبت دیگر انسانی مادی علوم کا ارتقا انسانی تاریخ میں زیادہ موثر ثابت ہوا ہے۔ تمدن کے یہ مظاہر محض اشیا نہیں ہیں بلکہ ان کا مقصد انسان کی سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی زندگی میں مسلسل غوروفکر کرنا اور اس کے مسائل کو حل کرنے اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مادی سرگرمیوں کو بروئے کار لانا ہے۔ کسی انتہائی قناعت پسند اور سادہ ترین طرزِ زندگی میں بھی زندگی کی بقا کے لیے، محدود پیمانے پر ہی سہی، مادی جدوجہد ناگزیر ہوتی ہے۔ فطرت کے اسباب خواہ کتنے ہی لامحدود کیوں نہ ہوں، انسانی تمدن کی تعمیر میں انسان کی مادی سرگرمیوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ انسان فطرت کی مادیت کو انسانی تمدن کی مادیت میں تبدیل کرنے کی کاہش اگر نہیں کرے گا تو علم کے اگلے درجے تک بھی نہیں پہنچ پائے گا۔

مذہب کے لیے سائنس سے بھی ایک قدم آگے کسی عقلی اساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کے اس تصور کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ سائنس چونکہ مادیات پر تفکر کے باعث معروض کے ٹھوس شواہد پر حقائق کو منظرِ عام پر لاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ سائنس بطورِ علم شواہد کی نو بہ نو دنیاؤں کے دریافت کے ساتھ ساتھ مسلسل ارتقا پذیر رہتی ہے، جبکہ مذہب کی بنیاد بہت کچھ شواہد کی بجائے عقائد پر ہوتی ہے۔ شواہد اور اخذ و استفادہ کی دنیا خواہ کتنے ہی روپ کیوں نہ دھار لے، عقائد اپنی جگہ ہمیشہ برقرار رہتے ہیں۔ پس مذہب کو بطورِ علم کسی عقلی، مادی یا سائنسی اساس کی ضرورت تو ہو سکتی ہے لیکن وہ اس کا محتاج محض نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں سائنس کی اساس ہی عقل پر ہے۔ اقبال اگر یہ کہتے ہیں کہ حقائق کا معروضی علم اشتباہ پیدا کر دیتا ہے تو وہ درست کہتے ہیں، کیونکہ سائنس کی حقیقی روح متعینات کی بجائے تشکیک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے مذہبی مشاہدات کو سائنس کی بجائے کہیں اور دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے بقول:

> مذہب فلسفے کا کوئی شعبہ نہیں کیونکہ یہ محض فکر ہے نہ احساس، نہ عمل بلکہ انسان کی ذاتِ کلّی کا مظہر ہے۔ لہٰذا فلسفہ مجبور ہے کہ مذہب کی قدر و قیمت کے باب میں اس کی مرکزی حیثیت کا اعتراف کرے۔ (ص 30)

Scanned with CamScanner

انسانی سماج میں مذہب کی افادیت اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے، یہ اپنے حصے کا کردار ہمیشہ سے ادا کرتا رہا ہے، لیکن مذہب کے علمی دفاع میں اقبال انتہا پسندی کا شکار ہوئے ہیں۔ مذہب کی اہمیت اور افادیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہب کے علاوہ علوم کے دیگر شعبے، خصوصاً سائنس اور فلسفہ، اپنے آپ کو مذہب کے مکمل طور پر تابع کر دیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسانی علوم کا ہر شعبہ آزاد حیثیت بھی رکھتا ہے اور دیگر علوم سے تعلق بھی۔ ان علوم کے ارتقا میں ان علوم سے متعلق اصول و قوانین اور مبادیات نے حقیقی کردار ادا کیا ہے نہ کہ مذہب نے۔ انسان کی کوئی ''ذاتِ کلّی'' بھی نہیں ہوتی؛ تمدن میں علوم وفنون اور انسانی سرگرمیاں اور انھی کی نسبت سے انسانی فکر بھی ہمیشہ ارتقا پذیر رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ فرد کی ذات بھی ارتقا پذیر رہتی ہے۔ کسی بھی نوع کے علم وفن اور فکر کا کوئی منتہا نہیں ہے اور نہ ہی کسی علم سے متعلق اصول اور قوانین حتمی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی کسی ذاتِ کلّی کا ظہور پذیر ہونا امکان سے باہر ہے۔ اس کی دسترس میں جو کچھ آتا ہے وہ اس سے اسی قدر آگاہ ہوتا ہے؛ اس کی دسترس میں ''کُل'' نہیں آسکتا، پس ذاتِ کلّی کی تکمیل بھی ناممکن ہے۔ محض اپنے علم، فن اور دانش پر گھمنڈ کرنے والے کو اگر معاشرے میں جاہل کہا جاتا ہے تو ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ علم اور فن کی اگر کوئی انتہا نہیں ہے تو کوئی فرد ذاتِ کلّی کے ظہور کا اعلان کیسے کر سکتا ہے؟ اس بات کے ازالے کے لیے اقبال نے فکر اور وجدان کو باہم ملا دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ''محتاج'' ہیں۔ وجدان ایک صوفی کا باطنی تجربہ ہو سکتا ہے لیکن اس تجربے میں مادی وسائل بروئے کار نہیں لائے جاتے، کیونکہ وجدان مادیت سے پرے کسی ان دیکھے جہانِ مطلق کے مشاہدے کا دعویٰ ہوتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ علم یا فکر کی بنیاد یہی دیکھا ہوا مادی جہان ہے، اور یہ علم یا فکر اچانک کسی فلسفی، سائنسدان یا سماجی علوم کے ماہر کے قلب پر وارد نہیں ہو جاتا بلکہ علم کے ہر شعبے میں مسلسل تدبر اور تحقیق کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ انسان کا تجزیاتی ذہن نتائج کا تار و پود ترتیب دیتا ہے اور پھر اخذ و استفادے کے بعد کسی منطقے تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اقبال چونکہ انسان میں ذاتِ کلّی کا مظہر دیکھنا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے فکر کے ساتھ وجدان کے اتصالِ باہمی کو ذاتِ کلّی کے حصول کا ذریعہ بنا دیا۔ اس روحانی منطق کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے مادیت پسند یونانی فکر کو قرآن کی روح کے منافی قرار دے دیا۔ یونانی فکر سے استفادے ہی کے باعث اقبال کے نزدیک ابن رُشد

Scanned with CamScanner

اور معتزلہ، سب اسلام کی حقیقی روح سے محروم ہو گئے۔ اقبال کے خیال میں اس ''یونانیت'' نے اسلامی ثقافت کے دائرۂ کار کو محدود کر دیا، جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں مسلمانوں کے عہدِ زرّیں کا سرخیل عباسی خلیفہ مامون الرشید تھا کہ جس نے 'بیت الحکمت' کے قیام کے ذریعے سریانی، قبطی، پہلوی اور سنسکرت کے عظیم علمی ذخیروں میں سے چنیدہ کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ خصوصاً قدیم یونانی فلاسفہ کی کتب کے حصول کے لیے قیصرِ روم کو خط بھی لکھا اور اپنے نمائندے بھیجے جو ان فلاسفہ کی کتابوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے۔ مختلف زبانوں کے ماہر جید علما نے ان کے تراجم کیے۔ علم و حکمت کی عالمی روایت کے ساتھ مسلمانوں کے ربط و تعلق کی یہ وہ خشتِ اول تھی کہ جس نے مسلمانوں کے عظیم تمدن کی عمارت تعمیر کرنے میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ فلسفہ، طب، ریاضی، منطق، فلکیات، طبعیات اور کیمیا جیسے علوم میں مسلمانوں کی ترقی میں اُس عہد کے اس نئے اسلامی تہذیبی پھیلاؤ نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اس بات کا اعتراف خود اقبال یوں کرتے ہیں:

حکمتِ اشیا فرنگی زاد نیست — اصلِ او جز لذّتِ ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلماں زادہ است — ایں گہر از دستِ ما افتادہ است
چوں عرب اندر اُروپا پر کشاد — علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرانشیناں کاشتند — حاصلش افرنگیاں برداشتند
ایں پری از شیشۂ اسلافِ ماست — باز صیدش کُن کہ او از قافِ ماست

لیکن اقبال اس بات کی کہیں وضاحت نہیں کرتے کہ علم و حکمت کے یہ معجزات یونانی، ایرانی، ہندی اور چینی علوم و فنون کی عرب اسلامی تہذیب میں شمولیت اور اضافے کے بغیر منظرِ عام پر نہ آ سکتے تھے۔ ان علوم و فنون نے کیونکہ مذہب کے متوازی علم و حکمت کی سائنسی بنیادوں کو استوار کیا تھا، اسی لیے اقبال نے اپنے اس خطبے میں یونانی فکر سے مستفید اسلامی ثقافت کو ناپسند کیا۔ اقبال دراصل عقل اور سائنس کے تمدنی حاصلات کو بے دینی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی فکر میں الجھن کا بنیادی سبب بھی ان کی یہی فکری روش ہے۔ مثلاً اٹھارھویں صدی میں مغرب میں اقبال کے بقول عقائد کا اثبات از روے عقل ممکن نہ رہا: مذہب سے عقائد بتدریج خارج ہوتے چلے گئے تو بے دینی نے سر اٹھالیا:

مگر عقائد کے ترک سے اخلاق نے افادیت پسندی کا رنگ اختیار کر لیا اور اس طرح

Scanned with CamScanner

عقلیت ہی کے زیر اثر بے دینی کا دور دورہ عام ہو گیا۔ (7)

اقبال سے یہاں علمی خطا ہوئی۔ انھوں نے اس جانب توجہ نہ دی کہ اٹھارھویں صدی تک آتے آتے مذہب اور اس کے عقائد کے متوازی سائنسی، عقلی اور مادی علوم وفنون یورپی تہذیب وتمدن میں پوری طرح سرایت کر چکے تھے۔ ان علوم وفنون کا مقصد مذہبی تعلیمات یا عقائد کی نفی یا اثبات نہ تھا بلکہ مادی زندگی کی تمدنی ضروریات کے پھیلاؤ کے نتیجے میں یہ علوم خالص عقلی، سائنسی اور مادی بنیادوں پر ارتقا پذیر ہوے۔ ان علوم کی اصولی مباحث میں الٰہیات کو کوئی عمل دخل حاصل نہ تھا۔ خود دین ان علوم و فنون کا خاموش تماشائی اس لیے بنا رہا کہ دین کی اصولی مباحث کو انسان کے عقلی، سائنسی اور مادی بنیادوں پر استوار علوم وفنون کے ارتقا سے کوئی بھی فکری علاقہ نہ تھا۔ ان علوم وفنون نے دراصل انسانی سماج میں دین کی حدود کو متعین کر دیا تھا، اور خود یہ علوم وفنون اپنے علمی اور عملی پھیلاؤ کے مخصوص نظام کے باعث اپنی حدود کے تعین سے آزاد رہے اور روز افزوں ترقی کرتے چلے گئے۔ البتہ اخلاق کے افادی پہلو کو بھی ہمیشہ ساتھ ساتھ رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی اور اخلاق کو بھی فرد کی صوابدید کی بجاے ریاستی قانون کے تابع کر کے اخلاق اور قانون کے مابین ایک اور طرح کی ہم آہنگی پیدا کر دی گئی۔

اقبال صوفیانہ اور مذہبی مشاہدے میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے، کیونکہ ان دونوں کا ظہور قلب کے راستے سے ہوتا ہے۔ اقبال کے خیال میں حقیقتِ مطلقہ تک رسائی قلب ہی سے ممکن ہے اور اسی کی قوتِ دید سے اس کا دیدار بھی ہو جاتا ہے۔ خدا سے والہانہ عشق اور اس کے نتیجے میں نفسیاتی سطح پر جو طرزِ احساس جنم لے سکتا ہے وہ اس نوع کے امکانات کو ظاہر کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی نوعیت کیا ہے؟ یہ بات عدمِ وضاحت میں چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے خیال میں صوفیانہ احوال میں ہر طرح کے مہیجاتِ عقلی وروحانی مدغم ہو کر ناقابلِ تجزیہ وحدت میں منتقل ہو جاتے ہیں اور ناظر ومنظور اور شاہد ومشہود کا امتیاز اُٹھ جاتا ہے۔ اب ''ناقابلِ تجزیہ'' وحدت کا ظہور پذیر ہو جانا، ظاہر ہے، کوئی منطقی دلیل نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ناقابلِ تجزیہ ہمیشہ ناقابلِ تجزیہ ہی رہتا ہے، بلکہ ایسا علم کی کمی یا کوتاہی کے باعث ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مشاہدہ محض احساس کی سطح پر ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ احساساتی سطح پر جنم لینے والا وقوعاتی تصور صوفی کے خارجی ماحول سے ماورا ہو کر صرف صوفی ہی کی واردات کا کوئی حصہ بن جاتا ہے، یا بن سکتا ہے، لیکن کوئی دوسرا فرد اس میں بیک وقت شریک نہیں ہو سکتا۔ اس

کے مقابلے میں مادیات کا جہانِ معنی چونکہ سرتا سر خارج سے متعلق ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ فرد کی ہر مادی سرگرمی کے شاہد اور ناظر دیگر افراد بھی ہو سکتے ہیں۔ روحانی یا صوفیانہ سرگرمی بطور روحانی سرگرمی کے محض ایک فرد تک محدود رہتی ہے، اور نا قابلِ وضاحت ہوتی ہے، لہٰذا دوسرے افراد اس میں شرکت سے محروم رہتے ہیں؛ لیکن ایک سائنسدان، فنکار یا ادیب کی سرگرمی چونکہ مادی سطح پر ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ دیگر افراد بھی براہِ راست اس سرگرمی میں شریک ہو کر اس کا حصہ بن جاتے ہیں۔ غرض اجتماعی زندگی کا احاطہ افراد کی مادی سرگرمیوں کے بغیر ناممکن ہوتا ہے، اور پھر یہی سرگرمیاں معاشی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی تعلقات کو فروغ دینے کا عملی سطح پر باعث بن جاتی ہیں، جبکہ صوفی کی واردات انفرادی یا نجی سطح پر رہتی ہے اور سماجی زندگی کے حقیقی تعلقات میں بے اثر رہتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اہلِ تصوف ہمیشہ قلیل ترین تعداد میں ہوتے ہیں؛ ان کے مقابلے میں بغیر کسی صوفیانہ واردات کے خدا سے تعلق استوار کرنے والوں اور اس کی حمد بیان کرنے والوں، اس سے اپنی آرزوؤں کی تکمیل چاہنے والوں اور اس کے حضور سجدہ ریز ہونے والوں کی تعداد بے حد و شمار ہوتی ہے۔ پس اقبال نے صوفی کے اجتماعی زندگی میں مادی کردار کو موضوع بنانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ مادی سرگرمی سائنسی تعقلات سے بہت قریب ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اس جانب توجہ نہ کی۔

2

اپنے دوسرے خطبے ''مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار'' میں اقبال نے نیوٹن، آئن سٹائن اور ڈارون کے سائنسی نظریات کی تردید، یا کسی قدر اُن پر تنقید، کے لیے مغربی فلاسفہ و مفکرین ڈیکارٹ، برگساں، وائٹ ہیڈ اور کانٹ کے مابعد الطبیعیاتی و مذہبی افکار و نظریات کو بطور سند کے پیش کیا ہے۔ اس کا مقصد سائنسی نظریات کے ''سطحی پن'' کو اجاگر کرنا ہے۔ اقبال کے ان خطبات کے حوالے سے یہ معروف بات غلط ہے کہ اقبال نے ان خطبات میں مذہب کو سائنسی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے؛ دراصل ان خطبات کے ذریعے اقبال نے تو دنیائے مادیت، سائنس اور عقلی حاصلات کی نفی

Scanned with CamScanner

کا کام لیا ہے۔ سائنسدانوں کے مقابلے میں ان کی فکر کے محبوب ترجمان ہالڈین، ڈریش اور ویلڈن کار ہیں کہ جن کے سائنس اور عقل کے خلاف دلائل کو بطورِ سند اپنے اس خطبے میں خاص مقام دیا گیا ہے، اور پھر ان دلائل کے بموجب حاصلاتِ عقل کو دھوکا اور فریب قرار دیا گیا ہے۔

اقبال اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سائنس کے ذریعے ہمیں جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی ہم تصدیق اور توثیق کر سکتے ہیں، اس لیے وہ کسی قدر قابلِ اعتماد بھی ہوتا ہے۔ پھر کہتے ہیں:

> لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ سائنس کے یہاں کوئی باقاعدہ نظریہ نہیں۔ اس کے یہاں کچھ ہے تو اس کے الگ الگ اجزا کے الگ الگ تصورات، جن کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں جڑتا۔ یوں کہنے کو سائنس کا موضوع مادہ بھی ہے، حیات اور نفس بھی، لیکن جہاں آپ نے یہ سوال کیا کہ مادہ، حیات اور نفس کو باہم کیا تعلق ہے تو یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ ان سے جن علوم میں بحث کی جاتی ہے ان کی حیثیت محض ٹکڑوں کی ہے، لہٰذا وہ اس قابل ہی نہیں کہ اس سوال کا کوئی مکمل جواب دے سکیں۔ میرے نزدیک تو علومِ طبعی کی مثال زاغ و زغن کی ہے، جو فطرت کے مردہ جسم پر جھپٹتے اور اُس کا ایک آدھ ٹکڑا نوچ لے جاتے ہیں۔ (64)

اقبال کی فکر کے اس المیے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ انھوں نے ارتقاپذیر سائنسی معقولات کا موازنہ مذہبی منقولات سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ بتدریج ترمیم و اضافہ اور تحقیق و دریافت کے مسلسل عمل کی غیر موجودگی کے باعث مذہبی منقولات کے لیے ممکن نہیں رہ جاتا کہ وہ سائنسی معقولات کے ہر لحہ بدلتے ہوئے جہانِ معنی سے نباہ کر سکیں، چنانچہ شارحینِ مذہب سائنس کے تنوع کے متوازی اپنی اہمیت اور حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے لامحالہ سائنس کی نفی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں؛ اور سائنسی معقولات جب عقائد اور ان کی مذہبی اہمیت کو خاطر میں لائے بغیر مسلسل ارتقاپذیر رہتے ہیں تو ان شارحین کو عقل کی بھی نفی کرنا پڑتی ہے۔ اقبال بھی ان خطبات میں اسی کشمکش سے دوچار دکھائی دیتے ہیں۔ عقل، سائنس اور مادیت کا دامن تھامنے لگتے ہیں تو روحانیت، وجدان اور عقائد کی دنیا ہاتھوں سے نکلتی دکھائی دینے لگتی ہے، اور جب روحانیت، وجدان اور عقائد پر توجہ دیتے ہیں تو مجبوراً عقل، سائنس اور مادیت کی نفی کرنی پڑتی ہے۔ "رجب بھی ان دونوں کو آمیخت کرنے کی کوشش کرتے ہیں

تو وہ خود اس آمیزے کو نا قابلِ تجزیہ قرار دے کر ایک مرتبہ پھر اپنے نتائج میں سائنس اور عقل کی نفی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مذکورہ اقتباس بھی اسی کشمکش کا ترجمان ہے۔

ایک عام انسان یا سائنسدان کے پیشِ نظر بظاہر لامختتم اور وسیع و عریض کائنات ہے۔ اس خطۂ ارض سے کھڑے ہو کر اسے کائنات کے جو مادی مظاہر دکھائی دیتے ہیں یا دوربینوں سے کہکشاں در کہکشاں سلسلے دکھائی دیتے ہیں، وہ ان لامختتم سلسلوں کا احاطہ ذات کے کسی باطنی انکشاف سے نہیں کر سکتا۔ انسان کے لیے اس وسیع و عریض کائنات میں اپنی بقا کا سوال سب سے اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بقا کے لیے کائنات کے چند مادی وسائل اور مظاہر میں گہری دلچسپی لیتا ہے۔ بقا کا یہ سوال اس کی تمدنی ضروریات سے بھی مشروط ہے۔ وہ محض نظری سطح پر اس سوال کی تشفی کا طلبگار نہیں ہے بلکہ عملی سطح پر بھی اپنی بقا کے اسباب قائم کرنا چاہتا ہے۔ افسوس، اقبال نے سائنس کو ایک نظری علم کے طور پر دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے، اس علم کی وہ عملی سرگرمی جو ٹیکنالوجی میں منتقل ہو کر انسان اور انسانی تمدن کی بقا کے لیے مادی اظہارات کے تسلسل کو برقرار رکھتی ہے، اقبال نے اس کی اہمیت، ضرورت اور افادیت پر توجہ دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ ایک سائنسدان کے لیے گزشتہ دو صدیوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں حیرت انگیز ترقی کے باوجود سرِ دست یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس وسیع و عریض کائنات سے متعلق کوئی حتمی اور کلّی نظریہ پیش کر سکے۔ یہ بات درست ہے کہ وہ مادے، حیات اور نفس کو ابھی ٹکڑوں کی شکل میں جاننے کی کوشش کر رہا ہے، ان سب کے باہمی تعلق سے متعلق بھی کوئی حتمی اور کلیدی نظریہ اختیار نہیں کر سکا؛ لیکن اس بات کو پیشِ نظر رکھنا بھی انتہائی اہم ہے کہ وہ ان ٹکڑوں کے بارے میں جس قدر علم حاصل کر چکا ہے ایک لمحے کے لیے اس کی نفی کا اثبات ممکن نہیں ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی، کم پڑتے ہوئے ارضی وسائل اور دریافتوں کے نئے سلسلے، سب انسان کی تحقیق و جستجو کو مہمیز دیتے ہیں۔ کوئی باطنی انکشاف بھلے کسی نوع کی حقیقتِ مطلقہ تک رسائی حاصل کر لے، کائنات اور ورائے کائنات کے بارے میں کوئی حتمی نظریہ قائم کر لے، یا اس کی حیثیتِ کلّی یا نظامِ کلّی کی دریافت کا دعویٰ کیوں نہ کر دے، اس کی پریشانی یہ ہے کہ وہ اس کے مادی اظہار پر قدرت نہیں رکھتا؛ جبکہ سائنس، اپنے ارتقاپذیر نظریات کے باوجود، ٹیکنالوجی کی معرفت اس کے مادی اظہار پر دسترس رکھتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ سائنسدان ٹکڑوں یا اجزا کی ساخت اور ماہیت پر

Scanned with CamScanner

غور وفکر بغیر کسی مقصد کے نہیں کرتا بلکہ اس کا یہ غور وفکر کائنات میں انسان کی بقا اور اس کے تمدنی ارتقا سے ہم آہنگ ہوتا ہے، اور یوں سائنسی نظریات اور ٹیکنالوجی اپنے تخلیقی اظہار میں عالم انسان کو ایک قدم آگے لے جاتے ہیں۔ فکرِ اقبال کے فکری سانچے میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ باطنی انکشافات کی معرفت انسان کا کائنات اور حیات کے بارے میں کوئی کلی اور حتمی نظریہ قائم ہو بھی جائے تو اُس نظریے کا اطلاق باطنی ہوگا یا خارجی اور معروضی؟ اگر فرض کرلیں کہ باطنی سطح پر ہوسکتا ہے، تو انسانی لیاقت، ہنر، کمال، تحقیق وجستجو، دریافت اور خود انسانی وجود کی کائنات میں فعالیت کی بھی نفی ہوجائے گی۔ کسی حقیقتِ مطلق کا کھوج خود انسان کو لاپتا کردے گا۔ اُس نظریے کا اطلاق اگر دنیائے مادیات پر کرنے کی کوشش کی جائے گی تو انسانی عقل، علم، سائنس، ٹیکنالوجی اور مہارت کو بھی حتمی اور کلی نظریے کی انتہائی ترقی یافتہ سطح تک لانا پڑے گا کہ جس کے امکان کی تردید خود انسانی عقل، علم، تجربے، سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کی تاریخ کردیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال انسانی علم، تجربے، سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی، اس کی حاصلات اور رفتار سے مایوس ہی نہیں بلکہ اُسے کارِ بیکار سمجھتے ہیں۔ البتہ اس کی مادی حیثیت اور انسانی تمدن میں اس کی فعالیت اور اہمیت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس کی معنوی حیثیت پر ضرور نظرِ کرم کرتے ہیں تاکہ اس زندہ حقیقت کو اپنے فکری نظام کے دفاع میں استعمال کرسکیں۔ اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کے پہلے خطبے کی طرف مراجعت کرنا پڑے گی۔ گزشتہ پانچ سو برس سے عالم اسلام پر جو جمود کی کیفیت طاری ہے اور اس عرصے میں یورپی اقوام نے سائنس، ٹیکنالوجی اور علم وحکمت میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے اُس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> وہ دن گئے جب یورپ کے افکار دنیائے اسلام سے متاثر ہوا کرتے تھے۔ تاریخِ حاضرہ کا سب سے توجہ طلب مظہر یہ ہے کہ ذہنی اعتبار سے عالمِ اسلام نہایت تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس ترکیب میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں، کیونکہ جہاں تک علم وحکمت کا تعلق ہے، مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس تہذیب کی ظاہری آب وتاب کہیں اس تحریک میں حارج نہ ہوجائے اور ہم اس کے حقیقی جوہر، ضمیر اور باطن تک پہنچنے

Scanned with CamScanner

سے قاصر رہیں۔(11)

یہ اقتباس اقبال کے فکری تضادات کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ علم و حکمت اور دانش و آگاہی کا مرکز اب عالمِ اسلام نہیں رہا بلکہ یورپ ہے، اور اقبال کا یہ اعتراف بجا ہے۔لیکن اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود یورپی افکار کا وہ پہلو کہ جس نے مذہبی تعلیمات کے متوازی یورپ کی مادی علوم وفنون میں برتری کو اقوام عالم کے سامنے ثابت کیا، اور یورپ کے جدید تمدن کی ساری عمارت جن مادی علوم وفنون کی بنیاد پر استوار ہوئی، اس کے مقابلے میں اقبال نے روحانی، متصوفانہ یا مذہبی افکار کا چرچا کیا۔اقبال کے تمام خطبات میں ان علوم کی اصل یعنی مادیت ہی کی نفی کی گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عالمِ اسلام کا تیزی کے ساتھ یورپی علوم اور فنون کی طرف بڑھنا اس لیے نہیں ہے کہ اسلامی الٰہیات کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمان انسانی یا مادی علوم کی طرف توجہ کریں یا اس لیے کہ مغربی علوم سے رہنمائی میں ہی ان کی دنیاوی یا اخروی نجات ہے، بلکہ اس کی بنیادی وجہ مغرب کے جدید تمدن کا وہ عالمی پھیلاؤ ہے جو، مادی علوم وفنون کے طفیل، جدید زندگی کی ضروریات، وسائل، مسائل اور ذرائع کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ تمدن اور اس کو تشکیل دینے والے علوم مذہبی، روحانی یا باطنی علائق سے یکسر آزاد ہیں۔ یہ دور مذاہب کے درمیان مقابلے، موازنے، مباحلے یا جنگ کا نہیں ہے بلکہ صنعتی پیداوار کے ذریعے زیادہ سے زیادہ سرمائے کے حصول کا ہے۔ یہ خالصتاً مادی جنگ ہے اور اس مادی جنگ میں فاتح وہ ہے کہ جو مادی علوم وفنون کے تہذیبی وتمدنی سطح پر پھیلاؤ میں زیادہ دسترس رکھتا ہے۔ عالمِ اسلام کا مقابلہ اب اس مغرب سے ہے جس کی روح روحانیت میں نہیں بلکہ مادیت میں ہے۔ امتِ مسلمہ مذہب کی بنیاد پر یک طرفہ لڑائی کا خمیازہ تو پانچ صدیوں سے بھگت ہی رہی تھی، اسے ہوش تو تب آیا جب علم وحکمت اور دانش وفنون میں مقابل قوتیں اپنے کمال کو پہنچ چکی تھیں۔ اور جن بعض پہلوؤں سے اقبال نے مغربی تہذیب کو ''اسلامی تہذیب'' کا تسلسل یا اس کی ارتقا یافتہ شکل قرار دیا ہے، کیا وہ اسلامی تہذیب کا کمال ہیں؟ لیکن پھر ''اسلامی تہذیب'' کی روایت خود اقبال تک آتے آتے مادی علوم وفنون کی مادی غرض وغایت کے خلاف کیوں ہوگئی ہے؟ اور پھر آج یہ جدید مغربی تہذیب کی ترقی یافتہ شکل میں کیسے فعال ہوگئی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ''اسلامی تہذیب'' عالمِ اسلام میں احیائے مذہب کی تحریکوں سے پہلے کے

Scanned with CamScanner

زمانے میں اپنی ابتدائی شکل میں موجود تھی: اسی کے باعث نامی گرامی سائنسی علوم کے ماہرین اور موجدین نے جنم لیا تھا۔ یہ بطور اصطلاح ''قدیم مسلمانوں کی تہذیب'' تھی کہ جو ازمنۂ وسطیٰ میں مسلمانوں کے شاندار ماضی سے یادگار سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح جدید مغربی تہذیب کو ہم ''عیسائی تہذیب'' قرار نہیں دے سکتے، اگرچہ عیسائیت کے کچھ جدید نظریات نے اس تہذیب کی بعض جدید قدروں کو تسلیم بھی کر لیا ہے۔ عالم اسلام کی ضرورت اگر صرف مذہبی بنیادوں پر تشکیل پذیر کوئی تہذیب ہوتی تو اسے مغرب کی مادیت پسند حکمت و دانش کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت بھی نہ رہتی۔ یہ ضرورت مذہب کی فرمائش کے نتیجے میں پیدا نہ ہوئی تھی بلکہ اس کا جنم عہد جدید کی مادی حقیقتوں کے بطن سے ہوا تھا۔

جہاں تک ''مغربی تہذیب کی ظاہری آب و تاب'' کا معاملہ ہے تو یہ بہت کچھ سرمائے کی افراط کی دین ہے۔ چلیں ایک لمحے کے لیے اگر مسرت و شادمانی کے ظاہری رُخ سے صرف نظر کر لیا جائے تو بھی اس بات سے مغربی تمدن اور اس کے علوم و فنون کی فعالیت، اہمیت، تحقیق و تنقید اور ترقی کا انکار لازم نہیں آتا۔ پس اس حوالے سے اقبال کا اندیشہ بے معنی ہے۔ مغربی تہذیب کی آب و تاب کا یہ پہلو مادی علوم و فنون کی ترقی میں کبھی بھی حارج نہیں ہوا بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کی کوکھ سے جنم لینے والے جمہوری نظام نے اس آب و تاب سے پیدا شدہ اقدار کو قانونی تحفظات بھی فراہم کر دیے ہیں کہ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ اقبال جسے بزعم خود مغربی تہذیب کا حقیقی جوہر، ضمیر اور باطن قرار دیتے ہیں اُس کی نفی ہی مغربی تہذیب کا حقیقی جوہر، ضمیر اور باطن ہے۔ یہ جوہر، ضمیر یا باطن دراصل مسلمات، متعینات یا منقولات کی بجائے آزادیِ اظہار و افکار، تحقیق و تنقید اور ایجاد و دریافت کی نو بہ نو حالتوں سے نمودار ہوتا ہے۔ اس جوہر کی غایت حقیقتِ مطلق کا عرفان بھی نہیں ہے بلکہ جہانِ مادی کی وہ تعمیر ہے کہ جسے انسان خود اپنے علم، لیاقت اور فن سے دریافت کرنے کی شدید آرزو رکھتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال مسلمانوں کو ہدایت کر رہے ہیں کہ وہ مغربی تہذیب کے جوہر یا باطن کو سمجھیں: انھوں نے اس حقیقت کو پیشِ نظر ہی نہیں رکھا کہ عالمی تمدنِ جدید یا مغربی تہذیب کے عالمی فروغ میں صد ہا سال سے ریاضت تو مغرب کے انسان نے کی ہے، مشرق یا مسلمان کا کردار تو منفعل رہا ہے، وہ مغربی تہذیب کے جوہر کو بغیر کسی علمی، عملی یا تخلیقی تجربے کے کیسے دریافت کرنے کی جرأت

کرسکتا ہے؟ اقبال الٰہیاتِ اسلامیہ کی جس تشکیلِ جدید کا تصور رکھتے ہیں اُس میں تو اس بات کی گنجائش ہی موجود نہیں ہے۔ حیرت انگیز طور پر وہ اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید میں مغربی تہذیب سے استفادے کی دعوت بھی دے رہے ہیں۔ علائق فطرت پر غلبے کے لیے یا کائنات کی تسخیر کے لیے اقبال حقیقت اور مجاز یا واقعی اور عینی کی متضاد اور متخالف قوتوں کے باہمی اتصال کو لازمی شرط قرار دیتے ہیں، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ مغربی تمدن نے مجاز سے عینی کے تقدس پر ایمان رکھنے کے باوجود محض حقیقت اور واقعی کو اپنے مادی علوم وفنون کی بنیاد بنا دیا۔ یہ معجزہ اس حکمتِ عملی کے بغیر ممکن بھی نہیں تھا، پس مغربی تمدن کے باسیوں نے ایسا ہی کیا۔ اقبال مسلمانوں کو مغربی تمدن کی اس حقیقت کے آشکار ہو جانے کے باوجود اس میں مجاز و عینی کے پہلو کو داخل کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ حقیقت اور مجاز دونوں الگ الگ انتہائیں ہیں۔ انسانی تمدن کے ارتقا کی تاریخ بھی اسی بات کو ثابت کرتی ہے۔

3

تیسرے خطبے کا موضوع ''ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور حقیقتِ دُعا'' ہے۔ اس خطبے میں اقبال نے ذاتِ الٰہیہ کے اسلامی تصور پر روشنی ڈالتے ہوئے دعا کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ اگر انفرادی سطح پر مانگنے کی بجائے اجتماع میں مانگی جائے تو اس کی نورانی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے اور ذاتِ باری تعالیٰ سے انسان کا تعلق ایک تجلّی کی وساطت سے قائم ہو جاتا ہے۔ اقبال کے خیال میں اس حوالے سے مذہب کے عزائم فلسفے سے بلند ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے مشہور امریکی نفسیات دان پروفیسر ولیم جیمز کے الفاظ میں ذاتِ الٰہیہ سے انسان کے تعلقِ خاص کی اہمیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

> سائنس کچھ بھی کہے، مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے، دُعا یا عبادت کا سلسلہ بھی قائم رہے گا۔ اِلّا یہ کہ ہم انسانوں کی ذہنی ساخت میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا ہو جائے مگر جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے، اس کا کوئی امکان نہیں... لہٰذا کتنے انسان

Scanned with CamScanner

ہیں جو، ہمیشہ نہیں تو اکثر، اُس ہمدمِ صادق کی تمنا اپنے سینوں میں لیے پھرتے ہیں اور جس کی بدولت ایک حقیر سا انسان، جسے بظاہر لوگوں نے دھتکار رکھا ہے، محسوس کرتا ہے کہ اس کی ہستی بھی اپنی جگہ پر کچھ ہے۔ یہ اندرونی سہارا نہ ہوتو اُن حالتوں میں جب ہمارا نفس اجتماعی ناکام ہوکر ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے، دنیا بہتوں کے لیے جہنم بن جائے۔ (134)

یہ اقبال کا سب سے خوبصورت اور پُراثر خطبہ ہے۔ اس میں مذہب کے حقیقی کردار پر اقبال نے بڑی احتیاط کے ساتھ، کلامی مباحث کے تحت، مذہب کی انسانی سماج میں اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ انسانی سماج میں انسان کی عملی مادی سرگرمیوں کے باوجود بعض ایسے موڑ ہوتے ہیں کہ جہاں سماجی تعلقاتِ کار کی وسیع ترہئیت میں انسان اپنے آپ کو بے یارومددگار اور تنہا محسوس کرتا ہے۔ ایسے میں نفسیاتی سطح پر ذاتِ باری تعالیٰ سے نسبتِ خاص بندے کو ایک سہارا، اطمینان اور تشفی کا سامان فراہم کردیتی ہے اور دُعا عدمِ اطمینان کو اطمینان اور بے یقینی کو یقین میں بدل دیتی ہے۔ اس اطمینان اور یقین کے حصول کے بعد ایک صاحبِ ایمان و یقین کی طبیعت، لیاقت اور توانائی زندگی کے دیگر معاملات کو طے کرنے پر مائل ہو جاتی ہے۔ انسان مادی زندگی کی سرگرمیوں کو گھبرا کر تج دینے کی بجائے ان میں اپنی فعالیت اور رابطے کو بحال کر لیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر منزل کے حصول کے لیے اسے ایک قدم کے بعد دوسرا قدم اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ سماجی اور معاشی زندگی کی سرگرمیوں میں اسے اپنی بہترین صلاحیتوں، طاقتوں اور مہارتوں کو آزمانا ہی پڑتا ہے۔ صد شکر کہ اقبال نے اس خطبے میں دعا کی سائنسی توجیہات کی بجائے اس کے نفسیاتی پہلوؤں سے بات کی ہے اور اس کے ساتھ اس بات کی بھی وضاحت کردی ہے کہ دعا اپنے معروف معنوں میں صوفیانہ واردات یا تجربے سے الگ ہے اور ایک ''حیاتی عمل'' ہے۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے آگے چل کر لکھتے ہیں:

میں تسلیم کرتا ہوں کہ تصوف نے ان واردات اور مشاہدات کا بالخصوص مطالعہ کیا اور اسی طرح ہماری ذات یا خودی کے نئے نئے عوامل ہم پر کھول دیے۔ اس کا ادب معلومات سے پُر ہے، لیکن اس کی زبان پر مابعد الطبیعیات کی صورِ افکار کا غلبہ ہے جو کب کی فرسودہ ہو چکی ہے، لہٰذا آج جب تصوف کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے دلوں میں کوئی ولولہ پیدا

Scanned with CamScanner

نہیں ہوتا۔ یوں بھی تصوف خواہ مسیحی ہو خواہ اسلامی، اس کی نوفلاطونی شاخ کو جس بے نام سی 'لاشئے' کی جستجو ہے اس زمانے کے انسانوں کو اس کے اندر بھی کوئی سامانِ تسکین نہیں ملتا۔ ہمارا جی تو یہ چاہتا ہے کہ اگر خدا ہے تو ہمیں اُس کی موجودگی کا سچ مچ حقیقی اور واقعی تجربہ ہو۔ (136)

اقبال کے مندرجہ بالا خیالات بڑے واضح ہیں لیکن اس بات کا کیا کیا جائے کہ خود اقبال نے اپنے اس خطبے میں معتزلہ کی بجائے اشاعرہ کے مابعد الطبیعیاتی افکار کا طومار کھڑا کر رکھا ہے اور اپنے تعقلات کو ان افکار سے سند فراہم کی ہے۔ خطبے کے آخر میں اقبال کا یہ اندیشہ بھی درست نہیں ہے کہ اجتماعی عبادات کے طفیل مرتبہ و مقام یا نسلی امتیاز کا خاتمہ ممکن ہے۔ یہ مذہبی سے زیادہ سیاسی اور معاشی مسئلہ ہے۔ انسان مذہب اختیار نہ بھی کرے تو بھی ان امتیازات کی جڑیں طرزِ فکر سے زیادہ سماج کے سیاسی اور معاشی نظام میں پیوست ہوتی ہیں۔ جب تک ان جڑوں کو نہیں کاٹا جاتا، محض مذہبی طرزِ فکر یا احساس ان امتیازات کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ صلوٰۃ یا جماعت کا تجربہ تو مومنین قرن ہا قرن سے رکھتے ہیں لیکن ان امتیازات کا خاتمہ اس لیے ممکن نہ ہو سکا کیونکہ اس کی معاشی اور سیاسی وجوہات کو چیلنج کرنے کی روایت سے زیادہ تقدیر پرستی کے خاص رخ یعنی راضی بہ رضا کے 'تصور' کو زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ اقبال نے اپنے اشعار کی طرح ان خطبات میں بھی اس جانب توجہ نہ دی۔

4

اقبال کے چوتھے خطبے کا عنوان ''خودی، جبر و قدر، حیات بعد الموت'' ہے۔ اس خطبے میں اقبال نے خودی، نفس یا ذات کے فعال پہلوؤں پر زیادہ توجہ دی ہے۔ ان کے خیال میں خودی اپنی نفی سے زیادہ اثبات کا غالب رجحان رکھتی ہے۔ وہ جبر کی حالت میں اس لیے بھٹکتی رہتی ہے کیونکہ وہ اپنی نفی کے اسباب و محرکات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو پاتی۔ وہ ہر نوع کی غلامی سے انکار کی روش اختیار کرتی ہے اور اپنی آزاد حیثیت کو منوانے کے لیے جبر کی ہر حالت سے برسرِ پیکار رہتی ہے، لہٰذا جونہی اختیار کی کھڑکیاں کھلتی ہیں وہ تازہ فضا کی تمام توانائیاں اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے اور اپنی تسکین

Scanned with CamScanner

کے اسباب پیدا کرنا شروع کر دیتی ہے۔ چنانچہ اقبال نے تقدیر پرستی کی اس اسلامی روایت پر کڑی تنقید کی ہے جو ہر ظلم اور ناانصافی کے علت اور معلول کے سلسلے کو من جانب اللہ قرار دے دیتی ہے۔ اسے اقبال نے عالمِ اسلام کی ایک ذلت خیز تقدیر پرستی قرار دیا ہے۔ اقبال کے خیال میں یہ قرآنِ پاک کے تصورِ تقدیر کے خلاف ہے۔ تقدیرِ الٰہی دراصل منشائے الٰہی ہے لیکن اس میں اس قدر وسعت پیدا کر دی گئی ہے کہ خودی کے لیے خیر اور شر کا انتخاب بھی اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ خطا سے، جان بوجھ کر یا بہ تحقیق جس پہلو کو بھی منتخب کرے گی وہ اس کی ذمہ دار بھی ہوگی۔ جزا اور سزا کا سارا دارومدار بھی اسی چاہے یا ان چاہے انتخاب پر ہے۔ نیٹشے کے آزاد فوق البشر کی بجائے اقبال کا فوق البشر خیر کے انتخاب کا پابند ہے کہ جسے اقبال نے ''ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ'' قرار دیا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے کہ جہاں اقبال کے ہاں خودی کی استواری کے مادی اسباب ومحرکات اوجھل ہو جاتے ہیں اور وہ ایک باطنی یا ان دیکھے ''کل'' کی کھوج میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جدید نفسیات کے حوالے سے خودی کے مسائل، طریقۂ کار اور مقاصد پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس نئی نفسیات کا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم اپنے عقلی کردار کا بغور مطالعہ کریں تو اس میں حواس کے تواتر کے علاوہ ایک اور چیز یعنی بصیرت بھی کام کرتی نظر آئے گی، اور بصیرت کیا ہے؟ خودی کا یہ اعتراف کہ اشیا کے درمیان زمانی، مکانی اور تعلیلی نسبتیں کام کر رہی ہیں۔ لہٰذا جیسے جیسے خودی کا کوئی مقصد یا غرض وغایت ہوگی ویسے ہی بہ اعتبارِ موقع ومحل وہ اس پیچ در پیچ ''کل'' سے خاطر خواہ سوالات کا انتخاب کرلے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی غائی محل میں مَیں اپنی سعی وکشاکش کی بدولت کامیابی حاصل کر لیتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ میری ذات بھی اپنی جگہ پر علیت کا ایک سرچشمہ ہے اور اس لیے مجھے بھی کچھ نہ کچھ کرنے یا نہ کرنے کی قدرت حاصل ہے۔ پھر غائی محل کا خاصہ بھی یہ ہے کہ اس میں مستقبل کا تصور موجود رہے اور یہ وہ بات ہے جس کی از روئے عضویات کوئی تشریح ممکن نہیں۔ (162)

خودی کے اس غائی پہلو اور اس کے طریقۂ کار کو اقبال نے خودی کا خودساختہ قرار دیا ہے کہ وہ اپنے فہم میں کسی غائی عمل کو ایسا سمجھ لیتی ہے۔ یہاں دراصل اقبال نے خودی کے مقاصد کا تعین ہی نہیں کیا۔ انسانی خودی اپنے علم، تجربے، تحقیق اور جستجو میں کسی حقیقتِ مطلق کی تلاش کی بجائے اپنی شناخت

Scanned with CamScanner

انسانی سماج میں تمدنی و تہذیبی مقاصد کے حصول کی کوشش سے قائم کرتی ہے۔ وہ زمانی، مکانی اور تعلیلی نسبتوں میں جس پیچ در پیچ کُل سے مدلولات کا انتخاب کرتی ہے، اس انتخاب میں مقاصد کی نوعیت حتمی کردار ادا کرتی ہے۔ ان مقاصد کا جہانِ معنی کوئی اور نہیں بلکہ انسانی تمدن کا پھیلاؤ ہے۔ یہ کوئی سوکھا پھیکا مجرد عمل بھی نہیں ہوتا بلکہ انسانی تمدن کے بقا کا سوال ایک بصیرت کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ کم و بیش تمام مادی علوم و فنون میں یہی بصیرت کارفرما رہتی ہے۔ ان علوم کی بصیرت میں علت و معلول کا تعلق خودی کا کوئی باطنی آلہ یا پیمانہ نہیں ہے بلکہ یہ تعلق خودی کے سماج کے ساتھ رشتے اور سماج اور خودی کے کائنات کے ساتھ مادی رشتے کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ مخصوص تعلق جس قدر گہرا اور وسیع ہوتا چلا جاتا ہے، انسان کی آزادی اور اختیار کے دائرہ کار کو وسعت دیتا چلا جاتا ہے۔ اقبال کو خودی کے محض نظری پہلوؤں سے دلچسپی ہے، وہ اس کے سماجی، مادی اور افادی پہلوؤں سے گریز کر جاتے ہیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کوئی نہیں کہ جدید مادیت پسند علوم و فنون پر ایک غیر مادی جہانِ معنی بغیر کسی عقلی و سائنسی توجیہہ اور غایت کے کھڑا کر دیا جائے کہ جس کی وضاحت خود عدمِ وضاحت کا شکار ہے۔ اس خطبے میں بقائے دوام کے حوالے سے ایک اچھی بات یہ آئی ہے کہ انھوں نے صرف قرآنِ پاک سے براہِ راست اخذ و استفادہ کیا ہے اور اس حوالے سے اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے، تاہم خطبے کا یہ حصہ ہمارے موضوعاتی دائرۂ کار سے باہر ہے۔

خطبے کے آخر میں اقبال نے اپنے نظریۂ حیات بعد الموت کی وضاحت بھی کی ہے۔ اسلامی تعلیمات کی عمومی اور روایتی تعبیرات کے برعکس اقبال نے اپنے زاویۂ نگاہ کو پوری جرأتِ رندانہ کے ساتھ پیش کیا ہے، یہاں تک کہ خود مترجم سید نذیر نیازی کی توجیہات بھی تشفی کی کوئی معقول گنجائش نہیں نکال پائیں۔ اقبال نے جنت اور دوزخ کو احوال قرار دیا ہے، کہ یہ کوئی خاص مقامات نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں بہشت مسرت اور سرخوشی کی کیفیت کا دوسرا نام ہے؛ اسی طرح دوزخ انسان کی ناکامی و نامرادی کا دردانگیز احساس ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ جہنم بھی کوئی مقام یعنی ''ہاویہ'' نہیں ہے، یعنی وہ اس کو بھی کوئی مقام قرار دینے کی بجائے تادیب کا عمل قرار دیتے ہیں۔ یہاں اقبال نے دراصل اپنا تسلسلِ حیات کا نظریہ پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں:

زندگی ایک ہے اور مسلسل۔ اور اس لیے انسان بھی، اس ذاتِ لامتناہی کی نو بہ نو تجلیات

> کے لیے جس کی ہر لحظہ ایک نئی شان ہے، ہمیشہ آ گے ہی آ گے بڑھتا رہے گا۔ پھر جس کسی کے حصے میں یہ سعادت آئی ہے کہ تجلیاتِ الٰہیہ سے سرفراز ہو وہ صرف ان کے مشاہدے پر قناعت نہیں کرے گی۔ خودی کی زندگی اختیار کی زندگی ہے جس کا ہر عمل ایک نیا موقع پیدا کر دیتا اور یوں اپنی خلاق اور ایجاد و طباعی کے لیے نئے نئے مواقع بہم پہنچاتا رہے گا۔ (186)

مادی موجود کی باعمل اور اختیاری حیثیت کو تو اقبال نے خوب سراہا ہے، یہاں تک کہ لامتناہی متناہی کی آغوشِ محبت میں اتر آتا ہے۔ تاہم وجودِ مادی کے ظاہری زوال یا اختتام کے بعد ہستی کا سلسلہ برقرار رہتا ہے، اس سلسلے میں اقبال نے فلسفیانہ عجز کا اظہار کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس عجز کی بنیاد پر اقبال نے اپنی حیات بعد الموت سے متعلق اجتہادی تعبیرات کی عمارت کیسے استوار کر لی؟

5

''اسلامی ثقافت کی روح'' اقبال کا پانچواں خطبہ ہے۔ اس خطبے میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جسے آج ہم جدید مغربی تہذیب اور ثقافت کے بعض پہلوؤں کے حوالے سے جانتے ہیں، اس کی روح یونانی فکر سے انحراف ہے کہ جس کی ابتدا مسلمان مفکرین نے بھی کی تھی۔ اقبال کے اسلامی تصورِ ثقافت کا جائزہ لینے سے پیشتر ضروری ہے کہ ہم انسانی معاشرے میں ثقافت کے قیام اور اس کی غایت پر تھوڑا غور کر لیں۔ ثقافت کسی عدم سے وجود میں نہیں آتی بلکہ ایک مخصوص خطے میں قیام پذیر افراد، ذرائع پیداوار میں ارتقا، فطری و افرادی وسائل کی موثر تقسیم، زمینی و فضائی ماحول سے مطابقت رکھنے والے لباس، رہائش، خوراک، رفاہِ عامہ کے ادارے اور ان سے متعلق افراد کی فراہمی کا مناسب انتظام، آرٹ اور ادب، تہوار اور رسوم و رواج کا روایتی، متحرک اور کسی قدر تغیر پذیر جہانِ معنی وہاں کی مخصوص شناخت کو ابھارتا ہے۔ یہ شناخت اس خطے، تہذیب یا تہذیبی اقدار و روایات یا تہذیبی فکریات کا احاطہ کرتی ہے۔ تہذیبی زندگی کے سیاسی، سماجی اور معاشی تعلقات کا سارا تانا بانا اسی جہانِ معنی کی عطا ہوتا ہے۔ اس جہانِ معنی کے عملی یا مادی اظہارات وہاں

Scanned with CamScanner

کے تمدن یا ثقافت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

انسانی تمدن کی مادی تشکیل میں مادی وسائل، ذرائع پیداوار، علم، تجربہ اور بنیادی و اعلیٰ مہارتیں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں کہ جن کا براہ راست تعلق اس خطے میں بسنے والے لوگوں کی بقا کے ساتھ ہوتا ہے۔ روحانی یا مذہبی فکریات کا غالب موضوع خارج کی مادی سرگرمیوں کو تمدن کے قالب میں ڈھالنا نہیں ہوتا بلکہ یہ فکریات موضوعی، داخلی یا باطنی ہوتی ہیں۔ پس تہذیب کے ثقافتی یا تمدنی ارتقا میں ان فکریات کا کوئی خاص حصہ نہیں ہوتا، البتہ ان فکریات کا غیر مادی اخلاقی پہلو اقدار و روایات اور رسوم کی صورت میں ضرور موجود ہوتا ہے، یا رہ سکتا ہے۔ اخلاقی زندگی کا بڑا حصہ وہ ہوتا ہے جو تمدن کے مادی پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ پیدا ہونے والے مسائل اور ان کے حل کے سلسلے میں سیاسی، سماجی اور معاشی اداروں کی تنظیم کاری اور مقاصد کے حصول کے لیے موثر ہوتا ہے۔ ان اخلاقیات کو فرد کی صوابدید کی بجائے ریاستی قوانین کے ذریعے تحفظات فراہم کر دیے جاتے ہیں تا کہ اجتماعی زندگی کے پھیلاؤ میں کوئی بڑا مسئلہ نہ پیدا ہونے پائے۔ ثقافت کے لیے کسی مذہبی اصطلاح کا استعمال درست نہیں ہے۔

خطبے کے آغاز میں اقبال نے صوفی اور انبیا کی باطنی یا روحانی واردات میں واضح خطِ امتیاز کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ صوفی اپنی واردات کی انتہا میں لذتِ اتحاد ہی کو واردات کی اصل یا منتہا سمجھتا ہے، اس واردات کا صوفی کی اپنی ذات سے باہر جہانِ خارج میں کوئی خاص بامعنی عمل ورشتہ نہیں ہوتا؛ جبکہ انبیا کی واردات اپنی بازآمد میں تخلیقی ہوتی ہے اور وہ خارج کے لیے مقاصد کی ایک نئی دنیا کی دعوت لے کر آتی ہے۔ بازآمد دراصل انبیا کے لیے عملی امتحان ہوتا ہے، انسانی تہذیب و تمدن پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اقبال کا یہ نقطۂ نظر بالکل بجا ہے اور تاریخی اعتبار سے درست بھی ہے۔ کسی نبی کی تعلیمات جب کسی معاشرے میں عملی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہیں تو اس سرگرمی کے نتائج براہ راست اس معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ انبیا کی تعلیمات، صوفی کی انفرادی اور نجی تشفی کی بجائے، معاشرتی ذمہ داریوں اور ان کے نتائج کو قبول کرتی ہیں۔ یہ تعلیمات محض موضوعی نہیں ہوتیں بلکہ ان کا ایک حصہ ایسا ہوتا ہے کہ جو خارجی اعمال اور معاملات کی دنیا میں موثر ہو جاتا ہے۔

اقبال کے نزدیک قرآن مجید نے لفظ وحی کا استعمال جس مفہوم میں کیا ہے اس سے ثابت ہوتا

Scanned with CamScanner

ہے کہ وحی خاصۂ حیات ہے اور ایسا ہی ہے جیسے عام زندگی۔ یہاں وحی سے اقبال کی مراد دراصل حکم الٰہی ہے جو زمان و مکاں کا پابند نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے وحی کو ارتقاپذیر قرار دیا ہے اور اسے ایک مسلسل فطری عمل سمجھا ہے۔ کہتے ہیں:

یہ انسان کا خود اپنی ذات اور وجود میں زندگی کی گہرائیوں سے نور اور روشنی حاصل کرنا ہے۔ یہ سب وحی کی مختلف شکلیں ہیں جو اس لیے بدلتی چلی گئیں کہ اس کا تعلق جس فرد سے تھا یا جس نوع میں اُس کا شمار ہوتا تھا، اس کی مخصوص ضروریات کچھ اور تھیں۔ (191)

گویا وحی مخصوص تعلیمات کا مخصوص سلسلہ نہیں ہے بلکہ حیاتِ انسان میں ارتقا کے مختلف مدارج میں کسی بھی عہد سے متعلق جو مخصوص روایات منظرِ عام پر آتی ہیں، اُس عہد کا انسان ان سے مطابقت قائم کرنے کے لیے زندگی، وجود اور ذات پر غور و فکر کرتا ہے تو یہ بھی اقبال کے نزدیک وحی کی ایک شکل ہے۔

اقبال نے یہاں دراصل مذاہب کے ایک عمومی موقف کی تائید میں نظریہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے، کہ حالات، واقعات اور حادثات سب اللہ کی مرضی اور منشا سے رونما ہوتے ہیں۔ اقبال نے اسی موقف کے پیشِ نظر وحی سے متعلق رائے پیش کی ہے۔ چونکہ سب من جانب اللہ ہے، پس انسان جب اپنے معاملات پر گہرائی سے غور و فکر کرتا ہے تو وہ گویا انھی نتائج تک پہنچتا ہے کہ جو اللہ کا منشا اور مقصود ہوتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو حقیقت کا ایک رخ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ انسانی زندگی اپنے اندر زبردست تنوع رکھتی ہے۔ معاشرے کے افراد، گروہ، طبقات یا جماعتیں اس تنوع کو اپنے اپنے مقاصد اور ضروریات کے تابع دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جو آرا قائم کی جاتی ہیں وہ متضاد، مخالف اور باہم مزاحم بھی ہوتی ہیں، یا ہوسکتی ہیں۔ سماج کسی ایک فرد کے غور و فکر کا ماحصل نہیں ہوتا، یہ بیک وقت اجتماعی زندگی کے متنوع اجتماعی افکار، رجحانات، رویوں اور عملی سرگرمیوں کا اجتماعی اظہار ہوتا ہے۔ پس سماجی ضروریات سے ہم آہنگ ہونے کے لیے زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق متضاد اور متخالف آرا کی موجودگی میں کیا وحی کسی فردِ واحد کا اعماق ہوسکتی ہے؟

ایک سماج انسانی آرا، نظریات اور نتائج کے تنوع ہی سے ارتقاپذیر ہوتا ہے۔ ایک فلسفی، سائنسدان، ماہرِ معاشیات یا شاعر و فنکار کے نقطۂ نظر اور نتائج میں حتمی طور پر ہم آہنگی ممکن نہیں ہوتی۔

Scanned with CamScanner

ان کا تنوع مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اپنے معیار اور کارکردگی کے حوالے سے اجتماعی زندگی پر اثرات مرتب کرتا ہے اور معاشرے کو ارتقا پذیر رکھتا ہے۔

اقبال نے اس مقام پر انسان کی نفسی توانائی یعنی ارادے، اختیار، مرضی اور تعقل کو وحی کی ایک شکل قرار دے کر اس بات کی بھی وضاحت نہیں کی کہ اس نفسی توانائی کے بروئے کار آنے سے جو نتائج انسانی سماج پر مرتب ہوتے ہیں ان کی ذمہ داری فرد پر عائد ہوتی ہے یا خدا پر؟ اسی مقام پر اقبال نے شعورِ نبوت کی بھی بات کی ہے اور اسے کفایتِ فکر قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ اس شعور کی موجودگی میں افراد کی پسند اور ناپسند کا معاملہ حل ہو جاتا ہے اور وہ اپنے انتخاب یا راہِ عمل کے اختیار میں الجھنے کی بجائے، اور اپنے طور پر غور و فکر کرنے کی بجائے، طے شدہ باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال نے شعورِ نبوت کے سماج میں عمل پذیر ہونے کے لیے بنی نوعِ انسان کے عالمِ صغر سنی کی مثال دی ہے۔ وحی کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو بیان کرتے ہوئے وہ جانتے تھے کہ سماج کوئی جامد و ساکت وجود نہیں ہے بلکہ یہ مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزرتا رہتا ہے اور ہر تبدیلی اپنے ساتھ نئے امکانات اور مسائل بھی لے کر آتی ہے۔ ان میں سے بعض مسائل کی نوعیت اور ماہیت ایسی ہوتی ہے کہ ان کے حل کے لیے نئے قوانین اور اصول دریافت کرنے پڑتے ہیں۔ انسانی عقل یا قوتِ انتقاد سابقہ قوانین یا اصولوں کو رد کر دیتی ہے اور نئے امکانات اور وقوعات کے ظہور کے لیے قوانین اور اصولوں کے ساتھ ساتھ طریقۂ کار کو بھی بدل ڈالتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان باتوں کے عدم اظہار کے باوجود اقبال کو ان کا خدشہ ضرور تھا، چنانچہ شعورِ نبوت کو کفایتِ فکر قرار دینے کے فوراً بعد کہتے ہیں:

> لیکن جہاں عقل نے آنکھ کھولی اور قوتِ تنقید بیدار ہوئی، تو پھر زندگی کا مفاد اسی میں ہے کہ ارتقائے انسانی کے اولین مراحل میں ہماری نفسی توانائی کا اظہار جن ماورائے عقل طریقوں سے ہوا تھا، ان کا ظہور اور نشو و نما رک جائے۔ انسان جذبات کا بندہ ہے اور جبلتوں سے مغلوب رہتا ہے۔ وہ اپنے احوال کی تسخیر کر سکتا ہے تو صرف عقلِ استقرائی کی بدولت، لیکن عقلِ استقرائی اس کے اپنے حاصل کرنے کی چیز ہے جسے ایک دفعہ حاصل کر لیا جائے تو پھر مصلحت اسی میں ہے کہ حصولِ علم کے اور جتنے بھی طریقے ہیں، ان پر ہر پہلو سے بندشیں عائد کر دی جائیں تا کہ مستحکم کیا جائے تو صرف عقلِ استقرائی کو۔ (192)

یہاں اقبال کا موقف بالکل واضح ہے۔ انھوں نے عقلِ استقرائی پر کوئی طنز نہیں کیا بلکہ اسے شعورِ نبوت ہی کا تسلسل سمجھا ہے۔ نبوت کے مقاصد کی تکمیل میں اسے بھی اقبال ایک مرحلہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کا ظہور دراصل استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ انھوں نے ختمِ نبوت کو بھی اسی ذیل میں سمجھانے کی کوشش کی ہے:

> اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گئی لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہوگی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا، یا عالمِ فطرت یا عالمِ تاریخ کو علمِ انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے کیونکہ یہ سب تصورِ خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ (194)

اقبال نے عقلِ استقرائی کو گویا نبوت کے مقاصد کے موجودہ اور آئندہ ارتقا کے حوالے سے پھیلا دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی نشاندہی کر دی کہ قرآن چونکہ انفس و آفاق دونوں میں غور و فکر کرنے اور اسے علم کا ذریعہ ٹھہرانے کی دعوت دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ باطنی احوال و واردات کو بھی علم کا ایک ذریعہ سمجھنا چاہیے لیکن اس پر بھی وہ عقل کا پہرے دار بٹھانا چاہتے ہیں:

> وارداتِ باطن کی کوئی بھی شکل ہو، ہمیں بہر حال حق پہنچتا ہے کہ عقل اور فکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی کے ساتھ تنقید کریں۔ اس لیے کہ اگر ہم نے ختمِ نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدتاً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق کسی ما فوق الفطرت سرچشمے سے ہے، لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ (195)

اسی طرح اقبال نے علم کے دو مزید سرچشموں یعنی عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ میں تعقل کی بنیاد پر غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ لیکن اقبال کی فکر میں مسائل اس وقت سر اٹھانے لگتے ہیں جب وہ قدیم یونان کی تعقل پسند فکری روایت پر تنقید کرتے ہوئے اسے محض نظری علم قرار دے دیتے ہیں اور اسے اسلامی تہذیب و ثقافت کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں قرآن محسوس اور ٹھوس حقائق کی دنیا سے رجوع کرتا ہے جبکہ حکمتِ یونان کی بنیاد محض عقلی نظریات پر قائم ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلام تجرباتی اور

Scanned with CamScanner

اطلاقی سائنس کو بنیاد بناتا ہے جبکہ یونانی فکر صرف عقلِ محض کی پروردہ ہے۔ اقبال نے یہاں اس جانب توجہ دینی ضروری نہ سمجھی کہ قدیم حکمائے یونان کے عہد اور ظہورِ اسلام کے درمیان جو عظیم زمانی بُعد ہے اس کے پیشِ نظر حکمائے یونان کا مطالعہ کن بنیادوں پر کیا جائے؟ اس عظیم زمانی بُعد کے پیشِ نظر اصولی طور پر تو یہ سوال پیدا ہونا چاہیے تھا کہ تعقل پسند یونانی فکر یا نظریات نے انسان، سماج اور کائنات سے متعلق عالمِ انسان کی رہنمائی کے لیے کون کون سے اصول وضع یا دریافت کیے تھے؟ یہ سوال اگر اقبال کے ذہن میں ابھرتا تو انھیں معلوم پڑتا کہ یونانی فکر اپنی نظریاتی بنیادوں میں تجرباتی سائنس اور اس کے اطلاق کو بنیاد بناتی ہے۔ اگر وہ اس کی حمایت کا پہلو اپنے اندر نہ رکھتی تو انسانی سماج اور کائنات میں غور وفکر کی اسے ضرورت ہی نہ رہتی اور وہ بھی کائنات کو عقل کی آنکھ سے دیکھنے اور اس کا عقلی تجزیہ کرنے کی بجائے نامعلوم باطن کی دنیاؤں میں بھٹکتی رہتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ تجربی سائنس کی بنیاد خالصتاً عقلی بنیادوں پر کائنات کے مادی مظاہر پر اولاً غور وفکر ہے اور ثانیاً عقلی مشاہدے کے بعد تجرباتی بنیادوں پر اصول اور قوانین کی دریافت ہے۔ حکمائے یونان نے ٹھوس مادی حقائق کو سمجھنے کے لیے انسانی وسیلے یعنی عقل کو اہمیت دی ہے، اور انسانی عقل چونکہ علم سائنس کی بنیاد ہے، یہی وجہ ہے کہ یونانی حکمت اپنے نظریات میں سائنسی بنیادوں پر غور وفکر کرنے کی پیش رو ہے۔

قدیم یونان کے فلاسفہ سے اقبال کی بیزاری کی وجوہات کو جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ یہ قدیم عہد کیا تھا اور اس عہد کے فلسفیوں کے نظریات کس حد تک تعقل پسند اور طبیعی بنیادوں پر استوار تھے کہ جن کے احیا کے باعث یورپ میں ایک عظیم نشاۃ الثانیہ کی تحریک نے جنم لیا جس کے پس منظر میں مسلمان دانشوروں اور سائنس دانوں کے علمی، مشاہداتی اور تجرباتی کمالات کا بھی حصہ تھا۔

یونان کے پہلے بڑے فلسفی، سائنسدان، علم ہیئت اور ریاضی کے ماہر طالیس (640 قبل مسیح) نے تاریخ میں سب سے پہلے سورج گرہن کی درست پیش گوئی کی۔ کائنات کے متعلق اس کا نظریہ مابعد الطبیعیاتی نہیں بلکہ طبیعی تھا۔ اس نے کہا کہ کائنات پانی سے بنی ہے، اسے دیوی دیوتاؤں کا کرشمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ فیثا غورث نے، کہ جس نے Philosophe اور Mathematics کی اصطلاحات وضع کیں، پہلی مرتبہ زمین کے گول ہونے کا نظریہ دیا۔ ہریقلیطس (535 ـ 475

قبل مسیح) کا دعویٰ یہ تھا کہ کائنات کو انسان یا دیوتا نے نہیں بنایا بلکہ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی؛ یہ آگ سے بنی ہے۔ اس نے کہا کہ کائنات کی ہر شے اپنے اندر اضداد رکھتی ہے۔ اس کی سائنسی توجیہہ یہ تھی کہ اضداد کا جدل ہی زندگی اور حرکت کا دوسرا نام ہے۔ دیما قریطس کا نظریہ مادیت پسند سائنسی فکر کے بہت زیادہ قریب ہے۔ اس کے خیال میں کائنات اور اس کی ہر شے، بشمول روح کے، چھوٹے چھوٹے مادی ذرات سے مل کر بنی ہے، کہ جن کو اس نے ایٹم کہا۔ اس کے نزدیک کائنات کے تمام فطری مظاہر میں میکانکی قوانین کسی بھی آفاقی قوت کے حکم کے بغیر ہی عمل پذیر رہتے ہیں۔ اسی طرح انکسی مینڈر نے ارتقائے حیات کا سائنسی نظریہ سب سے پہلے پیش کیا کہ جسے ڈارون سے یادگار سمجھا جاتا ہے۔ اپی کیورس نے ایٹم کے نظریے کو مزید سائنسی بنایا، اور لکریشس نے مادی کائنات کو واحد حقیقت قرار دیا۔

مادیت پسندوں کے پہلو بہ پہلو مثالیت پسند یونانی فلاسفہ بھی موجود رہے۔ دیما قریطس کے بعد مثالیت پسند حکما یونانی فلسفے کی روایت پر چھا گئے اور یونانی فلسفہ دھیرے دھیرے مابعد الطبیعیاتی مباحث میں مسلسل الجھتا چلا گیا اور یوں قدیم یونانی مادیت پسند روایت کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ سقراط تک آتے آتے سوفسطائیوں کو عروج حاصل ہوا۔ سقراط بھی سوفسطائی تھا۔ ان دانشوروں نے کائنات پر غور وفکر کرنے کی بجائے انسان کو موضوع بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفیانہ مباحث نے معروض سے آنکھیں بند کر لیں اور موضوع کے گورکھ دھندوں میں الجھ گئے۔ اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ عقل آزاد اور بے باک ہو گئی لیکن بسا اوقات انسان خود اپنے اٹھائے ہوئے سوالات کا تسلی بخش جواب دینے میں ناکام رہا۔ اسی ناکامی نے مابعد الطبیعیات کی راہ سجھائی لیکن، بشمول افلاطون اور ارسطو کے، ان کی مابعد الطبیعیات میں عقل کی کارفرمائی کو منہا نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا زاویۂ نگاہ تحقیقاتی، تجزیاتی اور عقلی ہے۔ دنیائے انسان کا وہ کون سا شعبہ ہے کہ جس پر قدیم یونانی مفکرین نے غور وفکر نہ کیا ہو۔ سائنس، فلسفہ، طب، سیاسیات، اخلاقیات، جمالیات، شاعری، موسیقی، فنونِ لطیفہ کی دیگر اقسام خصوصاً مجسمہ سازی، منطق، قانون، ریاست اور الٰہیات، غرض علم کے ہر شعبے پر ایسے علمی اور تحقیقی انداز میں غور وفکر کیا گیا ہے کہ ان شعبوں سے متعلق مباحث آج بھی اپنے اندر علمی اور فکری جوہر رکھتی ہیں۔ فلاسفہ کے علاوہ مورخ ہیروڈوٹس، حکیم بقراط اور جالینوس، حسن و عشق کو موضوع

Scanned with CamScanner

بنانے والی شاعرہ سیفو، ایلیڈ جیسا شاہکار تخلیق کرنے والے ہومر، ماہرین قانون لکرگس اور سولن کا دیس بھی وہی خطۂ ارض ہے۔

پس، اقبال کا یہ دعویٰ کہ حکمتِ یونان حقائق کی بجائے محض نظریات ہی پیش کرتی رہی، تاریخی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ تاریخی جبریت کے زیر اثر ان حکما کے نظریات اگرچہ تجربی سائنس کی بنیاد پر استوار نہ تھے لیکن تجربی سائنس کو بنیاد بنانے والے اصول مادیت پسند یونانی فکری روایت میں کافی حد تک سرایت کر چکے تھے۔ نشاۃ الثانیہ کی تحریک جو اٹھارھویں صدی عیسوی میں جا کر تجربی سائنس کی بنیاد پر صنعتی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، اسے چودھویں صدی عیسوی میں اٹلی میں ابھارنے کے لیے محض قرون وسطیٰ کے مسلمان سائنسدانوں کے کارنامے ہی کافی نہ تھے: اس میں بہت کچھ حصہ یونان کے حکمائے قدیم کی مادیت پسند فکری روایت کی طرف مراجعت کا بھی تھا۔ اس تاریخی حقیقت سے انحراف یا انکار ناممکن ہے۔ یورپ کے ہزار سالہ عہدِ تاریک کے خاتمے میں اس مراجعت نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اس بات کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ یورپ نے اپنی تہذیبی شناخت کو اُجاگر کرنے کے لیے نشاۃ الثانیہ کے پورے عہد میں مسلمانوں کی روحانی، باطنی، صوفیانہ یا مذہبی مباحث سے کسی بھی نوع کا کوئی سنجیدہ تعلق قائم کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ مسلمان سائنسدانوں کے صرف سائنسی علوم وفنون کے مختلف شعبوں سے اپنا ربط قائم کیا۔ اس ربط کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کی وہ تہذیبی شناخت کہ جسے کلیسائی نظام سے نجات کے بعد قدیم یونانی فکر میں دریافت کیا گیا تھا، اس کا حقیقی تعلق نشاۃ الثانیہ کے عہد میں مسلمانوں کی سائنسی علوم وفنون میں دلچسپی سے ہی بنتا تھا۔

ایک اہم بات کہ جس سے اقبال نے صرفِ نظر کیا وہ یہ ہے کہ سائنسی علوم اپنی بنیاد میں مذہبی، سیاسی یا سماجی نظریات سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ سائنسی اصول فطرت کی میکانکیت میں، ہر نوع کے انسانی اختیار یا ارادے سے باہر، ہمیشہ سرگرم یا قابلِ اطلاق رہتے ہیں۔ پھر جب ان اصولوں کا اطلاق انسان کی وضع کردہ ٹیکنالوجی میں کیا جاتا ہے تب ٹیکنالوجی اپنی حاصلات میں انسانی سماج کا حصہ بن جاتی ہے۔ جہاں تک تہذیبی اقدار اور روایات کا تعلق ہے، سائنس بطور علم، اصول، قوانین اور اپنے قضایا کے، ان اقدار اور روایات سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ البتہ منطقی اور سائنسی اندازِ فکر ان پر ضرور اثر انداز ہو سکتا ہے۔ مذاہب کے مقابلے میں خالصتاً انسانی علوم

Scanned with CamScanner

وفنون کے بے مثال فروغ میں اس اندازِ فکر نے بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اہلِ مغرب نے جس تہذیبی شناخت کی طرف مراجعت کی وہ یہی اندازِ فکر تھا۔ سائنسی علوم وفنون اور ان کے مختلف شعبوں کا مذہبیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پس یہ علوم مسلمان، عیسائی، یہودی یا ہندو نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ علوم ان کی مذہبی شناخت کو نمایاں کرنے میں کوئی کردار ادا کرتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ کائنات کے مظاہر پر غور وفکر اسلام کی حقیقی ثقافتی روح ہے؛ ایسے میں ظہورِ اسلام سے سینکڑوں برس قبل حکمائے یونان کی طرف سے کائنات پر غور وفکر کی دعوت کو کہاں رکھا جائے گا؟ ان حکمانے بھی یہ کب کہا تھا کہ فطرت کو تجربات کی کسوٹی پر نہ پرکھنا؟ گویا تجربی سائنس کا آغاز اگر کسی نظری دعوے سے ممکن تھا تو اس کا آغاز یقیناً حکمائے یونان کر چکے ہوتے۔

تجربی سائنس کے فروغ کے لیے مادیت پسند سائنسی اندازِ فکر کی حامل روایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان دانشوروں، فلسفیوں اور سائنسدانوں نے قدیم حکمائے یونان ہی سے یہ روایت مستعار لی تھی؛ نہ صرف مستعار لی بلکہ اسے قبول کرتے ہوئے دوام بھی بخشا۔ دسویں سے بارھویں صدی عیسوی تک آتے آتے مسلمانوں کی مقبوضات میں جب مذہبی احیا کی تحریکوں نے سر اٹھانا اور سائنسی علوم وفنون اور افکار ونظریات کو اسلام کی تہذیبی وثقافتی روح کے یکسر منافی قرار دینا شروع کر دیا تو ابنِ عربی اور غزالی سے لے کر مجدد الف ثانی اور خود عہدِ اقبال تک امتِ مسلمہ میں مادیت پسند منطقی اور سائنسی اندازِ فکر اور اس کے حاصلات کو خام اور سطحی قرار دینے کی روایت نے طول پکڑ لیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یونانی حکمائے قدیم کے خلاف حقیقی بغاوت تو دراصل یہ تھی، جبکہ یہی مسلم دور مسلمانوں کا دورِ زوال بھی قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن محض اس قیاس پر کہ یونانی فکر تجربی سائنس کی بجائے نظریات پر استوار تھی، اقبال نے مسلمانوں کی تجربی سائنس میں دلچسپی کو یونانی فکر سے بغاوت کا نتیجہ سمجھ لیا۔ اقبال نے یونانی حکما کی تجربی سائنس کی بنیاد، یعنی مادیت پسند روایت کی فکری اساس کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اگر اشعری، رازی اور غزالی اقبال کے محبوب صوفیا اور علمائے دین ہیں، تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان حضرات کی متصوفانہ شرعی مباحث نے مسلمان معاشرے میں فروغ پذیر عقلی واستدلالی افکار کے حامل مذہبی مسالک کے ساتھ ساتھ مادیت پسند سائنسی اندازِ فکر کے بھی بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے۔ خلافتِ عباسیہ کا سیاسی وسماجی زوال بھی بہت کچھ انھی صوفیا کی تعلیمات

Scanned with CamScanner

کے پھیلاؤ کا نتیجہ تھا۔ تکفیر اور الحاد و زندقہ کے فتوے اس قدر عام ہو گئے تھے کہ ان کی موجودگی میں سائنسی علوم و فنون کی ترقی ناممکن تھی۔ سائنسی اندازِ فکر کی سمت نمائی کرنے والے عوامل یعنی تشکیک، آزادی، بے باکی اور حق گوئی کا یکسر خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ مسلمات اور متعینات سے متعلق متصوفانہ خیال آرائیوں نے لے لی۔ عقلی نظریات اور سائنس بطور علم کے مذاہب اور مذہبی تعلیمات کے متوازی اپنا ایک الگ جہانِ معنی قائم کرنے لگے تھے، اشعری اور غزالی جیسے علما اور صوفیا نے اسے پنپنے نہ دیا۔ یہاں تک کہ سائنسی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں اور ان کی کتب کو وہاں سے ایسا دیس نکالا ملا کہ پھر آئندہ صدیوں میں مراجعت کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ مادیت پسند سائنسی اندازِ فکر نے تجربی سائنس کو معراج تک پہنچانے میں اہلیانِ مغرب کا انتخاب کرلیا۔ اسلامی ثقافت کی روح اگر تجربی سائنس تھی تو وہ اپنے تن سے کیسے جدا ہوگئی؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی جو کوئی بھی صورت تھی (اس پر بحث کی گنجائش موجود ہے) سائنسی علوم و فنون اس کے عین متوازی ارتقاپذیر ہوئے۔ اگرچہ قرآن مجید کے بعض گوشے نظری اعتبار سے ان کی تائید بھی کرتے تھے لیکن ان کی بنیاد خالصتاً مادی تھی اور ان کا جہانِ معنی بھی منفرد اور الگ تھا۔ مسلمان صوفیا کی تعلیمات کے زیرِ اثر رہنے کے باعث اقبال کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے بھی ان علوم و فنون کی منفرد اور ممتاز حیثیت کو تسلیم کر پاتے۔ اقبال اگر یورپی تہذیب و تمدن کی حد درجہ مخالفت پر کمر بستہ رہے تو اس کی وجہ بھی مادی علوم و فنون سے متعلق مادیت پسند فکری روایت کا امتیاز ہے۔ یہ خاص روایت چونکہ انفس (روحانیات) کو آفاق (مادّیات) سے جدا کر دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال کے لیے قابلِ قبول نہیں رہتی۔

اقبال نے اپنے اس خطبے میں علومِ طبیعی میں مسلمان سائنسدانوں کی دسترس کے حوالے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ سب قدیم یونانی فکر کے مقابلے میں اسلامی ثقافت کے پھیلاؤ کا لازمی اثر تھا۔ سوال یہ ہے کہ روحِ مشرق کی اس اسلامی قدر کو دوسری انتہا پر موجود مغربی تہذیب و ثقافت نے اپنے موافق و مطابق کیسے بنالیا؟ اس سوال کا جواب بھی اقبال دینے سے قاصر ہیں۔ وجہ اس کی صرف یہ تھی کہ سائنسی علوم اپنی موضوعاتی حیثیت اور مقام میں کسی بھی نوع کی ثقافتی قدر رکھنے سے محروم تھے۔ یہ کسی مخصوص ثقافتی ساختیے کا لازمی حصہ کبھی نہ تھے نہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف النوع ثقافتوں کے

Scanned with CamScanner

حامل مختلف معاشروں میں، بغیر کسی نسل، گروہی، جغرافیائی، لسانی یا تہذیبی وتمدنی فرق کے، ان علوم کی یکساں طور پر تعلیم وتدریس ممکن ہے۔ طبیعیات، کیمیا، ریاضی، طب، فلکیات وغیرہ سائنسی علوم کے تمام شعبے کسی مخصوص ثقافتی شناخت یا حوالے کے داعی نہیں ہیں، چنانچہ ان علوم کے لیے اہلیانِ مغرب کی تحصیل میں کوئی تمدنی، تہذیبی یا ثقافتی رکاوٹ نہ تھی۔ کیا اقبال نے تجربی علوم کو مسلمانوں کی مخصوص ثقافتی روح قرار دے کر غیر متعلق نتائج اخذ نہیں کیے؟

اس خطبے میں اقبال نے رابرٹ بریفالٹ کی کتاب تشکیلِ انسانیت سے بھی اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ان میں رابرٹ بریفالٹ نے مسلمانوں کی سائنسی علوم پر دسترس کو نہ صرف سراہا ہے بلکہ اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ یورپ کا تمدنِ جدید دراصل مسلمانوں کے سائنسی علوم کا مرہونِ منت ہے۔ یہ بات درست ہے اور گزشتہ سطور میں اس پر بحث کی جا چکی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال نے مذکورہ اقتباسات اس لیے درج نہیں کیے ہیں کہ سائنسی علوم کے حوالے سے مسلمانوں کی اسلامی ثقافت اور اس کی قدر کا کھوج لگایا جائے بلکہ اس کا مقصد محض ساکنانِ مغرب پر مسلمانوں کا احسان جتلانا ہے۔ اقبال نے اس بات کا تجزیہ بھی نہیں کیا کہ وہ کیا تاریخی عوامل تھے کہ جن کی موجودگی میں مغربی دنیا آخرت کے نجات ناموں کو چھوڑ کر دنیاوی مسرت اور ترقی کے حصول کے لیے سائنسی علوم وفنون کے حصول کی طرف دیوانہ وار راغب ہوگئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اقبال نے اسلامی ثقافت کی اصطلاح سماجی، معروضی یا ارضی معنوں میں استعمال نہیں کی بلکہ مذہبی معنوں میں استعمال کی ہے۔ اقبال کو اس بات کا بھی تجزیہ کرنا چاہیے تھا کہ اسلامی ثقافت اور عیسائی ثقافت میں ایسا کیا اشتراک تھا کہ سائنسی علوم وفنون ہر دو صورتوں میں دو مختلف معاشروں میں بار پا گئے؟ ہم جب سیاسی، سماجی اور معاشی تاریخ کو سامنے رکھ کر اس بات کا کھوج لگاتے ہیں تو یہ حیرت انگیز حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ایک ثقافت جو بظاہر مذہبی معنوں میں اسلامی تھی، اس نے ان علوم کو اپنی حدود سے باہر پھینک دیا اور دوسری ثقافت جو بظاہر مذہبی معنوں میں عیسائی تھی، اس نے ان علوم کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ خود اقبال اس خطبے میں عیسائی تعلیمات کے ناقد بھی ہیں۔ اس تجزیے سے ایک سیدھا سا نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ثقافت کو محض مذہبی اصطلاح کے طور پر استعمال کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

رابرٹ بریفالٹ نے اپنی مذکورہ کتاب میں سائنسی علوم پر عرب مسلمانوں کے احسانات کے اعتراف کے ساتھ ساتھ یہ بھی تو لکھا ہے کہ مغربی دماغ آزادی، حریتِ فکر، تشکیک، تجسس، بے باکی، تنقید و تحقیق سے کبھی اپنے آپ کو محروم نہ کر سکا۔ اس نے روم، یونان، عرب، ایران یا کہیں سے بھی جو کچھ حاصل کیا، اسے اپنے مخصوص مزاج اور طبع کے مطابق ڈھال لیا۔ اقبال بھول گئے کہ رابرٹ بریفالٹ یہ نظریہ قائم کرنے کے بعد مسلمانوں کے سائنسی اور فلسفیانہ کارناموں کو بھی مغربی تمدن میں تحلیل کر کے اسی کا ایک حصہ شمار کر گئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ رابرٹ بریفالٹ نے اپنی پوری کتاب میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ ان سائنسی علوم میں (جیسے کہ اقبال سمجھتے ہیں) بالخصوص 'اسلامی روحِ ثقافت' کارفرما تھی، یہی وجہ ہے کہ مغرب نے اسے موافق حال جانا اور اسے 'عیسائی روحِ ثقافت' میں بھی شامل کر لیا! رابرٹ بریفالٹ کی کتاب میں مذہب، مذہبی روح کی حقیقت یا عیسائی و اسلامی روحِ ثقافت سرے سے موضوع ہی نہیں ہے؛ مذکورہ کتاب کے مخصوص اقتباسات اقبال نے اپنے افکار کی استدلالی بنیاد کے استحکام کے لیے پیش کیے ہیں۔

اسلامی ثقافت کی حقیقی روح تجربی سائنس کو قرار دینے کے بعد اقبال نے اپنے الفاظ میں متصوفانہ مباحث اور مسلمان صوفیا کی آرا کے حوالے سے اسلامی ثقافت کو مزید اجاگر کرنے کے لیے تصورِ زمان و مکاں کی وضاحت کی ہے۔ کہتے ہیں:

> پھر اگر زمانہ بھی ایک سلسلہ ہے باہم دگر منفرد آنات (لمحات) کا، تو اس میں کوئی معنی پیدا نہیں ہوں گے، نہ وہ کائنات ہی پر اثر انداز ہو سکے گی۔ مگر یہ کائنات کا وہ تصور ہے جس سے ذہنِ انسانی حیران و سرگرداں رہ جاتا ہے۔ ہم اس خیال سے کہ ہمارے مرئی زمان و مکاں کی ایک حد بھی ہے، مبہوت رہ جاتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ منتاہی گویا ایک حد ہے جس نے ذہنِ انسانی کو حرکت سے روک رکھا ہے اور جس کی حدود سے آگے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہمارا ذہن زمانِ متسلسل اور مکانِ مرئی کی خلائیتِ محض پر غالب آ جائے۔ قرآن مجید کا بھی ارشاد ہے: **وان الیٰ ربک المنتھیٰ**۔ اس آیت پر غور کیا جائے تو قرآن پاک کے ایک نہایت گہرے تصور کی ترجمانی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ یوں ہمیں یہ وضاحت سمجھا دیا گیا ہے کہ اگر ہمیں اپنے منتہا کی تلاش ہے تو ہمارا

Scanned with CamScanner

ستاروں کی طرف بڑھنا عبث ہوگا۔ ہم اس کو تلاش کرنا چاہتے ہیں تو لامتناہی حیاتِ کونی اور روحیت میں کریں۔(203)

اقبال کے یہ خیالات بالکل قیاسی ہیں؛ سائنسی اندازِ فکر سے ان کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔ یہ وہی اقبال ہیں جو اپنی چند سطور پہلے مسلمانوں کو تجربی سائنس کا موجد قرار دے کر ''حکمائے یونان کی بے خبری'' اور ''مغرب کی نالائقی'' بیان کررہے تھے۔ مگر اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ خود فکرِ اقبال سائنسی حقیقت پسندی سے کوسوں دور رہتی ہے۔ جیسے ہی ان پر کوئی سائنسی حقیقت منکشف ہونے کا احتمال پیدا ہونے لگتا ہے، وہ فوری طور پر اپنی ذہنی تشفی کے لیے متصوفانہ خیال آرائیوں یا مابعد الطبیعیاتی مباحث میں الجھ پڑتے ہیں۔ سائنس ایک ایسا علم ہے کہ جو جزئیات سے کل کی طرف سفر اختیار کرتا ہے؛ وہ کسی بھی مظہر کے کُل کو اس وقت تک دریافت نہیں کرسکتا جب تک جزئیات کا احاطہ نہ کرلے۔ سائنس کے اس بنیادی اصول سے انحراف یا عدم واقفیت کے باعث ذہنِ انسانی کُل کو اپنی دسترس میں لانے کے لیے بجز حیران ہونے کے کچھ حاصل نہیں کرپاتا۔ یہ خیال آرائی ایسے ہی ہے جیسے بغیر پروں کے پرندے کی پرواز۔ فطرت کے مظاہر اور پہلوؤں کی ماہیت، قوانین، اجزا، میکانزم کے دیگر مظاہر کے ساتھ مادی اور میکانکی تعلق کی مختلف سطحوں اور کڑیوں کی سائنسی طریقۂ کار کے بغیر تفہیم ممکن نہیں حتیٰ کہ اس کے بغیر ہماری دور بینی اور خورد بینی دنیاؤں سے باہر کے مظاہر کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ سائنس کا پہلا اور بنیادی فرض کسی ایک یا ایک سے زائد مظاہر سے متعلق حدود کا تعین ہے۔ فطرت کے تمام مظاہر اپنے اندر اور باہر ایک دوسرے کے ساتھ نامیاتی اور بعض صورتوں میں غیر نامیاتی تعلق کی ایک زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں۔ سائنسدان کو کل کائنات یا ورائے کائنات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی؛ اس کی دلچسپی اس مظہر یا مظاہر میں ہوتی ہے کہ جس کی خاص حدود کا مطالعہ وہ کرنا چاہتا ہے۔ اقبال کا یہ وہم ہے کہ اس حد بندی یا متناہیت نے ذہن انسانی کو حرکت سے روک رکھا ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ فطرت کے مقابلے میں انسان نے فطرت کی جزوی یا محدود تفہیم کے باعث سائنس کی وساطت سے فطرت کے متوازی جو مادی تمدن تخلیق کیا ہے اس کی کہانی امید اور حوصلے سے معمور ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی صوفی کی واردات نجی، ذاتی اور موضوعی ہے، معروض اس سے ہرگز متاثر نہیں ہوتا۔ اقبال روحانی واردات سے

Scanned with CamScanner

جو کام لینا چاہتے ہیں، اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس کے اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ خود اقبال کو بھی ان خطبات میں بار بار اس بات کا احساس ہوا لیکن وہ تصوف کے موضوعی، داخلی اور باطنی امکانات کے ان دیکھے جہان سے دامن نہ چھڑا سکے۔

لامتناہی حیاتِ کونی کا راز سائنس ابھی نہیں پا سکی اور نہ ہی وہ اس کا دعویٰ کرتی ہے۔ اس کے سامنے ابھی متناہی دنیا کا ایک عظیم جہانِ معنی پھیلا ہوا ہے۔ ابھی وہ اس کے چند مظاہر کو جاننے کی سعی میں ہمہ تن مصروف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لامتناہیت اس کے دائرۂ کار سے باہر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سائنسی بنیادوں پر فطرت کا کوئی منتہا ابھی دریافت نہیں ہوا؛ پس سائنس کا بھی کوئی منتہا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال سائنس کی حدود سے مایوس ہو کر جلد از جلد لامتناہی سے ہم آغوش ہونے کے لیے پھر تصوف کی راہ پر چل نکلتے ہیں:

> اب اس منتہا کی طرف ہمارا عقلی سفر تو بڑا طویل اور دشوار گزار ہوگا، مگر پھر بھی یہی مرحلہ ہے جہاں پہنچ کر افکارِ اسلامی نے جس سمت میں حرکت کی اس کا رخ فکرِ یونان سے سرتاسر مختلف ہو جاتا ہے۔ اشپنگلر کہتا ہے، یونانیوں کی نظر ہمیشہ متناہیت پر رہی۔ لامتناہیت سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کا ذہن ہمیشہ وجودِ متناہی کی قدرتی شکل و ہیئت اور اس کے قطعی اور معین حدود میں الجھا رہا۔ اس کے برعکس اسلامی تہذیب وثقافت کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو ہم دیکھتے ہیں کہ فکرِ محض ہو یا نفسیاتِ مذہب یعنی تصوف کے مدارجِ عالیہ، دونوں کا نصب العین یہ رہا کہ لامتناہی سے لطف اندوز ہوں بلکہ اس پر قابو حاصل کریں۔(203)

اقبال دیماقریطس کے نظریۂ ایٹم کی مخالفت بھی اس لیے کرتے ہیں کیونکہ بقول ان کے اس نظریے کی رو سے مکانِ مطلق کا اثبات لازم آتا ہے۔

اقبال نے اس حوالے سے در پردہ اشاعرہ کی تائید کی ہے، تاہم انھیں مجبور قرار دیا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اشاعرہ صوفیا کا وہ گروہ تھا کہ جنھوں نے معتزلہ کے مقابلے میں اپنے نظریات کا پرچار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افکار کے باعث عالمِ اسلام میں سے سائنس اور سائنسی اندازِ فکر کا جنازہ نکل گیا۔ اشاعرہ کا موقف یہ تھا کہ زمان میں نہ کوئی مسلسل حرکت ہے اور نہ

Scanned with CamScanner

ہی تبدیلی بلکہ یہ آنات (Point Instant) کی لامختتم کڑیوں پر مشتمل ہے۔ انھیں خدا ہر لمحہ، ہر آن مسلسل تخلیق کرتا رہتا ہے۔ یہ وہ نظریہ تھا کہ جس نے علت و معلول کے تعلق کو ختم کر ڈالا اور سائنسی انداز فکر کو اسلامی تمدن سے خارج کر دیا۔ اشاعرہ خیر و شر سمیت تمام اعمال کا ظہور خدا کی ذات سے منسلک کرتے تھے اور اس جبریت کو اسلامی شریعت کی روح قرار دیتے تھے۔ تاہم اقبال نے طوسی کے مکان کثیر الابعاد (Hyper Space) میں حرکت کے تصور کو سراہتے ہوئے البیرونی کے ریاضیاتی تصورِ تفاعل (Functional Concept) کی تعریف کی ہے، جس کے مطابق کائنات کو وجود ساکن ٹھہرائے جانے کا نظریہ ناقص ہے۔ اسی طرح وائٹ ہیڈ اور آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت کو بھی کسی قدر تسلیم کیا ہے۔ لیکن اسلامی ثقافت کی روح ان حکما کے نظریات میں کیسے سمائی ہوئی ہے؟ اقبال نے اس کی موثر وضاحت نہیں کی، بلکہ اس بحث کو اچانک منقطع کرتے ہوئے ابن مسکویہ کے نظریۂ ارتقا کو پیش کیا ہے جس کے مطابق بندر بہ اعتبار ارتقا انسان سے صرف ایک ہی درجہ پیچھے ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال نے یہاں ابن مسکویہ کی جو کتاب الٰہیات کا احاطہ کرتی ہے یعنی الفوز الاصغر، اس کی تفصیل بیان کرنے کی بجائے ان کے مفروضۂ ارتقا کا خلاصہ پیش کر دیا ہے، لیکن اس طویل خلاصے سے بھی کوئی فکری نتائج اخذ نہیں کیے۔ مقصد صرف یہ بتایا ہے کہ دیکھا جائے کہ مسلمانوں کے افکار کی دنیا کس سمت حرکت کر رہی تھی!

ابن مسکویہ کے عقلی استدلال پر مبنی نظریۂ ارتقا کو پیش کرنے کے بعد اقبال نے عراقی کے عارفانہ افکار کی طرف جست بھری ہے، اور ان دونوں کے نظریات کا تجزیہ اور تقابل کرنے کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا۔ عراقی کے متصوفانہ اسلامی تصورات کی ذیل میں بتایا ہے کہ مکان کی تین اقسام ہیں جن میں مادی اور غیر مادی دونوں اجسام کا مکان شامل ہے۔ مکان کی آخری قسم سے متعلق عراقی کے صوفیانہ مسلک کا تجزیہ اقبال نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> یوں بہ اعتبار لطافت، مادی اجسام کے مکانات کی تشریح کرتے ہوئے عراقی نے بالاختصار اس مکان کی وضاحت کی ہے جس کا تعلق غیر مادی ہستیوں مثلاً ملائکہ سے ہے۔ اس مکان میں بھی بُعد کا عنصر، جیسا جیسا کسی ہستی کا مرتبہ ہے، قائم رہتا ہے کیونکہ غیر مادی ہستیاں اگرچہ سنگ و خشت سے گزر سکتی ہیں، بایں ہمہ ان کی حرکت وقت کی پابند ہے

> لیکن عراقی کے نزدیک چونکہ حرکت نقص کی علامت ہے، اس لیے صرف روح ہے جس کو مکان سے آزادی کا آخری مرتبہ حاصل ہے۔ لہٰذا ہم اسے متحرک کہیں گے نہ ساکن۔ مکان کے یہ لامتناہی اختلافات ہیں جن سے گزر کیجیے تو آخر الامر مکانِ الٰہیہ کی نوبت آئے گی۔ وہ ہر قسم کے ابعاد سے پاک ہے اور اس میں سب لامتناہیتیں آپس میں مل جاتی ہیں۔(210)

افسوس یہ ہے کہ اقبال نے ریاضی اور طبیعیات کے تصورات کو محض نظری مباحث کا گورکھ دھندا قرار دیتے ہوئے ان علوم کی اطلاقی حیثیت کو بڑی بے دردی سے نظرانداز کر دیا ہے اور ان کے مقابلے میں عراقی کے مذکورہ باطنی مشاہدے کو روشن خیال قرار دیا ہے۔ اقبال نے مذکورہ روشن خیال صوفی کی باطنی واردات کے ریاضیاتی، طبیعیاتی اطلاق تو کیا، سماجی اطلاق کی بھی کوئی نشاندہی نہیں کی۔ ایک صوفی کی باطنی واردات یا روحانی مشاہدے سے معروض میں کون کون سی ثقافتی اقدار منظرِ عام پر آتی ہیں اور وہ ایک عہد کے موجود میں کن اقدار کی جگہ لے لیتی ہیں؟ اقبال کا یہ خطبہ اس جانب نشاندہی کرنے سے قاصر ہے۔

آگے چل کر اقبال نے ابنِ خلدون کے نظریۂ تاریخ کو قرآن کی روح اور اصل قرار دیا ہے، جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابنِ خلدون نے اپنے مقدمے میں اقوام کے ظہور، ارتقا، عروج اور زوال کا جو نظریہ قائم کیا ہے وہ تاریخی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ چونکہ اقوامِ عالم زندگی کے تمام شعبوں میں ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ کرتی رہتی ہیں، لہٰذا ایک قوم کے کمالات دوسری اقوام کو مسلسل منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اقوام سیاسی، معاشی، اخلاقی یا سماجی اعتبار سے عروج کو چھوتی ہوئی زوال کی طرف بڑھتے بڑھتے فنا ہو سکتی ہیں، لیکن ان کے ارتقا اور عروج کی باقیات ان کے ساتھ ہی دفن نہیں ہو جاتیں بلکہ دیگر اقوام میں ان کا ظہور کسی اور شکل میں ہو جاتا ہے۔ کسی خطے کے انسان مر سکتے ہیں، لیکن ان کے افکار، ہنر، کارنامے اور کمالات نہیں مرتے۔ زندہ رہ جانے والے انسان انھیں اپنی اگلی نسلوں کو منتقل کر دیتے ہیں۔ ابنِ خلدون کا نظریہ صرف اس قوم پر پورا اتر سکتا ہے جو دیگر اقوامِ عالم سے بالکل تنہا ہو کر ارتقا کی منازل طے کرتی ہے۔ تاریخ میں ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے، بلکہ ایسی قوم تو ارتقا کے ابتدائی درجوں ہی میں رہتے رہتے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔ اقوام کے ارضی و سماوی انتقام کے

Scanned with CamScanner

اصول پر تاریخ کا کوئی نظریہ قائم نہیں کیا جا سکتا، مگر افسوس ابنِ خلدون نے اس زمانی جبریت پر تاریخ کا نظریہ قائم کرلیا۔ اس میں اسلامی ثقافت تو کیا، کسی بھی انسانی ثقافت کی روح کو دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظریہ جتنا سنگدلانہ ہے اتنا ہی غیر سائنسی بھی ہے۔ لیکن اقبال نے اسے بڑی عجلت میں ابنِ مسکویہ کے نظریۂ ارتقا سے جاملایا ہے، حالانکہ دونوں نظریات کی مباحث اور دلائل کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک نظریہ فطرت میں جانداروں کے ارتقا کی کہانی پیش کرتا ہے تو دوسرا سیاسی اور سماجی ارتقا کو موضوع بناتا ہے۔ اقبال کو چونکہ اپنے نظریۂ حرکت سے دلچسپی تھی اس لیے بیک وقت انھوں نے دونوں سے استفادہ کرلیا، لیکن ان دونوں نظریوں میں حرکت، ارتقا یا تبدیلی جیسی اصطلاحات کے علاوہ کوئی بھی قدر مشترک نہیں ہے۔

خطبے کے آخر میں اقبال نے اشپنگلر کی کتاب زوالِ مغرب کے حوالے سے اس کی ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس نے اسلامی تہذیب کو مجوسی تہذیب کے پس منظر میں غلط طور پر دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ اقبال کے خیال میں اشپنگلر نے جو مجوسی مجموعۂ مذاہب یعنی یہودیت، قدیم کلدانی مذاہب، ابتدائی عیسائیت، زرتشتیت اور اسلام کو ایک ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور ان مذاہب کے اشتراکات کی روشنی میں وحدتِ ادیان کے اصول دریافت کرنے کی کوشش کی ہے وہ درست نہیں ہے۔ اقبال نے اسلام پر مجوسیت کے اثرات کو تسلیم کرنے کے باوجود اسلامی تعلیمات اور اصولوں کو مجوسیت سے بالکل الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال نے یہاں ان تمام مذاہب کی تعلیمات کے فرق کو نمایاں تو کیا ہے لیکن ان تمام مذاہب کے ثقافتی اشتراکات پر زوالِ مغرب میں جو بحث کی گئی ہے اس کا جواب نہیں دیا۔

6

اقبال کے چھٹے خطبے کا عنوان ''الاجتہاد فی الاسلام'' ہے۔ اِس خطبے کے آغاز میں اقبال نے تاریخی اعتبار سے ایک انتہائی غیر موثر منطقہ پیش کیا ہے۔ اقبال نے کسی مورخ کے حوالے سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ظہورِ اسلام سے قبل عالمی انسانی تہذیب اپنے چار ہزار سالہ ارتقا کے بعد

Scanned with CamScanner

تباہی اور بربادی کے دہانے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس پورے عرصے میں آغاز سے لے کر انتہا اور پھر تہذیبی زوال تک تمام تاریخی نتائج منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ اب پوری انسانیت بے دست و پا ہو چکی تھی، تمام نظامات آزمائے جا چکے تھے، تاریخ کے اگلے مرحلے میں داخل ہونے کے لیے عالمِ انسان کے پاس اب کوئی نسخہ باقی نہ بچا تھا۔ افسوس، اس مقام پر اقبال نے تہذیب کے صرف ایک عنصر یعنی مذہب ہی کے جزسے کُل کا کام لے لیا؛ سماجی، سیاسی، معاشی، لسانی، نسلی، گروہی اور دیگر تہذیبی عناصر کی فعالیت سے اقبال نے کوئی بحث نہیں کی۔ انسانی تاریخ میں ایسا کبھی بھی نہیں ہوا کہ تہذیبیں اپنے ارتقا کے مراحل میں اچانک ایسے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہوں کہ جب انھیں کسی بالکل نئے نظام کی ضرورت پڑ جاتی ہو۔ تہذیبیں پرانا چولا اُتار دیتی ہیں اور نیا لباس پہن کر تاریخ کے اسٹیج پر جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔ ظہورِ اسلام کے وقت، اس سے پہلے اور بعد میں ہندی، یونانی، ایرانی، مصری، چینی اور عرب تہذیبیں موجود تھیں، بعد میں بھی رہیں اور اب بھی ہیں۔ مشرق و مغرب کی یہ تمام تہذیبیں آج بھی اپنی شناخت رکھتی ہیں۔ ان تہذیبوں کا ارتقا بتاتا ہے کہ انھیں کسی مخصوص مذہب کی تعلیمات سے فیض حاصل کرنے کی کوئی اشد ضرورت کبھی بھی نہ تھی۔ ایسا ہوتا تو آج عالمی تہذیب اسلامی تہذیب ہوتی یا ہندو، بدھ یا عیسائی تہذیب ہوتی۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونا ہرگز ممکن نہیں تھا۔

تہذیب تمدنی ارتقا کے ساتھ ارتقا پذیر رہتی ہے اور تمدن کا تعلق زندگی کے ٹھوس عملی اظہارات کے ساتھ ہوتا ہے؛ اس میں ذرائع پیداوار، سیاسی و معاشی تعلقات کا نظام، اس کے حاصلات، مادی مظاہر اور مادی علوم و فنون کی مختلف عمل پذیر جہتیں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ تمدن معاشرے میں انسانی بقا کا ضامن ہوتا ہے۔ انسانی بقا کی یہ جنگ تمدن کو شناخت بھی فراہم کرتی ہے۔ تہذیب انسان کی بقا کی اس جنگ کو موثر بنانے کے لیے کسی خطے کے لیے اقدار و روایات کے مجموعے کو آنے والی نسلوں کے لیے منتقل کرتی رہتی ہے۔ ظہور پذیر ہونے والے نئے نظریات، مسالک، مذاہب، فرقے اور دیگر تعلیمات کے مجموعے بھی ان اقدار و روایات میں شامل ہو جاتے ہیں، لیکن ان میں سے موثر صرف وہی اقدار و روایات رہتی ہیں کہ جن کا بقا کی اس جنگ سے تعلق رہتا ہے؛ دیگر تمام اقدار و روایات تمدن کے ارتقائی مدارج سے خارج ہوتی چلی جاتی ہیں۔ زندہ روایات صرف وہی ہوتی ہیں کہ جن کا تقاضا تمدنی ضروریات کرتی ہیں یا جو تمدنی ضروریات کے باعث وقوع پذیر ہوتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

دوسری بات یہ ہے کہ مذہب، خصوصاً شناخت کے حوالے سے، انسانوں میں بہر حال تفریق پیدا کر دیتا ہے۔ تمدن کی بنیاد چونکہ عام زندگی کے ٹھوس اور حقیقی معاملات پر ہوتی ہے اور یہ سماجی، سیاسی، معاشرتی رشتوں ناتوں کو ایک تنظیم فراہم کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تمدن کے مادی اظہارات مذہبی شناخت کو خاطر میں نہیں لاتے۔ یہ مظاہر عمارات کی شکل میں ہوں، فنون کی شکل میں ہوں، آلاتِ پیداوار کی صورت میں ہوں، اشیائے صرف کی صورت میں ہوں یا کسی بھی مادی صورت میں، ہندو، مسلمان، سکھ، یہودی یا عیسائی نہیں ہوتے بلکہ یہ انسانی لیاقت، علم، ہنر، تجربے اور شب و روز کی محنت کے ثمرات ہوتے ہیں۔ مذہب خواہ کوئی بھی ہو، اپنی تعلیمات کے مخصوص دائرے کے پیش نظر انسانی لیاقت کے تمدنی معجزوں کی تشکیل و تعمیر میں علمی اور فنی سطح پر کوئی رہنمائی فراہم نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسی تمام تعلیمات تنہائی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ تمدن میں اپنے وجود کا خطرہ انھیں ہمیشہ لاحق رہتا ہے۔ پس اقبال کا یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ اسلام کی آمد نے پوری حیاتِ عالم کو زیر و زبر کر دیا، بلکہ حیاتِ عالم کے صرف وہ گوشے، تہذیبیں یا معاشرے کامیاب اور سرخرو ہوئے کہ جن کی بنیادوں میں تمدن کے علمی و مادی مظاہر نے ارتقائی منازل طے کیں، خواہ وہ یونانی تھے، عرب تھے یا اہلیانِ مغرب۔

اقبال کے نزدیک حیاتِ عالم میں کوئی روح کارفرما رہتی ہے جو خود بخود حیاتِ انسانی کے مسائل کے حوالے سے فیصلے صادر کرنے کی اہلیت رکھتی ہے:

> حیاتِ عالم وجدانی طور پر اپنی ضروریات کا ساہدہ کر لیتی ہے اور اِس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ یہ نازک موقعے پر اپنا راستہ آپ متعین کر لے۔ (226)

اقبال نے درست طور پر اسے وحیِ نبوت سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن حیاتِ عالم وجدانی طور پر صدہا سال تک ساقط کیوں ہو جاتی ہے؟ اقبال نے اس سوال پر بحث کو ضروری نہیں سمجھا۔ اقبال نے اس حقیقت کو پیش نظر نہیں رکھا کہ حیاتِ عالم تمدنی ارتقا سے گزرتی ہوئی اپنا راستہ متعین کرتی ہے۔ مذہبی تعلیمات ہدایت کا ذریعہ ضرور ہیں بشرطیکہ ہدایت کے دیگر تمدنی مظاہر بھی حیاتِ عالم میں کارگر ہوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس اصول کو خاطر میں نہ لانے کے باعث اقبال دنیائے تغیر اور اصولِ دوام کے تعلق اور اس کی تعبیر میں بُری طرح پھنس جاتے ہیں۔ دوامی اصولوں کی نظریاتی فعالیت ان کے نزدیک چونکہ اول و

Scanned with CamScanner

آخر اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیائے تغیر کے وہ علمی اور مادی مظاہر جو انسانوں کی تغیر پذیر ترجیحات سے معرض وجود میں آتے ہیں اور ہمیشہ بنتے، ٹوٹتے، بگڑتے اور سنورتے چلے جاتے ہیں، اقبال انسان کی ان تغیر پذیر کاوشوں کی نفی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے دوامی اصولوں کو اصولِ اوّل اور تغیر پذیر اصولوں کو اصولِ دوم قرار دیا ہے اور نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ اصولِ اول سے انحراف کے باعث یورپی علوم وفنون ناکام ہو گئے اور اصولِ دوم کو ترک کرنے کے باعث عالمِ اسلام پانچ سو برس پر محیط جمود کا شکار ہو گیا! اقبال نے اِس بات پر غور نہیں کیا کہ تغیر پذیر یورپی علوم کا سرے سے اصولِ اول کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے —— اصولِ اول ان علوم کی بحث سے خارج ہے۔ رہی ان علوم کی ناکامی، تو ہم یہ بات کسی دیوار یا پتھر ہی کو سمجھا سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ دوامی اصولوں کو، ایمان کی حد تک ہی سہی، عالمِ اسلام نے تو آج تک نہیں چھوڑا؛ اس کے جمود کی وجہ محض اصولِ دوم سے روگردانی ہے۔ اقبال سمیت تمام متصوفانہ افکار کے حامل مفکرین نے اسے اس اصول سے برگشتہ اور متنفر کرنے میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ اقبال بھول گئے کہ مسلمانوں کے عروج کا زمانہ بھی اصولِ دوم کی تائید کا زمانہ تھا۔ اصولِ اول پر انحصارِ محض کے نظریے نے صوفیانہ اور متکلمانہ مباحث کے پیشِ نظر مسلمانوں کی سائنسی اور تعقل پسند روایت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔

بہرکیف، اقبال کے نزدیک ''اجتہاد'' ہی اسلامی ہیئتِ ترکیبی میں ایک ایسا عنصر ہے کہ جس کے ذریعے مسلمانوں میں موجود جمود کو توڑا جا سکتا ہے۔ ان کے خیال میں اسلامی قوانین میں موجود جمود کو صرف اور صرف اجتہاد ہی سے توڑا جا سکتا ہے اور ایسا ہونا قانون سازی میں مکمل آزادی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس حوالے سے معتزلہ کی عقلیت کو اقبال رد کرتے ہیں۔ اقبال نے اس بے روک ٹوک غور و فکر کو خود ''عقل'' کے مقاصد کے خلاف قرار دیا ہے۔ اس کے مقابلے میں اقبال نے دوسرے موقف کی تائید کی ہے، کہ جو شرعی قوانین کے حوالے سے قدرے سخت ہے، تاکہ اسلام کا وجودِ اجتماعی برقرار رہ سکے۔ دوسری طرف اقبال کے خیال میں تصوف میں روحانیت کا عنصر کچھ اس قدر بڑھ گیا کہ اسلام کا ایک پہلو نظر انداز ہو گیا کہ اسلام ایک نظامِ مدنیت بھی ہے۔ اعلیٰ دماغ چونکہ تصوف کی طرف کھنچتے چلے گئے، یہی وجہ ہے کہ سیاست اوسط درجے کے بے علم افراد کے ہاتھوں میں چلی گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کے پاس سوائے مذاہبِ فقہ کی اندھی تقلید کے کوئی راستہ نہ بچا۔ اس

Scanned with CamScanner

طرح تیرھویں صدی میں زوالِ بغداد کے بعد مسلمانوں کی حیاتِ ملّی نے قدامت پسندی ہی میں راہ ڈھونڈی۔ پھر اقبال زوالِ بغداد کے پانچ سو سال بعد کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے ابنِ تیمیہ کا ذکر کرتے ہیں جو اجتہاد کے دعویدار ہونے کے باعث مذاہبِ اربعہ کی قطعیت کا انکار کرتے تھے، لیکن وہ خود حنفی مسلک کے اصولِ قیاس اور اجماع کے شدید خلاف تھے۔ اقبال نے اس حوالے سے ان کی جاں بخشی یوں کی ہے کہ وہ زمانہ اخلاقی اور ذہنی تنزل کا تھا لہٰذا قیاس اور اجماع کی مخالفت ان کا درست اقدام تھا! اس کے بعد اقبال نے محمد بن عبدالوہاب کو ''بدعات کا مصلحِ عظیم'' قرار دیا ہے۔ گویا ابھی تک عقل کی آزادی نے، جو اقبال کے نزدیک اجتہاد کی روح ہے، جو کچھ مذہبی مباحث، نظریات اور قوانین کے حوالے سے سیکھا اور جانا، محمد بن عبدالوہاب نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ وہابیت کی اس تحریک کے مزاج کو بھی اقبال نے سرتاسر قدامت پسند قرار دیا ہے۔

غرض تیرھویں صدی سے لے کر ترکوں کے عہدِ جدید تک کے اجمالی خاکے میں اقبال نے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم اس پورے عرصے میں اسلام کا دامن اجتہاد کی قوت سے خالی رہا۔ وہ عقلیت پسند تھے یا قدامت پسند، اس عرصے کے تمام افکار اجتہاد کی حقیقی روح سے بقولِ اقبال محروم رہے۔ پھر اقبال نے ترکوں کے جدید افکار کا جائزہ لیتے ہوئے 'حزبِ وطنی' کا ذکر کیا ہے کہ جن کے مطابق مذہب کو ریاستی معاملات سے آزاد کر دیا گیا۔ اقبال نے یہاں ان وجوہات کا بالکل ذکر نہیں کیا کہ جن کے باعث ترک وطن پرستوں نے سیکولر نظریات کو قبول کرتے ہوئے ریاستی قوانین کو مذہبی موشگافیوں سے آزاد کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکوں نے تمدنِ جدید کی استواری جب حتمی طور پر انسانی علوم وفنون اور ان کے مادی مظاہر کی برکات میں دیکھی تو ان کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ قدامت پسند مذہبی روایات سے جڑ کر حیاتِ عصری کی ضرورتوں اور تقاضوں سے منھ موڑ لیتے۔ مذہبی احیا کے تصورات کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور جدید مشینی یا صنعتی عہد کو مذہبی مباحث سے کوئی علاقہ نہ تھا، چنانچہ تمدنِ جدید کی تشکیل میں ترک وطن پرستوں نے مناسب جانا کہ مذہب کو ریاستی ترجیحات سے الگ کر دیا جائے۔ اقبال کا یہ کہنا کہ ان ترکوں کو مذہب سے کوئی رغبت نہ تھی، تاریخی اعتبار سے بہت بڑی غلط بیانی ہے؛ یہ لوگ اپنی نجی زندگیوں میں ویسے ہی مسلمان تھے جیسے کہ کوئی دوسرے۔ اسی طرح اجتماعی زندگی کے مذہبی پہلوؤں کے حوالے سے بھی وہ سب اجتماعی زندگی کا حصہ تھے، البتہ

Scanned with CamScanner

انھوں نے ریاستی معاملات اور قوانین کو اپنے قومی ، سیاسی اور معاشی اہداف کے حصول کے لیے مذہب سے الگ کر دیا۔ یہ مسلمانوں کی تاریخ کا پہلا باقاعدہ اور موثر اجتہاد تھا۔

اقبال قانون سازی کے لیے کامل آزادی کی بات تو کرتے ہیں لیکن اس پورے خطبے میں انھیں کہیں بھی یہ جرأت تک نہ ہو سکی کہ وہ ان امور اور مسائل کی نشاندہی کر پاتے کہ جن کے لیے عالمِ اسلام کو کامل آزادی کو بروئے کار لاتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اجتہاد کے حوالے سے عمومی مباحث، عمومی نظریات اور عمومی تصورات پر اکتفا کیا ہے۔

اقبال نے ترکوں کی زیرِ بحث ''آزاد خیالی'' کو رد کیا ہے لیکن وہ اس بات کی وضاحت نہ کر سکے کہ ریاست کا سیکولر دستور اپنے قوانین میں واضح ، دوٹوک ، قابلِ عمل اور حیاتِ اجتماعی کے لیے بغیر کسی بڑی رکاوٹ کے قابلِ قبول رہتا ہے اور حالات کے مطابق و موافق ہونے کے لیے تغیر پذیر بھی رہتا ہے۔ ان قوانین کی بنیاد جدید زندگی کے تقاضوں اور اصولوں پر ہوتی ہے۔ ان کے مقابلے میں مذہبی قوانین اپنے قدامت پسند رجحان کے باعث تمدن کی ہمہ جہت نئی صورتوں کے ساتھ میل نہیں کھاتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مذہب اپنے قیام کے نزدیک تر زمانوں میں، اپنی تعلیمات کے بموجب، زیادہ سہولت کے ساتھ قانون سازی میں فعال ہوتا ہے، یا ہو سکتا ہے، لیکن بعد کے زمانوں میں تمدن، ریاست اور نظامِ مملکت میں ناگزیر تبدیلیوں کے باعث محدود ہو جاتا ہے۔ نئے قوانین، ریاست اور نظامِ مملکت میں تبدیلی کے ناگزیر عمل سے دریافت ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پس قوانین کا بالآخر سیکولر ہو جانا بھی انسانی تاریخ میں ناگزیر ہو جاتا ہے۔ خود اقبال نے بھی مذہب کی ریاست سے علیحدگی کو ناپسند نہیں کیا بلکہ کسی قدر تائید بھی کی ہے، لیکن مذہب اور ریاست یعنی روحانی اور مادی عالمین کی یکجائی کیونکر ممکن ہے، اس بات کی سائنسی، عقلی اور تاریخی اعتبار سے کوئی توضیح نہیں کی۔

اب جہاں تک سیاسی ، مذہبی نظام کی حیثیت سے اسلام کی ہیئتِ ترکیبی کا تعلق ہے، اس نظریے کو بھی شاید ایک حد تک جائز تسلیم کر لیا جائے، گو ذاتی طور پر مجھے اختلاف ہے، کہ اسلام کی توجہ تمام تر ریاست پر ہے اور ریاست ہی کا خیال اس کے باقی سب تصورات پر حاوی۔ دراصل اسلام نے روحانی اور مادی دو الگ الگ عالم قائم ہی نہیں کیے۔ (237)

اقبال کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ترک وطن پرستوں نے مذہب اور ریاست کی تفریق کا اصول مغربی

Scanned with CamScanner

سیاست کی تاریخ افکار سے اخذ کیا ہے۔ خود نظامِ خلافت کا خاتمہ اور عالم اسلام میں جمہوری حقوق کے حصول کے لیے بیداری کی لہر اس بات پر اصرار کرتی دکھائی دے رہی تھی کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ ذرائع پیداوار میں تبدیلی، بدلتا ہوا علاقائی اور عالمی سیاسی منظر نامہ اور جدید علوم کا مختلف النوع سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے حل کے لیے مذہبی قدامت پسندی کے متوازی معاشرے میں اپنے مقام اور حیثیت کو منوالینا، یہ تمام ایسے محرکات تھے کہ جن سے عالم اسلام بشمول ہندوستان اور ترکی بھی ہرگز نہیں بچ سکا تھا۔ بقولِ اقبال اسلام روحانی اور مادی دنیاؤں کو الگ کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، حقائق کی نئی دنیا اب ایک نئی تاریخ رقم کر رہی تھی، اور یہ تاریخ ہمیں بتا رہی تھی کہ سیاست و معیشت سے متعلق ہمارا مادی تمدن علم کے جس دھارے سے حتمی طور پر جڑ چکا ہے اس کی بنیاد مادیت پسندی پر ہے۔ روحانیت کسی بھی مذہب کی روح ہو سکتی ہے لیکن جدید مادی تمدن اور اس کے تضادات کے باعث جنم لینے والے مسائل کا حل، بالخصوص حیاتِ اجتماعی کے حوالے سے، صرف مادی علوم کے پاس ہوتا ہے۔ نجی اور انفرادی زندگی میں چونکہ مذہب کی اہمیت ہو سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مذہب فرد کی ذات کی حد تک موثر رہ سکتا ہے: اجتماعی زندگی کے اجتماعی مسائل کا حل انسان کے ارتقاپذیر مادی علوم ہی میں رہ جاتا ہے۔ پس اگر ترکوں نے روحانی اور مادی دنیاؤں کو الگ الگ کیا تو یہ محض ایک تصور کا خاتمہ تھا: حقیقی دنیا میں ان دونوں کا الگ الگ رہنا ناگزیر تھا۔ حیاتِ اجتماعی چونکہ زیادہ سے زیادہ آزادیوں کی خواہشمند ہوتی ہے تاکہ مسائل کا حل پوری لیاقت اور جرأت سے نکالا جا سکے، یہی وجہ ہے کہ مذہب یا روحانیت کی شخصی ترجیحات کو اجتماعیت سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ ترک وطن پرست بھی اسی مرحلے سے گزر رہے تھے۔

اقبال کا یہ کہنا تاریخی اعتبار سے درست ہے کہ اسلام کا ظہور مدنی اجتماع سے ہوا۔ اسلامی تعلیمات کے اعلیٰ اصولوں نے مدینہ کی ریاست کے قیام میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ سرزمین عرب کے سادہ تمدن میں ان اصولوں کا اطلاق تاریخ اسلام کا قابل فخر واقعہ ہے، لیکن جب مغرب سے لے کر افریقہ اور سرزمین ہند تک مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ پھیلا اور دیگر تہذیبوں، معاشروں، تمدنوں، مذہبوں اور افکار و خیالات کے نئے نئے جہانوں سے مسلمانوں کا سابقہ پڑا تو اسلامی ریاست کے ابتدائی نقوش مسلسل دھندلاتے چلے گئے۔ مسلمانوں کے علاوہ باقی اقوام، خصوصاً

Scanned with CamScanner

تیرھویں صدی عیسوی کے بعد کے حالات میں اپنی تمدنی تبدیلیوں کے باعث، اسلامی طرزِ ریاست کی محتاج نہ تھیں۔ عمرانی وسائنسی علوم اور صنعت کاری کے فروغ کے باعث بالخصوص یورپ نے قوم پرستی کی تحریکوں کے ذریعے اٹھنے والی سیاسی بیداری کے بل بوتے پر ایک نیا اندازِ جہاں بینی سیکھ لیا تھا اور اسے اپنا بھی لیا تھا۔ یہ ایک مادی تصورِ جہاں بینی تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں مسلمان بھی سائنس اور عمرانی علوم میں ترقی کے باعث اسی تصورِ جہاں بینی کے معمارِ اول تھے لیکن اب ان کا مقابلہ سیاسی اور معاشی شکست کے بعد یورپی اقوام سے تھا کہ جن کے موجودہ تصورِ جہاں بینی کو وہ پانچ سو سال قبل چھوڑ چکے تھے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی تک کے پورے عرصے میں، سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے تک، بلادِ اسلامیہ میں مذہب ایک نمائشی شناخت بن کر رہ گیا تھا۔ اب وہ یورپی قوم پرستوں کے مادی اندازِ جہاں بینی کے خاموش تماشائی تھے۔ مادی اندازِ جہاں بینی کے تسلسل کی کوئی کڑی مسلمان اقوام کے پاس نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی فکری روایت اس اندازِ جہاں بینی کی آج بھی صریح مخالف بلکہ دشمن ہے۔ اقبال اپنی تمام تر فلسفیانہ موشگافیوں کے باوجود اسی روایت سے جڑے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مادیت کا اثبات جب روحانیت سے کرتے ہیں تو مادیت کی طبیعیات مابعد الطبیعیات کے گورکھ دھندوں میں الجھ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مادیت کا اثبات روحانیت میں فنا ہو جاتا ہے اور اقبال اس قدامت پسند روایت سے جا ملتے ہیں کہ جس کے پاس مادی تصورِ جہاں بینی یا مادی اندازِ جہاں بینی کا کوئی جواب یا جواز نہیں ہے۔

اقبال کا ترک وزیر اعظم سعید حلیم پاشا کے حوالے سے یہ کہنا بجا ہے کہ اسلام نے حریت، مساوات اور استحکامِ انسانیت کی ابدی صداقتوں کو وحدت میں سمو دیا ہے لہٰذا اس کا کوئی وطن نہیں ہے، لیکن اقبال نے اس جانب توجہ نہیں کی کہ ان صداقتوں کا ہدف خلا میں بسنے والا عالمِ انسان نہیں ہے۔ مختلف اقوام، طبقات اور گروہ بہر حال کسی نہ کسی جغرافیائی حدود میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر حد کے اپنے اپنے قدرتی اور انسانی وسائل ہیں۔ قوم پرستی اگر جرمنی کے نازی ازم کی صورت اختیار نہیں کرتی تو وہ عالمِ انسان کے لیے باعثِ رحمت ہے کیونکہ اقوام انھی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے انسانی بقا کے مسائل کو حل کرنے کی تگ و دو کرتی ہیں۔ اجتماعی زندگی کے دکھوں، غموں، مصیبتوں، محرومیوں اور مشکلات کا علاج انھی وسائل سے ممکن ہوتا ہے۔ اس بات کا فیصلہ کسی قوم کی سیاسی بیداری کرتی ہے

Scanned with CamScanner

کہ وہ ان وسائل کی تقسیم اور تنظیم میں مساوات کے حوالے سے کیا ترجیحات متعین کرتی ہے۔ استحکامِ انسانیت کی ابدی صداقتوں میں وحدت ایک تصورِ محض ہے کہ جس کی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اپنی اہمیت بھی ہے لیکن اقوامِ عالم میں ان صداقتوں کا بیک وقت ظہور کیسے ممکن ہے؟ اس بات کا تعین ہر قوم کی سیاسی، سماجی اور معاشی ارتقا کی تاریخ کرتی ہے کہ وہ اس حوالے سے کس درجے پر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر قوم کے ابدی صداقتوں کے اطلاق اور فہم کے اپنے اپنے معیارات ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ابدی صداقتوں کے سیاسی اور معاشی حوالوں سے مسلمانوں یا عیسائیوں کے معیارات دیگر اقوامِ عالم کو قابلِ قبول ہوں۔

'حزبِ اصلاحِ مذہبی' کے رہنما سعید حلیم پاشا کے حوالے سے اقبال نے بھی اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ تہذیبِ جدید میں وطنی انانیت نے اسلام کے عالمگیر مقاصد کو نقصان پہنچایا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

> سعید حلیم پاشا کو افسوس ہے کہ اسلام کے اخلاقی اور اجتماعی مقاصد بھی، بعض ایسے توہمات کے زیرِ اثر جوامم اسلامیہ کے اندر زمانہ قبل اسلام سے کام کر رہے تھے، غیر اسلامی شکل اختیار کرتے چلے گئے۔ ان کے مقاصد بھی تو اسلامی بہت کم ہیں، عربی، عجمی یا ترکی زیادہ۔ (241)

حلیم پاشا کے خیال میں، جو کچھ ہوا اسے ختم کیے بنا چارہ نہیں کیونکہ اسلام کی یہ مسخ شدہ شکل استحکامِ انسانیت کی ابدی صداقتوں سے منھ موڑنے والی بات ہے۔ اقبال نے اپنے خطبے میں اس اہم ترین موضوع پر بحث نہیں کی کہ اسلام جو ایک ہے، جب مختلف تہذیبیں اسے اپنے عقائد کا حصہ بنا لیتی ہیں تو کیا ان کی اپنی تہذیبی شناخت ان عقائد پر ایمان لانے کے بعد بدل جاتی ہے، یا کس حد تک بدل جاتی ہے؟ اقبال اگر تہذیبوں کے جغرافیائی اور تمدنی حالات وعناصر کا بھی ذکر کر دیتے تو اس کا جواب مل سکتا تھا کہ عقائد انسان کی شخصی زندگی میں تو ایک خاص نوع کی انفرادی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں لیکن گلیوں، بازاروں، چوک، چوراہوں، اداروں، تنظیموں، فرموں، کارخانوں، گھروں، محلوں وغیرہ میں جو زندگی بسر ہوتی ہے اور اس میں جو معاملات اور مسائل پیش آتے ہیں ان کا تعلق کسی علاقے کے خاص جغرافیائی حالات، انسانی وقدرتی وسائل کی فراہمی، ذرائع پیداوار، موسمی تغیرات اور نظامِ مملکت

Scanned with CamScanner

کی ترجیحات کے ساتھ ہوتا ہے۔ معاشی اور سماجی رشتوں ناتوں کا سارا نظام انھی کے زیرِ اثر پروان چڑھتا ہے؛ یہی اس خاص علاقے کی اقدار اور روایات کو مستحکم کرتے ہیں اور یہی وہاں کے باشندوں کی تہذیبی شناخت کو اجاگر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب، مسلک یا فرقہ یا عقیدہ کوئی بھی اختیار کرلیا جائے، اجتماعی زندگی کی تہذیبی شناخت اس بات سے متاثر نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ہونے کے باوجود عربی، ترک اور عجمی، عربی، ترک اور عجمی ہی رہتے ہیں۔ اسلام سے رغبت اور محبت کے اعتبار سے عربی عجمی سے اور عجمی ترک سے زیادہ بہتر مسلمان ہوسکتا ہے لیکن ان کا تہذیبی حوالہ اپنی اپنی شناخت کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ پس حلیم پاشا کا موقف علم انسانیات سے لاعلمی اور بے خبری کے باعث وقوع پذیر ہوا ہے۔

ترکی کی خصوصاً بیسویں صدی کی تاریخ کو اگر سامنے رکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اقبال کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ حزبِ اسلامی اور حزبِ وطنی، دونوں جماعتیں قریباً قریباً آزادیِ اجتہاد اور قانونِ شریعت کی از سرِ نو تشکیل جدید افکار اور تجربات کی روشنی میں کرنے کی خواہش مند تھیں۔ جسے اقبال حزبِ وطنی کا اجتہاد سمجھ رہے ہیں وہ ان کی قومی سیاسی حکمتِ عملی تھی۔ اقبال مذہبی پالیسی کو جس زاویہ نگاہ سے دیکھ رہے ہیں ان معنوں میں یہ مذہبی پالیسی نہ تھی۔ اقبال جدید ترک تمدن کے حوالے سے اسلام کی جس عالمگیریت کے داعی ہیں اور اس سلسلے میں اجتہادی گنجائشیں نکالنے کے آرزومند ہیں، حزبِ اسلامی کے مقاصد کا اس سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔ جس طرح اقبال اپنی بظاہر وسیع المشربی کے باوجود افکارِ جدید کی تائید کرتے کرتے بالآخر مذہب کی قدامت پسند روایت کے اسیر ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح حزبِ اسلامی بھی حزبِ وطنی کی جدت کے سامنے قدامت کے تمام ہتھیاروں کے ساتھ آ کھڑی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی اجتہادی روح نے بھی جدید ترک نظریات کو خلافت کے حوالے سے معتزلہ کا ہم خیال ثابت کیا ہے۔ اقبال دونوں صورتوں میں اسلامی عالمگیریت کے اپنے وضع کردہ روحانی تصور کی کوئی عملی صورت اگر نکالنا چاہتے ہیں تو عصری تاریخ انھیں کوئی راہ سُجھانے میں معاونت نہیں کرتی۔ تاہم اقبال نے اپنے اس تصور کو کسی بین الاقوامی نصب العین کی طرف حرکت قرار دیا ہے اور اِسے ترک شاعر ضیا کی شاعری میں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ضیا ایک روشن خیال آزاد فکر شاعر تھا۔ اس کا مسئلہ مذہب نہیں تھا۔ اس کی بے باکی اس کے سماجی

Scanned with CamScanner

نظریات کو پیش کرتی ہے: مذہب کے عمومی یا مسلمہ تصورات پر کہاں ضرب پڑتی ہے اور کہاں نہیں، اسے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی۔ اُس نے نظم ''مذہب اور سائنس'' میں دونوں کو اہمیت دی ہے۔ علمِ قطعی یعنی سائنس اگر قلب کو روحانیت سے بھر دے تو وہ اس کا مداح ہے، اور اگر مذہب یہ فریضہ سرانجام دے تو وہ بھی علمِ قطعی ہے۔

بہر حال، یہ نظم اقبال کے ذہنی مخمصوں کے بہت قریب ہے، لیکن اسی شاعر کی دوسری نظم پر کہ جس میں اس نے ترکی میں اذان دینے، تلاوت کرنے اور نماز پڑھنے پر فخر کیا ہے، اقبال نے اسی شاعر کی شدید مذمت کی ہے۔ مذہب میں چونکہ، تعبیرات کے حوالے ہی سے سہی، جب کوئی نئی بات کی جاتی ہے تو وہ فوری طور پر بدعت کے زمرے میں چلی جاتی ہے لہٰذا مذہبی قدامت کی موجودگی میں اس نوع کی کوئی بھی تبدیلی یا تجربہ ناقابلِ تسلیم ہو جاتا ہے۔ اقبال کا اعتراض مذہبی روایت کی تاریخ کے حوالے سے بے شک درست ہے، یا درست مانا جا سکتا ہے، لیکن ایک بات ضرور منظرِ عام پر آجاتی ہے، کہ تمدن میں اگر بعض نئی تبدیلیاں آجاتی ہیں تو اجتہاد کا دروازہ کھولنا مزید مشکل ہو جاتا ہے۔ 'کوشش' کرنے والے ہاتھ کٹتے دیر نہیں لگتی۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی اجتہاد کی بجائے قوانین کی سیکولر صورتوں ہی کو ترقی دیا جانا ممکن رہ جاتا ہے۔ لامحالہ ریاست مکمل طور پر عوام کے مذہبی معاملات سے الگ تھلگ رہتی ہے۔

اسی طرح کسی دوسرے بند میں ضیا نے مردوں کے عین برابر عورتوں کے انسانی حقوق کی حمایت کی ہے: خصوصاً طلاق، خلع اور وراثت میں کسی بھی نوع کا صنفی امتیاز روا نہ رکھنے کی بات کی ہے۔ اقبال نے اس حوالے سے عمومی مذہبی مباحث پیش کر کے ضیا کے اس اجتہاد کو بھی مسترد کر دیا ہے اور اسے عائلی قوانین کی روح کے منافی قرار دیا ہے۔ تاہم اقبال، اس کے باوجود، بغیر کسی موثر دلیل کے، جدید مباحث کو خوش آمدید بھی کہتے ہیں جبکہ اس کی کوئی بھی صورت تسلیم کرنے کا رجحان بھی نہیں رکھتے۔ اقبال کو ڈر ہے کہ آزاد خیالی کا یہ عالم کہیں پروٹسٹنٹ ازم کی طرح کسی تحریک کی صورت اختیار کرتا ہوا حدود سے تجاوز نہ کر جائے اور مذہب کی عالمگیر اخلاقیات کی جگہ قومی اخلاقیات نہ لے لے جس کا انجام جنگِ عظیم کی صورت میں سامنے آیا۔ اقبال نے یہاں بھی غلط نتیجہ اخذ کیا ہے۔ مارٹن لوتھر کی اصلاحی تحریک کا عہد Age of Reason کہلاتا ہے اور اس عہد کے عقب میں چودھویں

Scanned with CamScanner

صدی عیسوی کی نشاۃ ثانیہ کی انسان دوست تحریک موجود تھی۔ اس کے تصورِ جہاں بینی کا مرکز مذہب نہیں تھا بلکہ انسان اور انسانی علم، فن اور لیاقت پر کامل بھروسا تھا۔ اس کا نتیجہ قومی بیداری کی سیاسی تحریکوں کی شکل میں برآمد ہوا۔ اقبال کو اپنی قومی شناخت پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ اس پر فخر کرتے ہیں، جبکہ مغربی اقوام کی وطن پرستی اور قومی شناخت میں انھیں بڑے خطرات دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ نوآبادیاتی عہد میں جو کچھ بھی ہوا اس کی وجہ نہ قومی شناخت تھی، نہ وطن پرستی اور نہ ہی کوئی مذہبی وجہ تھی۔ البتہ مذہب کو استعمال ضرور کیا گیا؛ یہ استعمال بھی سیاسی بنیادوں پر تھا۔ نوآبادیاتی عہد میں مغربی اقوام کے درمیان لڑی جانے والی جنگیں حکمران طبقات کی معاشی اور سیاسی اجارہ داریوں کو قائم کرنے کی جنگیں تھیں؛ محض اسی مقصد کے حصول کے لیے نسل پرستی کو بھی ہوا دی گئی۔ مسلمانوں کی عالمی حکومت کے دونوں عظیم ادوار میں بھی اور اس کے بعد بھی نسلی، لسانی اور جغرافیائی بنیادوں پر جنم لینے والے ہولناک واقعات تاریخ کا حصہ ہیں۔ انسانی حقوق کے عالمی معیارات بھی ان بنیادوں کی نفی کرتے ہیں۔ اسلام بھی بجا طور پر یہی دعویٰ کرتا ہے۔ بون یونیورسٹی کے پروفیسر ہارٹن کے حوالے سے اقبال نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام نے گردوپیش کی اقوام سے لادینی عناصر کے علاوہ ہر صالح فکر کو اپنے اندر جذب کر لیا۔

یہ ایک معروف دعویٰ ہے۔ حقیقت خود اقبال نے بھی بیان کر دی ہے کہ فقہاے اسلام ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے بلکہ ملحد قرار دیتے تھے۔ فی زمانہ تو انھی فقہا کے پیش کردہ قوانین پر اکتفا کر لیا گیا ہے۔ ان کی قدامت سند کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ ان سے اختلاف کی جرأت یا کسی نئے تنقیدی زاویۂ نگاہ سے پرکھنے کا تصور بھی محال ہو چکا ہے۔ جب ہم اسلام کہتے ہیں تو اس سے مراد کسی مخصوص فقہ سے تعلق ہوتا ہے۔ ان حالات میں اجتہاد، کسی تنقیدی نقطۂ نظر کی سماجی سطح پر عدم قبولیت کے باعث، ناممکن ہے۔ یہی خدشہ خود اقبال کو بھی لاحق ہے:

> مجھے اس امر کا بھی یقین ہے کہ جونہی فقہِ اسلام کا مطالعہ غائر نگاہوں سے کیا گیا، اس کے موجودہ ناقدین کی یہ رائے بدل جائے گی کہ اسلامی قانون جامد یا مزید نشوونما کے قابل ہے۔ بدقسمتی سے اس ملک [برصغیر پاک و ہند] کے قدامت پسند مسلم عوام کو ابھی یہ گوارا نہیں کہ فقہِ اسلامی کی بحث میں کوئی تنقیدی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔ وہ بات بات پر خفا

Scanned with CamScanner

ہو جاتے اور ذرا سی تحریک پر بھی فرقہ وارانہ نزاعات کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔(254)
یہ تاریخ کی جبریت ہے کہ جس کا کھوج لگانے کی اقبال نے جرأت نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود کو بے دست و پا محسوس کرتے ہیں:

مسلمانانِ ہند چونکہ غیر معمولی طور پر قدامت پسند واقع ہوئے ہیں لہٰذا ہندوستانی عدالتیں مجبور ہیں کہ فقہِ اسلامی کی مستند کتابوں سے سرِمو انحراف نہ کریں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ تو بدل رہے ہیں مگر قانون جہاں تھا وہیں کھڑا ہے۔(261)

خود اقبال کو ترک قوم پرستوں کا 'بدلنا' بھی تو گوارا نہیں ہے۔ لوگوں کا 'بدلنا' مذہبی بحث کے زمرے میں آتا ہی نہیں ہے: لوگ بدلے ہیں تو اس لیے نہیں کہ انھوں نے قدامت کو ترک کر دیا بلکہ بدلے اس لیے ہیں کیونکہ ان کے سیاسی، سماجی، معاشی، علاقائی اور عالمی حالات بدل چکے ہیں؛ یہاں تک کہ ان کے عقائد بھی ان کے بدل جانے پر اثر انداز نہیں ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر اسلامی ممالک کے قوانین مسلّمہ عالمی سیکولر بنیادوں پر استوار ہیں۔ ان معیاری قوانین پر اجتہاد کی ضرورت اس لیے نہیں ہوتی کہ ان کو تبدیل کرنا مذہبی معاملہ نہیں ہے۔

رہا ترکی شاعر ضیا کی مساواتِ مرد و زن کا معاملہ، تو اقبال نے بین السطور اس سلسلے میں طلاق، خلع اور وراثت کے حوالے سے اس بات کی تائید کی ہے کہ عورتوں کی بیداری کی تحریک اگر کوئی ایسا رخ اختیار کر لیتی ہے کہ وہ مرد کی طرح طلاق، خلع اور وراثت کا حق رکھ سکتی ہے تو بجز اس کے چارۂ کار نہیں کہ فقہِ اسلامی کے بنیادی مآخذ کی از سرِ نو تعبیر کی جائے۔ پاکستان کے عائلی قوانین کے تحت نکاح نامے میں عورت کے اس مساوی حق کو تسلیم کر لیا گیا ہے، اگرچہ نکاح کے موقعے پر اس پر عمل درآمد کرنے کی بجائے اس شق پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا جاتا ہے۔ تاہم قانونِ وراثت کے حوالے سے ضیا کے اجتہادی موقف کو اقبال نے تسلیم نہیں کیا۔ ان کے خیال میں مرد پر چونکہ کفالت کی ذمہ داری ہوتی ہے پس جب اس خاص تخصیص کے حوالے سے عورتوں کے دیگر حقوق کا موازنہ کیا جائے گا تو مساوات کی صورت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ اقبال نے اسے پوشیدہ حکمت قرار دیا ہے۔ لیکن ایک سوال بہرحال مساوات کے اس فقہی اصول کو چیلنج کر سکتا ہے کہ اگر عورت مرد کی طرح خاندان کی کفالت کرتی ہے — بعض صورتوں میں وہ ایسا تنہا کرتی ہے اور بعض صورتوں میں مرد کے دوش بدوش

Scanned with CamScanner

کرتی ہے — تو پھر اس اصول کے اطلاق کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اقبال نے اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ کھیتوں، کارخانوں اور دفتروں وغیرہ میں کام کرنے والی خواتین براہِ راست اور بالواسطہ طور پر جائیداد اور دیگر اثاثوں کو بنانے یا بڑھانے میں اہم ترین کردار ادا کرتی ہیں، ملک کی مجموعی قومی ترقی، خوشحالی اور پیداوار بڑھانے میں اپنے حصے کی صلاحیتوں، ہنر اور لیاقت کو بروئے کار لاتی ہیں — اگر عورتوں کی بیداری ہی رہنما اصول ہے تو یقیناً اقبال آج اس کا اثبات کرنے میں بھی نہ ہچکچاتے۔ بہرکیف اس بات سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ تمدنی کوائف میں جب تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں تو انسان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ان کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لیے قوانین کی از سرِ نو تشکیل کرے۔ اگر یوں ہو تو قانون سازی کا معاملہ مذہبی معاملہ کچھ زیادہ نہیں رہ جاتا بلکہ ارتقا پذیر تمدنی ضروریات قانون سازی کے عمل پر مختار ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد اقبال نے اجتہاد کے حوالے سے اسلامی قانون سازی کے ماخذات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ اس حوالے سے اقبال نے بہت کھلے اور قدرے دلیرانہ انداز میں اجتہادی فکریات کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اقبال کے یہ نظریات عصرِ حاضر میں کس حد تک مقبول ہو سکتے ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جو تاریخ سے جواب مانگتا ہے۔ اقبال نے اس سلسلے میں معروضی موقف اختیار کیا ہے:

> پھر جب ہم ان اصولوں کا جائزہ لیتے ہیں جن پر قرآن مجید نے قانون کی بنا اٹھائی ہے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان سے نہ تو فکرِ انسانی پر کوئی روک قائم ہوتی ہے نہ وضعِ آئین و قانون پر۔ برعکس اس کے، ان میں جو وسعت، رواداری اور گنجائش موجود ہے اس سے ہمارے غور و فکر کو اور بھی تحریک ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی اصول تھے جو فقہائے متقدمین کے پیشِ نظر تھے اور جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے متعدد نظاماتِ قانون قائم کیے۔ (259)

اقبال کے خیال میں یہ نظامات چونکہ افراد کی ذاتی کاوشیں ہیں لہٰذا یہ کہنا کہ ان پر قانون کی نشوونما کا خاتمہ ہو چکا ہے درست نہیں۔ لیکن اقبال کے فکری ڈھانچے میں اُس وقت ایک بڑی دراڑ پیدا ہو جاتی ہے جب وہ یہ کہتے ہیں:

Scanned with CamScanner

اندریں صورت مسلمانوں کا آزاد خیال طبقہ اگر اس امر کا دعویدار ہے کہ اسے اپنے تجربات، علیٰ ہٰذا زندگی کے بدلتے ہوئے احوال وظروف کے پیشِ نظر فقہ وقانون کے بنیادی اصولوں کی از سرِ نو تعبیر کا حق پہنچتا ہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو غلط ہو۔ (260)

ظاہر ہے کہ سطور بالا میں اقبال نے سیکولر اندازِ فکر کی تائید کی ہے۔ یہ آزاد خیال مسلمانوں کا زاویہ نگاہ نہیں ہے بلکہ باشعور مسلمانوں کا اندازِ فکر ہے، اور گزشتہ پانچ سو سالوں میں اسی اندازِ فکر کے تحت اسلامی ریاستوں کے لیے قانون سازی ہوئی ہے۔ اس نوع کی قانون سازی کے معیارات بھی محض علاقائی نہیں ہیں بلکہ بین الاقوامی ہیں۔ سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی، لسانی اور مذہبی، غرض ہر نوع کے انسانی حقوق سیکولر بنیادوں پر استوار قانون سازی کے معیارات کے پیشِ نظر وضع کیے گئے ہیں۔ قومی حوالوں سے بعض مذہبی روایات اور شعائر کے تحفظ کی بھی گنجائش ان میں رکھی گئی ہے۔ امورِ مملکت کا سارا تانا بانا انھی سیکولر قوانین سے تشکیل پاتا ہے۔ ان قوانین کی خوبی یہ ہے کہ یہ لوگوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ لوگ اپنے مذہبی معاملات میں آزاد ہوتے ہیں؛ ان کی مذہبی آزادیوں کے تحفظ کو بھی سیکولر قوانین ممکن بناتے ہیں، لیکن مذہب کو ریاستی معاملات میں مداخلت کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔ اس نوع کی قانون سازی کے بنیادی ماخذات میں خود انسان کے ارتقاپذیر علوم کے مختلف شعبے ہیں، اور قانون بذاتِ خود ایک عمرانی شعبہ ہے۔ اقبال کا مذکورہ بیان تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کی فکری کوششوں کی نفی کرتا ہے۔ اس لیے اقبال قدرے دب کر یہ معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں:

زندگی چونکہ ماضی کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھتی ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ جماعت میں تغیر وتبدل کا جو نقشہ ہم نے قائم کیا ہے اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف فراموش نہ کریں۔ (257)

اقبال جن معنوں میں ''انکشافِ ذات'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں ان معنوں میں قانون کوئی انکشافِ ذات نہیں ہوتا، بلکہ حیاتِ اجتماعی میں تہذیب وتمدن کے مختلف تجربات موجودہ انسانی ضروریات کے پیشِ نظر کسی قانون کو وضع کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ اجتماعی زندگی اس قانون کو

Scanned with CamScanner

عصری مسلّمات کے طور پر قبول کر لیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں فقہی قوانین کے مجموعے شخصی ریاضت اور تدبر کی عطا ہوتے ہیں۔

اقبال نے اس بات کا تجزیہ نہیں کیا کہ عالمی تاریخ خصوصاً مسلمانوں کی تاریخ میں قانون سازی کے حوالے سے مذہبی اجتہاد کی بجائے سیکولر نظریات بار کیوں پا گئے ہیں؟ اقبال نے فقہ کے جن نظامات کی بات کی ہے وہ نظامات بجائے خود اسلام کے متوازی اسلام کی مختلف تعبیرات ہیں، اور ہر فقہ سے متعلق جماعت اپنے قانونی نظام کو عین اسلام قرار دیتی ہے، اور یہی نظام اس کے عقائد کو بھی ترتیب دیتا ہے۔ اقبال اسے مسلمانوں کا فکری جمود یا تقلید پرستی قرار دیتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مختلف فقہی عقائد کی حامل تمام جماعتیں ریاست سے متعلق اسلامی قوانین کے علاوہ باقی تمام امور میں اپنے اپنے فقہی قوانین کے مطابق زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ فرقہ پرستی کے سیاسی عنصر کو اگر الگ کر دیا جائے تو ملتِ اسلامیہ کے مختلف فقہی عقائد سے تعلق رکھنے والی جماعتیں آج بھی ان عقائد کی نہ صرف پابند ہیں بلکہ کسی قدر اضافے یا توسیع کے ساتھ مدنی زندگی سے متعلق امور میں رہنمائی بھی حاصل کر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی فقہ کے لیے تاحال کوئی ایسی بڑی اور ہمہ گیر تبدیلی نہیں آئی کہ اسے اجتہاد کی ضرورت پڑے۔ اتحادِ عالمِ اسلام کوئی مذہبی مسئلہ نہیں بلکہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ اس نوع کے کسی اتحاد کو قائم کرنے میں فقہی اختلافات کوئی زیادہ موثر رکاوٹ نہیں ہیں بلکہ اسلامی ریاستوں کی معاشی اور سیاسی ترجیحات ہیں۔ ہر ریاست اپنے قومی مفادات کے تحفظ کے سلسلے میں کوئی بھی حکمتِ عملی اختیار کرنے میں آزاد ہے۔ مسلم اقوام کے درمیان اتحادِ عالمِ اسلام کی اگر کوئی ترجیح نہیں ہے تو یہ اقوام کی اپنی اختیار کردہ ترجیح ہے۔ تمام اسلامی ریاستوں میں فقہی اختلافات کے باوجود مسلمان اتحاد و یگانگت کے ساتھ رہ بس رہے ہیں۔ اس حوالے سے مسلمانوں کے درمیان کوئی بڑا چیلنج صدہا سال سے ہنوز سامنے نہیں آیا۔ تاہم فقہی اختلافات کی خود ساختہ 'خوفناکی' کا ڈھنڈورا وقتاً فوقتاً ضرور پیٹا جاتا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیگر اقوام میں موجود گروہی، نسلی، جغرافیائی اور مذہبی تعصبات سے پیدا شدہ مسائل کے مقابلے میں مسلمانوں کے درمیان موجود فقہی اختلافات کے باعث منظرِ عام پر آنے والے مسائل اور اقوام عالم کے لیے پریشانیاں نہ ہونے کے برابر ہیں: یہاں تک کہ فقہی اختلافات کے حوالے سے علمائے دین کی سخت گیری کو بھی عوام الناس ناپسند کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

اقبال نے عام مسلمانوں کی اس شعوری سطح کو درخورِ اعتنا نہیں جانا جو اس سے کہیں زیادہ موثر، منطقی اور فعال ہے جو شعورِ اقبال اور ان کی روایت کے سابقہ مفکرین فراہم کرنے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔

جو کوئی بھی پانچ سات باتیں ادھر اُدھر سے اتحادِ عالم کی ضرورت واہمیت کے بارے میں سن لیتا ہے وہ لٹھ اٹھا کر مسلمانوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے، یا انھیں باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے فقہی اختلافات کے باعث عالمِ اسلام کو بہت نقصان ہو رہا ہے۔ وہ ان کی اس بات پر اس لیے کان نہیں دھرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے فقہی اختلافات روزمرہ یا زندگی بسر کرنے کے معاملات میں ہرگز مداخلت نہیں کرتے۔ مشکل اور پریشانی کے ہر موقعے پر ان کا یہ قومی شعور تاریخ کے ہر عہد میں کسی نہ کسی طور جلوہ گر رہا ہے۔ یہاں تک کہ مذہب کی بنیاد پر کی جانے والی سیاست بھی ان کے فقہی اختلافات کے باوجود قائم محبت اور ہمدردی کے قومی تعلق کو ختم کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔

اقبال کو مذہبی یا سیاسی عقیدے کی دوئی پسند نہیں ہے اور اس بات کو وہ اسلام کی نظریاتی اساس کے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہاں اقبال کو دراصل حقیقتِ حال کو سمجھنے میں الجھاؤ پیدا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے سیاسی عقائد جب ان کے مذہبی عقائد پر اثرانداز ہی نہیں ہو رہے تو پھر ان دونوں میں دوئی کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ مسلمان سیاست کو مذہب کا متبادل نہیں سمجھتے اور نہ ہی یہ رجحان رکھتے ہیں کہ سیاست ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرے۔ وہ اپنے سیاسی نظریات میں آزاد ہیں اور مسلک کے حوالے سے اپنے مذہبی عقائد کے پابند ہیں۔ اقبال نے عالمِ اسلام میں تمدنِ جدید کی صورت کا مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ریاست کے عمومی قوانین کی تشکیل کے لیے ایک بہت ہی چھوٹی حد سے زیادہ مذہبی ماخذات سے رجوع کیوں نہ کیا جا سکا؟ اس حوالے سے صدیاں گزر جانے کے باوجود علمائے دین اجتہاد سے معذور کیوں رہے؟ اقبال کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ہے۔ محض تقلید پرستی قرار دینے سے معاملے کی سنجیدہ نوعیت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہوا یہ ہے کہ کسی ریاست میں اگر ایک ہی فقہ کے متعلق قوم کی غالب اکثریت موجود تھی تو وہاں اس فقہ کے ریاستی امور

سے متعلق قوانین کسی نہ کسی حد تک ضرور بروئے کار لائے گئے ۔لیکن عالم اسلام میں ایسی ریاستیں دو تین سے زیادہ نہیں ہیں؛ ان کے علاوہ باقی تمام مسلمان اقوام میں ہر فقہ سے متعلق افراد کی ایک معقول تعداد موجود ہے اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی ایک فقہ کا نفاذ کر دیا جائے۔ اگرچہ اسلام میں یہ سہولت موجود ہے کہ ہر فقہ کو اس فقہ کے عقائد اور قوانین کے مطابق حقوق و فرائض کا پابند بنایا جا سکتا ہے ،لیکن اصل مسئلہ اقتدار کا ہے کہ کس فقہ کے ریاستی نفاذ کی ذمہ داری کس فقہ کے حصے میں آتی ہے۔ یوں ریاست، جو ایک عمومی فلاحی ادارے کے طور پر کام کرتی ہے، ایک بین الفقہی سماج میں کسی مخصوص فقہ کی عملداری رواداری کے خاتمے کا اعلامیہ بن سکتی ہے۔ اسلامی ریاستوں میں یہ تجربہ کئی صورتوں میں سامنے آ چکا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان ممالک کے تمدن میں علاقائی اور عالمی سطح پر آنے والی سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کے باعث ریاست سے متعلق فقہی یا مذہبی قوانین اپنی اہمیت اور افادیت کے باوجود قابلِ قبول نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود اقبال نے بھی خلافت کے روایتی اسلامی تصور کو جمہوری ریاستوں کے قیام کے بعد غیر ضروری قرار دیا ہے۔ لیکن اقبال جمہوری ریاستوں کے قوانین کی سیکولر بنیادوں کو محض جب مغرب کی پیروی کہہ کر مذہبی بنیادوں کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو نتائج اخذ کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ اُدھر جاتے ہیں تو دین ہاتھ سے نکلتا ہے، اِدھر آتے ہیں تو دنیا ہاتھ سے نکلتی ہے؛ جبکہ حیرت انگیز طور پر اسلامی معاشروں کی روشِ عام کو سامنے رکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ مسلمان دین اور دنیا دونوں میں کامیاب ہونے کا ہنر جانتے ہیں۔ کم و بیش اسی برس گزر جانے کے باوجود اقبال کے اندیشے درست ثابت نہیں ہوئے۔ جہاں تک ثقافت کے نمائشی پہلوؤں کا تعلق ہے تو ان میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی ناگزیر ہے؛ ان سے گھبرانے یا خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلامی تمدن اور تہذیب پر بھی ثقافتی یلغاریں اگرچہ دکھائی دیتی رہی ہیں اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے لیکن مفادِ عامہ کے اجتماعی پہلو ان کی نگرانی اور احتساب بھی کرتے رہتے ہیں۔

اسلامی قانون سازی کے دوسرے بڑے ماخذ یعنی حدیث کے بارے میں اقبال کا کہنا یہ ہے کہ اس سلسلے میں صرف قانونی حیثیت کی حامل احادیث کو الگ کر لیا جائے اور پھر حضور پاکؐ نے احکامِ قرآنی کی جو تعبیر فرمائی اس کے اصولوں کی بدولت فقہ کے اس بنیادی ماخذ کی از سرِ نو تعبیر اور

ترجمانی کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نے اہل سنت والجماعت کے طریقۂ کار کو بہتر قرار دیا ہے۔ اجماع کے سلسلے میں اقبال نے بلادِ اسلامیہ میں جمہوریت کے فروغ اور اس کی قانون ساز مجالس کی آزادانہ مباحث کے طریقۂ کار کو پسند کیا ہے۔ ان کے خیال میں اجماع قرآن مجید کا ناسخ نہیں ہوسکتا بلکہ کسی حکم قرآنی کی توسیع یا تجدید کرتا ہے۔ اس بارے میں ان کا کہنا یہ ہے کہ امرِ واقعی اور امرِ قانونی میں امتیاز قائم کردیا جائے۔ مسئلہ اگر تعبیر اور ترجمانی کا ہو تو صحابہ کا طریق انھی باتوں میں حجت ہے جن میں قیاس سے کام نہیں چلتا؛ جن معاملات میں قیاس سے کام لیا جاسکتا ہے ان میں ہم اسے حجت نہیں ٹھہرائیں گے۔ اس کے بعد اقبال کہتے ہیں:

> لیکن ابھی ایک اور سوال ہے جو اس سلسلے میں کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں تو جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی قانون ساز مجلس قائم ہوگی اس کے ارکان زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے جو فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے ناواقف ہیں۔ لہٰذا اس کا طریقۂ کار کیا ہوگا کیونکہ اس قسم کی مجالس شریعت کی تعبیر میں بڑی بڑی شدید غلطیاں کرسکتی ہیں۔ (271)

مسلمان جمہوری ممالک جہاں قانون ساز اسمبلیاں موجود ہیں وہاں خصوصاً ریاستی قوانین کی نوعیت بالکل سیکولر ہے؛ یہ قوانین تبدیل کیے جاسکتے ہیں اور منسوخ بھی کیے جاسکتے ہیں۔ اس نوع کی ہر قانون سازی میں معاملات اور مسائل کے سیاسی، سماجی اور معاشی تقاضوں اور امکانات کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ قانون اپنی نوعیت، حیثیت اور مقصد کے اعتبار سے معروضی ہوتا ہے۔ پس ایسی مجالس سے اقبال کی توقع اضافی ہے۔ تاہم اس سلسلے میں اقبال نے استخراجی طریقۂ کار کی تائید نہیں کی بلکہ قیاس کے حوالے سے امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کی تعبیرات کی دوامی حیثیت کو، کہ جنھیں اس فقہ کے معتقدین نے زندگی کے تنوع سے آزاد سمجھا، خود اس فقہ کے خلاف قرار دیا ہے۔ اقبال نئے نئے احوال وتجربات سے فائدہ اٹھانے کے حق میں ہیں، لیکن امت کوفی زمانہ کون کون سے ایسے معاملات اور مسائل درپیش ہیں کہ جن کے لیے اقبال اجتہاد کی دعوت دینا چاہتے ہیں؟ خطبے میں وہ معاملات نہیں اٹھائے گئے۔ یہ درست ہے کہ حق وصداقت کا انکشاف صرف عقل محض سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے استقرائی طریقۂ کار کو بھی استعمال میں لانا چاہیے تاکہ ان میں ایمان ویقین کی حرارت پیدا ہو جائے کہ وحی جس کی دعوت دیتی ہے۔ یہاں اقبال کو وضاحت کرنا چاہیے تھی کہ یورپی یا ایشیائی

Scanned with CamScanner

جمہوری قوانین میں وہ کون سے عوامل ہیں کہ جن کے باعث اخلاقی ارتقا کو خطرات لاحق ہیں؟ یہ بھی درست ہے کہ جمہوریت دولت مندوں کی خاطر ناداروں کے حق کو چھین رہی ہے لیکن نادار لوگ اپنے حقوق کی جنگ اس طرزِ حکومت اور اصولِ قانون سازی کے علاوہ کس طریقۂ کار کو بروئے کار لا کر جیت سکتے ہیں؟ اقبال نے، افسوس، اس کی طرف ہرگز اشارہ نہیں کیا۔ 1930 میں اقبال کے مذکورہ خطبات کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ یہ وہ دور ہے جب پوری دنیا میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف اٹھنے والی سیاسی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔ غلامی سے نجات اور معاشی و سیاسی حقوق کی جدوجہد اپنی منازل بہت تیزی سے طے کر رہی تھی۔ جمہوری حقوق کے تحفظ اور حصول کے شعور کی بیداری نے اس حوالے سے کلیدی کردار ادا کیا۔ یہ ایک سیاسی جنگ تھی جو اصولی طور پر سیاسی بنیادوں پر لڑی گئی۔ اس جنگ کے مقاصد میں آزاد اور خودمختار جمہوری ریاستوں کا قیام تھا اور یہ مطالبہ خود سیاسی تحریکوں کی روح رواں تھا۔ اقبال نے اسے محض جنگِ عظیم اور نوآبادیاتی عہد کے یورپی استعمار کے پس منظر میں دیکھا اور مغربی جمہوریت کے امکانات کو رد کر دیا۔ اس میں دوش اقبال کا نہیں ہے۔ اقبال نے اپنے عہد میں جو دیکھا اور غور کیا اس سے ایسے نتائج مرتب ہو سکتے تھے، لیکن اقبال نے خطبے کے آخر میں مسلمانوں کو حیاتِ اجتماعی کی از سرِ نو تشکیل کے سلسلے میں جس روحانی جمہوریت کا دعویٰ کیا ہے، کم از کم اجتہاد کے حوالے سے انھوں نے جن مشکلات اور خدشات کا ذکر کیا ہے ان کی موجودگی میں اس دعوے کا امکان محال ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جمہوری اداروں، تصورات اور طرزِ حکومت کی جو کوئی بھی شکل مسلمان معاشروں میں موجود ہے وہ یقیناً اپنے اصولوں اور بنیادوں میں سیکولر ہے، لیکن اس چیز کا مذہبی عقائد، روحانیت یا ایمان و یقین سے کوئی ٹکراؤ یا تضاد نہیں ہے۔ انسانی حقوق کی جو فہرستیں دساتیر میں شامل ہیں ان میں سے بیشتر مذہب کی اعلیٰ تعلیمات کے تحفظ کو یقینی بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلادِ اسلامیہ میں جمہوری حقوق کی جدوجہد کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ ایسا مذہب کے دفاع میں نہیں ہوا بلکہ حیاتِ اجتماعی میں انسانی فلاح و بہبود کے عالمی انسانی تصورات کی بیداری کے باعث ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کے مقاصد روحانی نہیں ہیں جو کسی فرد کی قلبی راحت کے اسباب پیدا کرنے کا موجب ہوں بلکہ ان کی نوعیت اجتماعی ہے، پس یہ اپنی بنیاد میں معروضی صداقتوں کے پیشِ نظر

Scanned with CamScanner

انسانوں کے معروضی مفادات کے حصول کے لیے جمہوریت کی شکل میں ایک تنظیم پیدا کر دیتے ہیں۔ اس تنظیم میں مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ اور ان کے ذیلی ادارے صرف اور صرف مادی زندگی کے عملی پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا منشا انسان کی مادی زندگی میں ترقی اور بہبود ہے۔ فرد اپنی روحانی ضروریات کی تکمیل کے لیے کیا کچھ بروئے کار لا سکتا ہے؟ اس سلسلے میں جمہوریت دوٹوک اور واضح الفاظ میں فرد کے شخصی اور مذہبی حقوق کے تحفظ کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس نوع کی شخصی اور مذہبی آزادیاں انسان کے بنیادی حقوق کے چارٹر میں شامل ہوتی ہیں، لیکن ان آزادیوں کو اجتماعی زندگی کے طے شدہ جمہوری مقاصد سے کھیلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اکیسویں صدی میں جمہوریت کا جو تصور آج دنیا میں اپنا مقام پیدا کر چکا ہے اور ملت اسلامیہ کے جمہوری ممالک جسے اپنے تمدن کا لازمہ سمجھتے ہیں، اس میں اقبال کی اجتہادی روحانیت کی گنجائش ختم ہو چکی ہے۔

اقبال نے روحانی آسودگی کے دیگر تمام پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ مذہب کے علاوہ انسانی تہذیب و تمدن میں جمالیاتی اقدار، ادب و شعر، موسیقی، رقص، مصوری، مجسمہ سازی وغیرہ فنونِ لطیفہ اور آرٹ سے متعلق دیگر شعبے انسان اور عالم انسانیت کو مہذب، شائستہ اور انسان دوست بنانے کے ساتھ ساتھ اسے روحانی، قلبی یا ذہنی راحت و آرام فراہم کرنے کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔ فنکار اور اس کا فن ایک ایسا قومی اثاثہ قرار پاتا ہے کہ جس پر اس کا عہد ہی نہیں، آئندہ نسلیں بھی فخر کرتی ہیں۔ اسی طرح شادی بیاہ جیسی تقریبات، دوستی، محبت، رشتہ داری، میلے ٹھیلے، عرس اور تہوار ہماری زندگیوں کے شخصی اور اجتماعی پہلوؤں میں آسودگی کے ہمہ جہت انداز اور رنگ رکھتے ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری کی طرح ان خطبات میں بھی کہیں ان پہلوؤں سے بحث کرنا مناسب نہیں جانا۔ اقبال کو، یوں محسوس ہوتا ہے کہ، ثقافتی اور سماجی زندگی کی قربت سے وحشت ہوتی ہے۔ خلاؤں کو تسخیر کرنے کی بات کرنے والے اقبال اپنے ارضی حوالوں سے بہت کم متاثر ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فکر میں سماج کے مذکورہ پہلوؤں سے ایک بے تعلقی بہت واضح محسوس ہوتی ہے۔ ہماری اخلاقی زندگی کے بے شمار پہلو ایسے بھی ہیں کہ جن کا تعلق مذہب کی بجائے ہمارے سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی تعلقات کے نظامات سے ہے۔ اخلاقی زندگی کے ان پہلوؤں سے ہم آہنگ رہنا مذہبی احکامات کی بجا آوری کے باعث نہیں ہے بلکہ ہماری تہذیب اور تمدن کی ارضی روایات و اقدار

Scanned with CamScanner

کے باعث ہے۔ خوشی، غمی، راحت و آرام، دکھ سکھ، امن اور اطمینان جیسے جذبات و احساسات کو ہم انھی ارضی حوالوں سے جانتے اور سیکھتے ہیں اور انھی کے ذریعے شخصی یا سماجی سطح پر اظہار میں لاتے ہیں۔ روحانی آسودگی کے یہ وہ انسانی وسائل ہیں کہ جن کے لیے کسی اجتہاد کی ضرورت نہیں۔

7

اقبال کے ساتویں اور آخری خطبے کا عنوان ''کیا مذہب کا امکان ہے؟'' دیا گیا ہے۔ یہاں اقبال نے صرف اسلام ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے مذاہب کے حوالے سے انسانی سماج کے ارتقا کو محض مذہب، تصوف، مابعدالطبیعیات اور روحانیات کے ارتقا کی تاریخ میں ہی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''کیا مذہب کا امکان ہے؟'' کا سوالیہ انداز اقبال کی فکری کشمکش کا عنوان بھی ہے، کیونکہ عالمی سطح پر اقبال تک آتے آتے مذہب عالمی نظاموں کا حصہ نہ رہا تھا بلکہ وہ جدید علوم وفنون کے مقابل اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔

زندگی کے مذہبی پہلو میں عوام الناس کے ہاں جس بات کو سب سے زیادہ پذیرائی حاصل ہوتی ہے اس کا تعلق پہلی سطح پر عبادات کے ساتھ ہے، جبکہ دوسری سطح پر معاملات کے حوالے سے مذہب کی سادہ اور قابلِ فہم اخلاقیات سے ہے۔ ان اخلاقیات اور تعلیمات کے ایک بہتر انسانی سماج کے قیام اور اس کی تنظیم میں معاون ہونے کی وجہ سے لوگ مذہب کو اپنی زندگی میں اہمیت اور احترام دیتے ہیں۔ مثلاً قرآن اور احادیث میں معاملات سے متعلق جو اخلاقیات موجود ہیں، وہ ہر عہد کے لیے سادہ، موزوں اور قابلِ عمل ہیں۔ سخاوت، دیانت داری، احسان، ایثار، درگزر، حق گوئی، عدل، انصاف، اخوت، ہمدردی، راستی وغیرہ براہِ راست ہماری سماجی زندگی میں ہمہ وقت عمل درآمد کا تقاضا کرتے رہتے ہیں۔ انسانی ارتقا کی تاریخ کے جس موڑ پر ان اخلاقیات کا خاتمہ ہو جائے گا یا یہ اخلاقیات قابلِ ترجیح نہ رہیں گی، شاید اسی موڑ پر مذہب کا امکان بھی ختم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کا ان اخلاقی قدروں سے یکسر آزاد ہو جانا محال ہے کیونکہ ان کے بغیر سماجی زندگی کا بنیادی ڈھانچہ ہی تباہ ہو جائے گا۔ پس ہم بڑی احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن

Scanned with CamScanner

نہیں ہے۔ یوں اصولی طور پر مذہب کا امکان بھی برقرار رہ جاتا ہے۔

اس خطبے میں اقبال مذہبی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ پہلے دور کو اقبال نے ایمان کا، دوسرے کو فکر کا اور تیسرے کو معرفت کا دور قرار دیا ہے۔ فکری اعتبار سے اقبال کا دعویٰ یہ ہے کہ دورِ اوّل میں مذہب چونکہ حسبِ حال ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ افراد یا اقوام اسے بے چون و چرا تسلیم کر لیتی ہیں؛ اس کے لیے مذہب کی حکمت کو ازروے عقل جانچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسرے دور میں مابعد الطبیعیات کی جستجو مذہب کے حوالے سے فکری یا منطقی اساس تلاش کرتی ہے، اور تیسرا دور معرفت کا ہے کہ جس کے ترجمان صوفیا قرار پاتے ہیں۔ اقبال کی طرف سے کی گئی اس تقسیم نے خود ان کے لیے بڑے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ وہ مذہب کو جب صوفیا کی اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد شخصی، ذاتی یا نجی باطنی مشاہدہ یا واردات ہوتی ہے۔ صوفی کی واردات حقیقتِ مطلق تک رسائی چاہتی ہے؛ اس کی ابتدا و انتہا یہی ہے، انسانی تمدن کے اجتماعی عملی پہلوؤں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہاں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ اقبال:

—— دورِ اول کی مذہبی حیثیت کو اس کے حقیقی معنی میں دیکھتے ہیں؟ یا

—— دوسرے دور کی مابعد الطبیعیاتی منطقیت پر مبنی مذہب کو مذہب سمجھتے ہیں؟ یا

—— تصوف کو مذہب یا اسی متصوفانہ مذہب کو دورِ اول کے مذہب کی ایک شکل قرار دیتے ہیں؟

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اسلام اپنے دورِ اول (حضور اکرم اور خلفاے راشدین کے عہد) میں فکری اور عملی اعتبار سے اپنی بہترین صورت میں عالمِ انسان کی تاریخ میں محفوظ ہے۔ اسلام کی ہمہ گیر قبولیت کا بنیادی سبب اس کی علمی اور عملی افادیت تھی؛ کم از کم اسلام ہرگز ایسا مذہب نہیں ہے کہ جس کے ابتدائی ماننے والے ازروے عقل اس کے فکری پہلوؤں کے عرفان یا اس میں چھپی حکمت سے ناآشنا تھے۔ اہلِ ایمان نے اس مذہب کی بدولت عدل، انصاف، سماجی مساوات، انسانی حقوق کے شعور اور خیرِ کثیر کا صدہا سال موثر ترین درس حاصل کیا۔ اس کی تعلیمات محض حکم کا درجہ نہیں رکھتی تھیں بلکہ اس کی عملی زندگی میں افادیت نے تاریخ کے صفحات میں ایک نیا باب رقم کیا۔ تہذیبی اور تمدنی زندگی کا وہ کون سا پہلو تھا کہ جس میں اسلام کی سادہ تعلیمات نے حکمت کے درجے پر پہنچ کر رہنمائی کا فریضہ سرانجام نہ دیا ہو؟ یہ اسلام کی فکری اور منطقی اساس ہی تھی کہ جس کے باعث دیگر اقوام

Scanned with CamScanner

نے بھی اسے ذریعۂ نجات جانا اور گروہ در گروہ اس میں شمولیت کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھا۔

اسلام میں اس کی حکمت کا حقیقی سرچشمہ قرآن اور حدیث ہیں۔ یہ دونوں سرچشمے بذاتِ خود انسانی عقل اور فکر کو بروئے کار لانے کے داعی ہیں۔ یہ دونوں سرچشمے اپنی مخصوص تعلیمات کے بموجب اپنے اندر مابعد الطبیعیاتی دلائل اور براہین بھی رکھتے ہیں۔ ان بنیادوں پر اسلام کی حیثیت و تشخص صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی برقرار ہے۔ لیکن ان اسلامی سرچشموں کے ساتھ ساتھ انھی سرچشموں سے متعلق جو مابعد الطبیعیاتی نظریات کی دیگر مختلف صورتیں مسلمانوں کی تاریخ میں سامنے آئی ہیں، ان کا مطالعہ مسلمانوں کی عظیم فکری و فلسفیانہ روایت کے تحت علمی جستجو پر ضرور دلالت کرتا ہے، تاہم تاریخ کا قاری آگاہ ہے کہ ان کی عملی افادیت کے مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور ان کے نظری تضادات نے اسلام کے حقیقی فکری سرچشموں کے متوازی مختلف ادوار میں کس کس صورتِ احوال کو جنم دیا۔

جہاں تک مذہب کے امکان کی بات ہے تو ہماری اجتماعی زندگی کے اخلاقی پہلوؤں کے حوالے سے مذہب کے بنیادی سرچشمے ہی قابلِ ترجیح ہیں۔ ان سے فیض رسانی کا عمل کبھی بھی نہیں رکا، لیکن جہاں تک تمدن کے سیاسی، سماجی، معاشی اور دیگر علاقائی، عالمی اور مقامی سطح پر وقوع پذیر تبدیلیوں کا معاملہ ہے تو حکمتِ عملی کے حوالے سے اس میں موجود تضاد اور تناقص پر قابو پانے کے لیے یا اسے کم سے کم کرنے کے لیے ارتقا پذیر انسانی علوم اور فنون کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ یہ علوم اور فنون خود اپنے محتسب اور ناقد بھی رہے ہیں۔ ہم جسے کائنات یا عالمِ خارجی ٹھہراتے ہیں، وہ عقل کی تاویل نہیں ہے بلکہ عقل کی عدم موجودگی میں بھی موجود ہے، اور جسے وجودِ حقیقی کہا جاتا ہے وہ علامت یا محض نام نہیں ہے، اقبال اپنے فکری نظام میں جسے وہم تک سمجھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ ہر حقیقی وجود اپنی خارجی ساخت کے ساتھ ساتھ اپنی داخلی ماہیت کا نظام بھی رکھتا ہے۔ یہ نظام اگر موجود نہ ہو تو ہر حقیقی وجود اپنی موجودیت کو بھی فنا کر بیٹھے۔ علم اسی نظام کی تفہیم کا نام ہے اور فنون کے ذریعے اسی علم اور اسی کے امکان کو ایک نئی مادی حقیقت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

علم کی یہ خاص نوع کسی صوفیانہ تجربے یا واردات کا حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ اقبال صوفیانہ تجربے کے باطنی وروحانی ارتقا اور علم کے مادی ارتقا میں ایک واضح فرق رکھتے تھے، اقبال نے علم کی

اس آزاد اور خود مختار حیثیت پر خاص توجہ دینے اور حیاتِ اجتماعی میں اس کی ضرورت و اہمیت اور وسیع ترین اثرات پر بحث کرنے کی بجائے، اسے نظر انداز کرتے ہوئے، مادی وجود کی حقیقت کے صوفی کی نجی، انفرادی اور شخصی واردات میں منکشف ہونے کے یقین پر توجہ دی ہے اور یہ بھی اعتراف کرلیا ہے کہ سلوک وعرفان کے جو طریقے ازمنۂ متوسط کے صوفیا میں رائج تھے، فی زمانہ اس قسم کے افراد پیدا نہیں ہورہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی کرنی چاہیے تھی کہ ان قدیم صوفیا نے عالمِ خارجی کے متعلق تصورات کے علاوہ سائنسی اور فنی علوم کی کن کن شاخوں کو مرتب کیا؟ پھر خودی اپنی گہرائی میں جو معرفت حاصل کرتی ہے (جسے اقبال نے مذہب کا کمال بیان کیا ہے)، وہ حیاتِ اجتماعی میں عالمِ مادی کی مختلف صورتوں کو کیسے زیروزبر کرسکتی ہے؟ اندرونِ ذات کے حیاتی تغیرات کو اقبال نے ان معنوں میں علوم کی عقلی، مادی اور سائنسی حیثیت اور طریقۂ کار سے الگ کردیا ہے لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ انھی تغیرات کے ذریعے وجودِ حقیقی کے راز کو بھی پالیا جاتا ہے! مادی حقیقتوں کا سراغ سائنس کے علاوہ کسی علمی سرچشمے سے ممکن نہیں۔ اقبال اپنے فکری نظام کے تحت مادی و سائنسی علوم، خصوصاً طبعیات، کی مخالفت جب کرتے ہیں تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ مذہب کی عملی صورتیں جو کبھی دورِ اول میں تھیں، بعینہٖ باقی نہ رہیں، مابعد الطبعیات تقلید پرستی کی ذیل میں چلی گئی اور تیسرے دور کے صاحبانِ معرفت وعرفان اب ناپید ہوگئے۔ اقبال کو اب سامنا تھا تو مذہب کے مقابلے میں بڑی سرعت کے ساتھ ارتقاپذیر جدید مغربی علوم کا۔ یہ علوم چونکہ اپنی بنیادی، ثانوی اور اعلیٰ سطح پر مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور نہ ہی اسے موضوع بناتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اقبال ان کی خوبیوں کے اعتراف کے باوجود، ان کی مذہبی بنیاد نہ ہونے کے باعث، انھیں ایمان کی بربادی کا سبب سمجھ بیٹھے۔

> عہدِ حاضر کے تنقیدی فلسفوں اور علومِ طبیعیہ میں اختصاص نے انسان کی جو حالت کررکھی ہے بڑی ناگفتہ بہ ہے۔ اس کے فلسفۂ فطرت نے تو بے شک اسے یہ صلاحیت بخشی کہ قوائے فطرت کی تسخیر کرلے اگر مستقبل میں اس کے ایمان اور اعتماد کی دولت چھین کر۔ (288)

اس بات کو تو ول ڈیورانٹ نے بھی اپنی کتاب Renaissance میں تسلیم کیا ہے کہ کائنات میں انسانی ترقی کے لیے عقائد اور ایمان کی قربانی کے سوا چارہ نہیں ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ عقائد کی وہ کون سی صورتیں اور ایمان کی وہ کون سی حالتیں اور تصورات ہیں کہ جن کو ترک کیے بغیر انسانی بقا کو

درپیش مسائل سے نبرد آزما ہونا ممکن نہیں ہے؟ پھر یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا واقعی ایسا ہوا ہے کہ علومِ جدید اور ان کی تحصیل نے مذہب یا عقائد کی جگہ لے لی ہے؟ کیا واقعی مذہب یا ایمان کو ان سے کوئی خطرہ لاحق ہے؟ اقبال جب اِن باتوں کا جواب ہاں میں دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال جس رجعت کی طرف میلان رکھتے ہیں اس میں وہ ایسی گنجائش بھی محسوس کرتے ہیں کہ انسانیت کے وہ تمام جملہ مسائل کہ جن کے حل کی تدبیر جدید علوم کر رہے ہیں، مذہب ان کا حل پیش کر سکتا ہے، لیکن کیا مذہب کے موضوعات میں ان علوم کے تخصیصی مطالعے شامل ہیں؟

اقبال نے مذہب اور جدید علوم میں تفریق کے حوالے سے ایک خود ساختہ اور بلا جواز نظریہ گھڑ رکھا ہے۔ ان کے نزدیک جدید علوم و فنون ضمیر، روح اور باطن کے دشمن ہیں اور مذہب انھیں زندہ رکھتا ہے:

> حاصلِ کلام یہ ہے کہ عصرِ حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کے زیرِ اثر انسان کی روح مُردہ ہو چکی ہے یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھیے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے، سیاسی اعتبار سے نظر ڈالیے تو افراد افراد سے۔ اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابلِ تسکین جوعِ زر پر قابو حاصل کر سکے۔ یہ باتیں ہیں جن کے زیرِ اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب کے لیے اس کی جدوجہد بتدریج ختم ہو رہی ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ درحقیقت زندگی ہی سے اکتا چکا ہے۔ اِس کی نظر حقائق پر ہے یعنی حواس کے اُس سرچشمے پر جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہے، لہٰذا اس کا تعلق اپنے اعماقِ وجود سے منقطع ہو چکا ہے۔ (289)

اس اقتباس میں اٹھائے گئے پہلے مسئلے کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ انسانی روح کی تسکین سے مراد عموماً قلبی تشفی اور آسودگی لی جاتی ہے۔ اس حوالے سے مذہب اطمینانِ قلب کا بہترین وسیلہ ہے لیکن انسانی و دنیاوی معاملات میں زندگی کی تہہ در تہہ حقیقتوں، معروضی سچائیوں اور بندھنوں کی موجودگی میں کچھ اور بھی درکار رہتا ہے کہ جس کا تعلق انسانی خدمات کے دیگر عملی شعبوں کے ساتھ براہِ راست ہوتا ہے۔ مادی علوم کی جملہ انسانی خدمات کو اگر انسانی ارتقا کی تاریخ سے نکال باہر کر دیا جائے تو حیاتِ اجتماعی ہمیں ایک خوفناک بحران کا شکار دکھائی دے گی۔ کائنات کے متوازی انسانی تمدن کی تشکیل

Scanned with CamScanner

میں ان علوم نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اس تمدن میں بے پناہ مسائل اور پریشانیاں موجود رہی ہیں اور اب بھی ہیں، لیکن ان مسائل کا خاتمہ بھی مادی علوم ہی کی بنیاد پر کیا جا رہا ہے۔ اس میں ناکامیوں کی اگر کوئی تاریخ موجود ہے تو کامیابیوں کی بھی ایک طویل تاریخ موجود ہے۔ حیات و کائنات کے سربستہ رازوں سے آگاہی کا واحد، موثر اور قابل فہم وسیلہ یہی مادی علوم ہیں۔ یہ علوم انسانی ریکارڈ یا دستاویزات کی صورت میں موجود رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مزید تحقیق ان میں موجود خامیوں اور نتائج کی خاص سطحوں کو موجودہ اور آئندہ نسلیں مسلسل نئے نئے زاویوں سے دیکھتی اور پرکھتی رہتی ہیں۔ یہ علوم چونکہ حیات و کائنات سے متعلق اٹھنے والے سوالات کے جوابات فراہم کرنے میں عملی سطح پر معاونت کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مذکورہ علوم انسانی قلب و ذہن کو آسودہ حال بھی بناتے ہیں، وگرنہ یہ سوالات قلبِ انسانی پر مسلسل تازیانے برساتے رہتے۔

مذکورہ اقتباس کے دوسرے اہم مسئلے کی طرف رجوع کرنے سے قبل یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ مادی علوم قطعیت کے دعویدار نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ ان علوم سے متعلق نظریاتی تصادم حقائق کی مختلف جہتوں کو ابھارنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک سیاسی اعتبار سے ان علوم پر دسترس کے باعث انسانوں میں تصادم رونما ہوا۔ لیکن اس بنیاد پر علوم کی مخالفت نہیں کی جا سکتی۔ ہوسِ زر میں مبتلا کسی قوم کی سیاسی و معاشی ترجیحات کیا ہیں؟ ان کا تعین سائنس بطور ایک علم کے ہرگز نہیں کرتی۔ مذکورہ مادی علوم پورے عالم انسان کے لیے یکساں معیارات اور طریقہ ہائے کار رکھتے ہیں۔ سیاسی اور معاشی مسابقت کا ان علوم کی عالمی سطح پر ارتقا پذیر مبادیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو اقوام یا افراد اقبال کے نزدیک زندگی سے اکتا چکے ہیں، انھیں عصرِ حاضر کی تاریخ یہ درس دے رہی ہے کہ وہ ان علوم پر دسترس کو اپنے سماجی نظام میں زیادہ سے زیادہ موثر اور قابلِ عمل بنائیں۔ یہ علوم ذرائع پیداوار کی نئی نئی صورتوں کو ضرور ابھارتے ہیں لیکن انھیں قومی تقاضوں کے ہم آہنگ بنانا مذکورہ علوم کی بجائے خود اقوام کی سیاسی و سماجی ذمہ داری ہے۔

مذکورہ اقتباس کے حوالے سے تیسری بات یہ ہے کہ کسی بھی نوع کے سائنسی منہاج کو ہم اعماقِ وجود کی کسی تحریک سے جدا کیسے کر سکتے ہیں؟ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اقبال کے زاویۂ نگاہ سے تو اسے اس پر اکتفا کر لینا چاہیے، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ سامنے کے حقائق وجود کی بند کھڑکیوں کو کھولنے کی تحریک

Scanned with CamScanner

پیدا کر دیتے ہیں، وجود اپنی گہرائیوں میں ان حقائق سے آگاہی کی شدید خواہش بھی رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وجود اپنی اس خاص حالت اور کیفیت کے باعث اپنی تشفی کے لیے کسی مادی سرگرمی کو عمل میں لاتا ہے اور پھر اسی عمل کے باعث کسی حقیقت کی نفی یا اثبات پر قدرت حاصل کرتا ہے۔ یوں وجود کائنات میں موجود کسی کائناتی حقیقت کو اپنی مادی سرگرمی کے بموجب اپنا خاص زاویہ عطا کرتا ہے؛ یہ وجود کی اپنی تلاش کردہ حقیقت ہوتی ہے۔ وجود ہی مادی حقائق پر تدبر کرتا ہے، یہ تدبر امکانات کی نئی دنیاؤں پر نگاہ بھی رکھتا ہے، پس یہ سطحی بھی نہیں رہتا۔ کسی صوفی کی روحانی واردات سے اس کا معاملہ بالکل الگ تھلگ ہے۔ اس کی اپنی معنویت، اپنا جواز اور اپنی افادیت ہے۔

اقبال یہ سمجھتے ہیں کہ علومِ جدید کی ترویج کے باعث ساری دنیا کو بے پناہ مسائل کا سامنا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اقبال یہ قرار دیتے ہیں کہ ان علوم نے چونکہ مذہب کی جگہ اپنی خاص راجدھانی قائم کر لی ہے، اور چونکہ انسان نے انھی علوم میں اپنی زندگی کے مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے، یہی وجہ ہے کہ روحانی طاقت کے مخفی سرچشمے منظرِ عام پر نہ آنے کے باعث انسان کا باطن مردہ ہو چکا ہے۔ وہ عالمی انسانی تمدن کو بے حس سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جمہوریت پسند وطنیت اور لادین اشتراکیت نے نفرت، بدگمانی اور غم و غصے پر اکسایا ہے۔ لیکن اقبال نے ان تمام امور کے حوالے سے سرمایہ داری نظام کے تحت ابھرنے والے نوآبادیاتی عہد کی سیاسی وجوہات اور اُن کے عالمی سطح پر پیدا ہونے والے اثرات سے بحث نہیں کی۔ اگر وہ اس جانب رجوع کرتے تو یقیناً وہ اس بارے میں کوئی سیاسی نظریہ پیش کرتے، لیکن انھوں نے علومِ جدیدہ اور جدید عالمی سیاسی رجحانات کے تناظر کو محض مذہب سے دوری کے نتائج کے طور پر پیش کر دیا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مقام پر بھی اقبال نے مذہب کے حوالے سے تصوف ہی کو مذہب کا مترادف قرار دیتے ہوئے طبیعیات کی سطح سے آگے اور عقل و خرد کی گرفت سے باہر صوفیانہ واردات کے امکانات کو مسائل کا حل قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> مانا کہ اس قسم کے مشاہدات یعنی مذہبی احوال و واردات کی صورت میں ابتداً عضوی طور پر کچھ اختلال رونما ہو جاتا ہے لیکن اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ (294)

آگے چل کر سائنسی منہاج کی دشواریوں کے مقابلے میں صاحبِ مشاہدہ صوفیا کے اندازِ تفکر پر روشنی

Scanned with CamScanner

یوں ڈالی ہے:

گویا بشریات کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ہم انسانوں کے نظمِ اجتماعی کا تعلق ہے، مقہوسین [علم نفسیات کی رو سے ذہنی امراض میں مبتلا افراد] کی بدولت وقت کی بڑی کفایت ہوتی ہے۔ وہ حقائق کی صف بندی یا ان کے اسباب وعلل کی تحقیق نہیں کرتے۔ ان کی نگاہیں زندگی اور حرکت پر ہوتی ہیں، کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ انسانی سیرت و کردار نئے نئے سانچوں میں ڈھال دیں۔ (395)

اس حوالے سے اقبال اپنے جہانِ امکان کو مزید وسعت دیتے ہوئے ایک جگہ مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ممکن ہے نفسیات جن افراد کو بظاہر دماغی مریض [مقہوس/ Psychopath] تصور کرتی ہے اُن میں فی الواقع کوئی ایسی ہستی بھی نکل آئے جسے عقل و فکر سے غیر معمولی بہرہ ملا ہو اور جو اس قسم کا کوئی طریق وضع کر سکے (سائنسی منہاج کے برعکس)۔ ہمارے نزدیک یہ امتزاج غیر ممکن نہیں۔ (301)

اقبال کے نزدیک ہم لوگ اس قسم کے مشاہدات اور تجربات سے محروم ہیں، ہمیں چاہیے کہ ہم بھی کسی ایسے منہاج کی تحقیق کریں۔ ان کے نزدیک یہ بھی خارجی حقائق کے ادراک کی اپنے مقاصد کے اعتبار سے اعلیٰ ترین شکل ہے۔ چنانچہ یونگ کو انھوں نے اس حوالے سے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کے خیال میں عہدِ حاضر کا انسان ابھی تک یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ اس کا منشا و مدعا فی الحقیقت کیا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کے لگ بھگ سے لے کر اقبال کے عہد تک کی جدید تاریخ میں انسان نے اپنے تجربات، مشاہدات سماجی و سائنسی علوم، ٹیکنالوجی، فنونِ لطیفہ، ادب، فلسفے اور زندگی کے تمام شعبوں میں جو انقلابات برپا کیے ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ اقبال نے انھیں بے مقصد اور بے توقیر سمجھا ہے۔ مذہبی یا صوفیانہ منہاج ہی اگر عالم انسان کے دکھوں کا واحد مداوا ہوتا تو ان انقلابات کے حصول کے لیے کروڑ ہا نابغہ دماغوں اور ان کے ہنر مند ہاتھوں کی حاجت ہی نہ رہتی؛ لٰہذا ہم یہ بات بڑے وثوق اور اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کو محض تصورات سے دلچسپی ہے۔ وہ تصور جو کسی مادی سرگرمی میں ظہور پذیر ہوتا ہے لامحالہ انسانی تمدن کا حصہ بن جاتا ہے اور حیاتِ اجتماعی کے حوالے سے اپنے

مقاصد کے پیشِ نظر تہذیب کو معیارات بھی فراہم کرتا ہے۔ اس کے برعکس تصورِ محض فرد کی ذہنی کیفیت یا حالت کو تو کچھ وقت کے لیے بدل سکتا ہے لیکن حیات و کائنات کے معروضی حقائق کی دنیا کو تبدیل کر دینا اس کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ مادی، سائنسی یا عملی منہاج ہی تبدیلی کا واحد اور کڑا معیار ہے۔ انسانی تاریخ ہزارہا سالوں سے ارتقاپذیر ہے تو اسی معیار کے تابع ہے۔ صوفیانہ واردات میٹھے کی ہو یا شیخ احمد سرہندی کی، وہ اس معیار اور طریقۂ کار سے بالکل الگ ہے، لہٰذا مقاصد کے اعتبار سے ان دونوں کے نتائج کو ہم آہنگ سمجھنا اقبال کا دوسرا مغالطہ ہے۔ صوفی کی درگاہ اور تجربہ گاہ میں جو فرق ہے وہی فرق سائنس اور صوفیانہ مسلک میں بھی ہے۔ 'انسان کی بھلائی' کا دعویٰ تو دونوں کے ہاں ہے لیکن ایک کے ہاں تصور کی سطح پر ہے جبکہ دوسرے کے ہاں حقیقت کی۔ ایک اپنی ذات کی پہنائیوں کا تماشائی بنا رہتا ہے اور دوسرا مادی سرگرمی کو تمدن کا حصہ بنا دیتا ہے۔

اس خطبے میں اقبال نے مذہب کے امکان کو تصوف کے دائرے میں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ انھیں خود بھی اس بات کا ادراک تھا کہ تصوف کی روایت عصرِ حاضر تک آتے آتے اپنی بنیادوں میں بہت کمزور ہو چکی تھی اور علم تصوف عہدِ جدید کے سوالوں کے جوابات دینے سے قاصر ہو چکا تھا۔ نتیجتاً اس کے طریقۂ کار کی جگہ مکمل طور پر جدید علوم اور ان کی عملی جہتیں لے چکی تھیں۔ سائنسی منہاج کی ترویج و ترقی نے عالمی سطح پر جو تہذیبی تبدیلیاں پیدا کیں ان کے پیشِ نظر صوفیانہ منہاج کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا؛ تاہم اب بھی جہاں کہیں پسماندہ معاشرت کی باقیات موجود ہیں سائنسی منہاج وہاں کمزور ہے۔

''کیا مذہب کا امکان ہے؟'' کے سوال کے تحت جہاں تک مذہبِ اسلام کا تعلق ہے تو مذہب اپنے معروف معنوں میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے حوالے سے واضح اور قابلِ عمل تعلیمات کے باعث آج بھی مسلمانوں کی پہلی اور لازمی ترجیح ہے۔ دیگر مذاہب کی صورت کوئی بھی رہی ہو، لیکن اسلام مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، معاشی، مادی اور تمدنی ترقی میں کبھی حارج نہیں ہوا بلکہ اس کی تعلیمات تو، دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیتے ہوئے، دنیا میں انسان کو خیر اور بھلائی کے کاموں اور کائنات پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ اس مذہب کی اس دعوت سے انکار زندگی سے انکار ہے۔ افسوس، اقبال نے اِس دعوت کے عالمگیر پیغام کو صوفی کی انفرادی واردات میں گم کر دیا۔

Scanned with CamScanner

خطباتِ اقبال میں پیش کیے گئے تصورات کی تشکیل جدید کے لیے اقبال نے جدید سائنسی علوم کو اساس بنانے کی بجائے، ان کے طریقۂ کار یا منہاج کے برعکس یا متوازی، باطنی علم کی صوفیانہ واردات کو حالاتِ حاضرہ کے مسائل اور طبائع کے پیشِ نظر ایک نیا منہاج دینے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ یہ خواہش یقیناً تمام خطبات میں موجود ہے، تاہم اس کا طریقۂ کار وضع کرنے میں اقبال اپنے آپ کو بڑی حد تک بے دست و پا محسوس کرتے ہیں۔ یہاں اقبال نے جن صوفیا کے حوالے اور احوال بیان کیے ہیں، ان کے باعث موضوع پر موثر گرفت کی بجائے خود اقبال کے لیے مزید مسائل پیدا ہوے ہیں اور خود اقبال نے کئی مواقع پر اس حوالے سے وضاحت کرنے سے اپنے آپ کو معذور بیان کیا ہے۔ مذہب کی ظاہری تعلیمات کہ جن کا تعلق انسانی زندگی کے معاملات سے ہے اور جن کے باعث معاشرہ اجتماعی سطح پر نتائج منظر عام پر لاسکتا ہے، اقبال نے ان پر بحث کرنے کی بجائے صوفیانہ واردات یا احوال کے ذریعے کسی منہاج کے انکشاف پر زور دیا ہے۔ پس جب تک کسی صاحب مشاہدات سے ایسا کوئی طریقہ منکشف نہیں ہو جاتا، اقبال کی تشکیل جدید کی خواہش بھی اس کی کوئی عملی صورت سامنے نہیں لاسکتی۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو اقبال نے تشکیل جدید کی اصطلاح کو بغیر کسی موثر جواز کے پیش کر دیا ہے؛ اقبال نے تصوف کی قدامت پسند روایت سے رجوع کیا ہے اور اپنی نظریاتی تفہیم میں، جدید مادی علوم کی ہمہ جہتی کو رد کرتے ہوے، خودی کی باطنی دریافتوں پر اپنے یقینِ کامل کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے اپنے خطبات میں مذہب کی قدامت پسند روایت ہی کی جدید زبان میں وکالت کو تشکیل جدید کا نام دے دیا۔ انسانی تمدن میں فکری اعتبار سے تشکیل جدید کا بنیادی سرچشمہ جدید سائنسی اور عمرانی علوم ہیں، جس کا اثبات عالم انسان کی ان علوم میں، بغیر کسی نسلی، گروہی، جنسی، علاقائی یا مذہبی امتیاز کے، ترویج و ترقی کے اقدامات ہیں۔

❁❁

Scanned with CamScanner

صائمہ ارم

لبِ گور

نچلے اور نچلے متوسط طبقے کی معدوم ہوتی لکیر پہ بسے اس محلے کے باسیوں میں صبح سویرے ہی ہاہا کار مچ گئی۔ محلے کی عورتیں ایک دوسری کو یہ خبر سنانے کے لیے اتنی بے صبر ہو رہی تھیں کہ اپنے مردوں کی گھروں سے رخصتی کا انتظار کرنے کی روادار بھی نہیں تھیں۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ رات بھر کے باسی بستر لپیٹے بغیر، اور ٹھنڈا چولھا چھوڑ، تھڑے پر جا پہنچے۔ شاید اسی لیے آج اچھو پہلوان کی دکان پر رش بھی بڑھ گیا تھا۔ دودھ دہی کی دکان پر روزانہ کے خریدار اور لسی پیڑے کے ساتھ نان کلچے کے شوقین چٹورے بڑے بڑے لقمے لیتے، زوردار ڈکار مارتے، ڈھیلی قمیض کو پیٹ کے گھیر پر پھیلا کر جسم کو اِدھر اُدھر سے کھجاتے اور ہر پھر کر وہی بات کرتے چلے جاتے تھے۔ دکان کے باہر سڑک پر رکھی میل بھرے نقش و نگار والی پلاسٹک کی کرسیاں بھرتی جا رہی تھیں۔ جو ایک مرتبہ دکان پر آیا، واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ دھندے کا یہ رخ دیکھ کر اچھو نے گھر سے موڑھے اور پھر پیڑھے بھی منگوا لیے تھے۔ چھوٹا بلا بھاگ بھاگ کر لسی، نان، چھولے ہر ایک تک پہنچا رہا تھا۔ آج وہ بھی زیادہ مستعد تھا۔ بکری زیادہ ہوتی تو اسے کمیشن زیادہ ملتا۔ سینما میں کترینہ کی نئی فلم لگی تھی۔ اس کے بیلی کب کے یہ فلم دیکھ آئے تھے اور روز اس کو فلم کے منظر سنا سنا کر جلاتے تھے۔ کتنے دنوں سے وہ چاہتا تھا کہ سینما دیکھ آئے، پر ابّے کو اس کی روزانہ آمدنی کا خوب حساب رہتا تھا—پائی پائی وصول کر لیتا۔ ''آج کی کمائی تو میں غائب کر لوں گا۔'' بلا جی جان سے گاہکوں کی خدمت میں مگن تھا۔

اکبر بھی آیا تو اس نیت کے ساتھ تھا کہ صرف پائے لے کر واپس چلا جائے گا، گھر میں رات

کے بچے اُبلے چاول رکھے تھے، ناشتے کے کچھ پیسے بچ جاتے۔ پائے کا سالن اور اُبلے چاول یوں بھی اسے پسند تھے، حالانکہ اس کی ماں اکثر کہا کرتی تھی: ''صبح صبح چاول نہ کھایا کر۔ پیٹ میں درد ہوگا۔'' لیکن جب بھی رات کو چاول ابالے جاتے، وہ صبح پائے کا سالن ضرور خریدتا۔ اماں کو مرے تو عرصہ ہوگیا تھا۔ مرنے سے پہلے اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا تھا۔ ڈاکٹر کہتا تھا کہ وقت پر آپریشن ہو جاتا تو شاید اماں بچ جاتی۔ پر اماں کو بھی پتا تھا کہ اس کا سو روپے روز کی ہوائی روزی کمانے والا پتر آپریشن کہاں کراتا پھرے گا۔ ایک روز اس نے اکبر کے کام پر جانے کا انتظار کیا اور جب وہ واپس آیا تو پتا چلا کہ اماں پیٹ کے درد سے مرگئی۔ ''اماں تو صبح صبح چاول نہیں کھاتی تھی، پھر وہ کیسے مر گئی؟'' ان دنوں وہ اکثر ایسا ہی سوچا کرتا تھا۔ مائیں تو سب پتروں سے پیار کرتی ہی ہیں۔ اس کی ماں کو بھی اس سے بہت پیار تھا۔ پہلوٹھی کا لڑکا تھا، اور پھر خوبصورت بھی۔ اماں کے بہت ارمان تھے۔ اسے بابو دیکھنا چاہتی تھی، من چاہی بہولانا چاہتی تھی۔ بابو تو وہ اسے نہ بنا سکی — غریب کا لڑکا، پڑھتا بھی تو کتنا پڑھتا، اور کہاں پڑھتا۔

گھر کے قریب کارپوریشن کے سکول میں، جس کی سرخ چونا بھری اینٹوں کی عمارت نے اسے لال سکول کا مقبول عام نام دے دیا تھا، بڑے چاؤ سے داخل کرایا گیا تھا۔ سکول میں لہک لہک کر الف مدآ، اور اے فار ایپل، بی فار بیٹ پڑھتے ہوئے تو اسے دقت نہیں ہوئی۔ مسئلہ تو تب شروع ہوا جب اس کے ماسٹر نے اسے آدھی چھٹی کے وقت اپنی ٹانگیں دبانے کو کہا۔ نیم تاریک کمرے میں، کھجور کے پتوں سے بنی چٹائی پر اوندھے لیٹے ہوئے، ماسٹر نے اسے اپنی رانوں پر چڑھ جانے کو کہا تھا۔ ''چل وے کاکا، ذرا دو ٹانگوں پہ چڑھ جا۔ ہولے ہولے چتڑوں تک آ، اور پھر پیر کی تلی تک واپس جا۔'' ماسٹر کی موٹی موٹی ٹانگیں اس کے ننھے ننھے پیروں تلے ذرا سا دب جاتیں۔ اس کے قدم جمانے کو وہاں بڑی جگہ تھی۔ آدھ گھنٹے کے بعد ماسٹر نے اسے آٹھ آنے دیے اور شاباشی دے کے رخصت کر دیا۔ وہ کمرے سے نکلا تو ذرا سی دیر کو اس کی آنکھیں برآمدے کی تیز روشنی میں چندھیا سی گئیں، اور اس سے پہلے کہ اسے کچھ ٹھیک سے نظر آتا، کسی نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی زمین پر جا گرا تھا۔ ''حرامی، کنجر، اب فسٹ بھی آئے گا!'' دو تین لڑکے اسے ٹھڈے مار رہے تھے اور وہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔ ''کون ہے؟ کون ہے حرامی، اپنی ماں کا یار؟'' ماسٹر کی دھاڑ بلند

ہونے میں شاید دو تین منٹ لگے ہوں گے لیکن اتنی دیر میں وہ لڑکے اسے مار پیٹ کر بھاگ چکے تھے۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اور یونیفارم کی قمیص پھٹ گئی تھی۔ آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے کچے برآمدے کی مٹی کے ساتھ مل کر اس کے چہرے پر گہری لکیریں کھینچ دی تھیں اور وہ ایک دم اپنی عمر سے کئی برس بڑا لگنے لگا تھا۔ ماسٹر نے اس کی طرف دیکھا تو ایک ٹھنڈا سا سایہ سا اس کے چہرے پر آیا۔ ”چل تیرا منھ دھلا دوں۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور صحن میں لگے نل کی طرف چلا کہ اکبر نے ایک زوردار چیخ ماری اور اپنا ہاتھ چھڑا، گھر کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ ماسٹر کی دی ہوئی اٹھنی بھی وہیں کہیں گر گئی تھی۔ بعد میں بڑی پوچھ پرتیت ہوئی، ابا بھی سکول گیا، ماسٹر نے بھی ان لڑکوں کا پتا چلا لیا اور ابے کے سامنے ان کو ننگا کر کے، الٹا لٹا کر، پانچ پانچ چھتر بھی لگائے۔ اماں نے بھی بہت دلار کیا، سکول جانے کے لیے طرح طرح کے لالچ دیے۔ اس کی پسندیدہ مٹھائی منگوائی — حالانکہ پہلے دن جب وہ مار کھا کے گھر گیا تھا تو سب سے پہلے اماں نے ہی کہا تھا کہ اب وہ اسے سکول نہیں بھیجے گی — پر وہ دوبارہ سکول نہ گیا سو نہ گیا۔

کئی مہینے اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد اماں نے اپنی ایک سہیلی کے مشورے پر اسے دو گلی چھوڑ کر ایک ٹیوشن سینٹر میں ڈال دیا، جہاں کی استانی روز اسے سبق بھی دیتی تھی اور سارا سودا بھی اسی سے منگواتی تھی۔ اکبر کو یہ انتظام پسند تھا۔ استانی سبق یاد نہ کرنے پر مارتی بھی نہیں تھی اور اکثر تو اسے یاد ہی نہ رہتا کہ سبق تھا کیا۔ ایسے موقعوں پر اکبر اسے وہی سنا دیتا جو اسے یاد ہوتا اور شاباشی بھی وصول کر لیتا۔ باہر دکانوں پر جانا اور رنگ رنگ کا سودا لانا بھی اسے پسند تھا۔ اب تو استانی عورتوں والی خاص چیزیں بھی اسی سے منگوانے لگی تھی — نیچے کے کپڑے، اور بال اڑانے کا پاؤڈر۔ اماں کو پیسے تو سکول سے دگنے دینے پڑتے، پر اکبر کو روز بستہ اٹھا کر خوشی خوشی استانی کے گھر جاتا دیکھتی تو اس کی کمر میں ایک سیدھا پن پیدا ہو جاتا۔ پورے محلے میں وہ استانی کی تعریفیں کرتی پھرتی تھی جس نے اس کے سکول سے بھاگے لڑکے کو پھر پڑھائی پر لگا لیا تھا۔ گھر میں جب کوئی سوغات بنتی، یعنی جب کبھی پاس کے کھیتوں سے تازہ ساگ چن کے لایا جاتا، درانتی سے کتر کر سارا دن لکڑیوں کے چولھے پر رکھی مٹی کی ہانڈی میں، نمک مرچ اور باتھو ڈال کر پکایا جاتا، اور پھر اماں کے مضبوط ہاتھ آدھی رات تک اسے گھوٹتے رہتے یہاں تک کہ وہ ریشم کی طرح ملائم ہو جائے، تو اگلی صبح اماں مہینے بھر دودھ سے اتار کر

جمع کی ہوئی بالائی کا دہی بناتی اور اسے بلو کر مکھن نکالتی، اور ساگ کو خالص مکھن کا تڑکا لگا، پیالہ بھر استانی کو ضرور بھیجتی۔ ایسا ہی اگر چلتا رہتا تو اکبر ضرور پڑھ لکھ کر بابو بن جاتا، جیسا اس کی ماں چاہتی تھی، اور روز صبح صاف ستھرے کلف لگے کپڑے پہن کر دفتر جایا کرتا، لیکن ایک دن ابا کسی کلف والے کی گاڑی کے نیچے آ کر مر گیا۔ ابے کی میت ہسپتال سے گھر آئی تو محلے والوں نے ایمبولینس کے سامنے اکٹھے ہو کر بڑے نعرے لگائے۔ بڑا تھانیدار خود میت کے ساتھ آیا تھا اور جنازے تک ساتھ گیا تھا۔ اس نے تو پہلے دن کی روٹی بھی دینا چاہی پر نانے نے اسے روک دیا۔ جمائی کے مرنے پر پہلی روٹی میکے والوں کی ہوتی ہے۔ نانے نے اپنی لاج بھی تو رکھنی تھی۔

تیجے پر تھانیدار پھر آیا اور بڑی دیر تک بڑے ماے اور چھوٹے چاچے سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد چھوٹے چاچے نے اماں کو بتایا: ''ابے کی سائیکل کی بریک خراب تھی اور وہ بغیر کوئی اشارہ دیے اچانک دائیں طرف مڑ گیا تھا اور اس کی سائیکل پر بتی بھی نہیں تھی۔ اب اس حادثے میں صاحب کا کیا قصور۔ انھوں نے تو ہارن بھی بجایا اور بریک بھی لگائی۔ ابے کی آ گئی تھی۔ اللہ کی کرنی میں کسی کا کیا دخل! صاحب بیچارے کو تو خود بہت افسوس ہے، اسی لیے تو اس نے اپنا ہرجانہ نہیں مانگا۔ اس کی گاڑی پر یہ بڑا ڈینٹ پڑ گیا اور سامنے کی بتی بھی ٹوٹ گئی۔ اچانک بریک لگانے سے اس کی گاڑی کے ٹائر بھی رگڑ کھا گئے ہیں۔ وہ بھی نئے لینے ہوں گے۔ کچھ بھی تو نہیں مانگا، اوپر سے راشن کا ذمہ بھی لے لیا ہے—— تیری پوری عدت تک۔'' اماں ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہی، اور پھر گھر میں چار مہینے کا راشن اور چھوٹے چاچے کی بیٹھک کے سامنے نئی موٹر سائیکل آ گئی۔

اماں کی عدت پوری ہونے تک بڑے ماے نے بھی اپنے گھر کی چھت مرمت کرا لی تھی، اور اماں سے کہا تھا کہ وہ بچوں کو لے کر نانے کے گھر آ جائے، پر اماں نے انکار کر دیا۔ اکبر کی اٹھتی جوانی کو دیکھ کر اسے سہارا ہوتا تھا۔ پر اس کے پیچھے کی چھ اولادوں نے بالآخر اس سے استانی کا گھر چھڑوا دیا۔ ملازمت اسے ملتی نہ تھی اور مزدوری اس کے بس کی نہیں تھی۔ کئی مہینے دفتروں کے دھکے کھانے کے بعد پہلی مرتبہ اس نے مزدوری کی۔ اینٹیں ڈھو ڈھو کر اس کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اور پورے بدن کے پٹھے اکڑ کر انھی اینٹوں کی طرح سخت ہو گئے تھے۔ ٹھیکیدار سے مزدوری کے پیسے لینے کے بعد جب وہ ادھ بنے نیم تاریک کمرے میں لگے نل پر منہ دھونے آیا تو اس نے نل کے ساتھ

لگے لوہے کے پائپ پر ٹنگے، چٹخے ہوئے شیشے کے ٹکڑے میں اپنی شکل دیکھی—چہرے پر مٹی، اور پسینہ بہنے سے بنی ہوئی لکیریں۔ اس نے زور سے چیخ ماری اور روتا ہوا گھر کی طرف بھاگ اٹھا۔ مزدوری کے پیسے بھی وہیں کہیں گر گئے تھے۔

اس دن کے بعد سے کبھی اس نے مزدوری نہیں کی۔ اماں کی وجہ سے اس کے ایک محلے دار نے اسے اپنی دکان کے سامنے پھلوں کی ریڑھی لگانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ صبح صبح منڈی سے سوہنے اور تازہ پھل لے کر آتا، انھیں قرینے سے اپنی ریڑھی پر سجاتا اور دکان کے سامنے، ترپال کے سائے تلے، ریڑھی لگا لیتا۔ سارا دن پھل بیچتا اور منہ دھوتا رہتا تھا۔ وہ کمانے لگا تو اماں کو اپنی دوسری خواہش یاد آئی۔ چاچے کی روزی جوان ہو گئی تھی۔ بڑی سوہنی بھی تھی۔ گورا رنگ، بھورے لمبے بال، پتلی کمر، بارہ جماعتیں بھی پاس تھی۔ اماں نے اس کا رشتہ پکا کر دیا۔ روزی گھر آئی تو اکبر کو مولوی صاحب کی باتیں سچ لگنے لگی تھیں۔ وہ جنت کی باتیں کرتے تھے۔ حوریں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔ اکبر کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ نمازیں پڑھے، پر ہر روز صبح صبح، فجر سے بھی پہلے، جب اس کا بدن اسے جگا دیتا تو وہ ساتھ سوئی روزی کے پنڈے پر ہاتھ پھیرتا۔ اس کا لمس پا کر روزی کی آنکھ بھی کھل جاتی اور وہ ایک ان کہے منصوبے کے تحت اٹھ کر بیٹھک کی طرف بڑھ جاتے، کہ ایک کمرے کے گھر میں اکثر کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ سویا ہی ہوتا تھا، صرف بیٹھک کے نام پر بنا کمرہ ان کی خلوت کا رازداں ہو سکتا تھا۔ اس کی فجر روز قضا ہو جاتی اور وہ روز سوچتا کہ جب فجر ہی نہیں پڑھی تو باقی نمازیں پڑھنے کا کیا فائدہ۔ اور جب اماں نے بیٹھک کو اس کا کمرہ بنا دیا تو جنت کے دروازے یوں بھی اس پر کھل گئے تھے۔ پر زیادہ دیر تک کھلے نہ رہ سکے تھے۔ بڑے لڑکے کی پیدائش پر بہت خوشی منائی گئی، اماں نے کئی بار نظر اتاری۔ پھر جوڑی ملانے کی خواہش ہوئی تو اوپر تلے تین لڑکیاں پیدا ہو گئیں۔ اماں کی خوشی بھی ماند پڑ گئی تھی اور خرچہ بھی بڑھ گیا تھا۔ اس نے رات دیر تک پھل بیچنے شروع کیے پر پورا نہیں پڑتا تھا۔ پھر ایک روز فجر سے پہلے جب اس نے روزی کے پنڈے پر ہاتھ پھیرا تو اسے پتا چلا کہ وہ ہولے ہولے سسک رہی ہے۔ وہ بے چین ہو گیا تھا اور اگلے ہفتے ہی اس نے ادھار لے کر اور اماں سے جھگڑا کر کے روزی کو ٹائپنگ کے سکول میں داخل کرا دیا۔ چھ مہینے کے اندر اندر روزی نے ٹائپنگ بھی سیکھ لی اور اسے نوکری بھی مل گئی۔ بچے پہلے بھی اماں کے پاس رہتے تھے اور اب بھی اماں ہی

Scanned with CamScanner

انھیں سنبھالتی تھی۔

روزی خوش رہنے لگی تھی۔ روز نہا دُھ کے تیار ہوتی تو اور بھی اچھی لگتی۔ اسے اپنے فیصلے پر غرور سا ہوتا۔ پھر ایک رات روزی کو اکبر سے بھی زیادہ دیر ہوگئی۔ وہ واپس آئی تو کسی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے مہینے بھر کی تنخواہ کے برابر پیسے اکبر کی ہتھیلی پر رکھ دیے تھے۔ ''آج کام زیادہ تھا۔ اوور ٹائم لگایا ہے۔'' اکبر چپ کا چپ رہ گیا اور اسے چپ دیکھ کر اماں بھی خاموش ہوگئی تھیں۔ اماں کی یہ خاموشی اس وقت بھی نہ ٹوٹی جب روزی ہر روز دیر سے آنے لگی۔ پھر ایک دن فجر سے پہلے جب اکبر نے اس کے پنڈے پر ہاتھ پھیرنا چاہا تو روزی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ حیرت سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا، اور بہت دن تک اسے یاد رہا کہ روزی نے کہا تھا: ''تمھارے بدن سے سڑے پھلوں کی بدبو آتی ہے۔'' پہلے تو وہ دن میں کئی بار صرف منھ دھوتا تھا، اب کئی بار نہانے بھی لگا، پر سڑے پھلوں کی بدبو نے اس کا بدن نہ چھوڑا۔ ہاں روزی اسے چھوڑ گئی — اسے بھی، بچوں کو بھی اور چاچے کو بھی۔

اماں کی موت کے بعد سے آج کی خبر سننے تک اسے لگتا تھا کہ اب اسے کبھی حیرت ہوگی نہ افسوس، پر ایسی خبر تو زندگی بھر کسی نے سنی نہ ہوگی۔ ''توبہ توبہ، کیسا زمانہ آگیا!'' بے اختیار اکبر بھی وہیں بیٹھ گیا تھا۔

''لو! اللہ معاف کرے۔ ہر بندے کو اپنی اخیر یاد رکھنی چاہیے۔ جیدے نے تو حد ہی کردی۔ بھلا کوئی یوں بھی کر سکتا ہے۔ جیدے نے نہیں مرنا؟ وہ بیمار نہیں ہوسکتا؟ اگر کوئی اس کے ساتھ ایسا کر دے تو؟''

شوکت زور زور سے اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے ہوئے اونچا اونچا کہہ رہا تھا۔ کرسیوں، پیڑھوں اور موڑھوں سے ذرا ہٹ کر، دکان کے بنے پر اپنے آپ کو بمشکل ٹکا کے تقریباً اکڑوں بیٹھے پیٹر نے شور بہ سڑکتے ہوئے سر کو ذرا سا اٹھا کر شوکت کے ہاتھوں کی طرف دیکھا، اور دل ہی دل میں ایک دفعہ پھر اس کی بہادری کا معترف ہوگیا۔ ''کیا بات ہے ملک صاحب کی۔ ہاتھوں پر ابھی تک نشان ہیں، پھر بھی ان کو کتنا درد ہے اس خبر کا۔ اپنی تکلیف کا تو احساس ہی نہیں رہا۔'' اسے ایک مہینے پہلے کا واقعہ پھر یاد آگیا تھا۔ شوکت نے اپنے گھر کے ساتھ بنے کچے احاطے میں طرح طرح کے کیمیکل، مٹی کے تیل اور پٹرول کے ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ جب ایک روز کسی نے تالا توڑ کر پٹرول کا

چھوٹا پیپا اٹھالیا تو اسی احاطے میں بنے ایک کچے پکے سے کمرے میں پیٹر کو بھی جگہ مل گئی تھی۔ وہ دن بھر اپنی ریڑھی میں محلے بھر کا کوڑا اٹھاتا اور گلیوں میں جھاڑو دیتا رہتا تھا، اور رات کو اس کمرے میں آ کر سو جاتا۔ برسات کے دنوں میں گٹر بند ہو جاتے تو اس کی مانگ اور کمائی بڑھ جاتی۔ پیٹر کا کرایہ بچ جاتا تھا اور احاطے کی چوکیداری بھی ہو جاتی تھی۔ محلے والوں کو شوکت کے اس ذخیرے سے بہت فائدہ ہوتا تھا۔ جب بھی پٹرول کی قیمت بڑھتی اور بازار سے پٹرول غائب ہو جاتا تو اس مشکل وقت میں شوکت ہی سب کے کام آتا تھا۔ نئے نرخ سے تو وہ ایک پائی کم نہ کرتا تھا لیکن کم سے کم محلے والوں کو، یا ان کی سفارش پر ان کی جان پہچان کے لوگوں کو، پٹرول دینے سے انکار بھی نہ کرتا۔ اور ایسے موقعے تو اب اکثر آنے لگے تھے۔ خود پیٹر نے کئی مرتبہ اس سے پٹرول لے کر دگنے داموں بیچ دیا تھا۔ ان دنوں پٹرول کے نرخوں میں لمبے اضافے کی خبر تھی۔

تبھی ایک صبح شوکت نے احاطے میں مال اتروایا تو پیٹر نے بھی اس کی مدد کی تھی۔ کھوتے ریڑھی والے نے بھی چار پھیرے لگالیے۔ مال سے پورا احاطہ بھر گیا تو کچھ پیپے اس نے اپنے پکے گھر کی بیٹھک میں بھی اتروالیے۔ آخری چکر میں پیٹر تھک گیا۔ خود شوکت کا بھی برا حال تھا۔ اس نے پیٹر کو چائے کا کہنے بھیجا اور خود وہیں کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگالی تھی۔ ابھی پیٹر پوری طرح کمرے سے نکلا بھی نہیں تھا کہ شوکت کے چلانے کی آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو خوف سے اس کی ٹانگیں بے جان ہو گئیں اور وہ ایک جھٹکے سے دہلیز کے پار، گلی میں جا گرا۔ اس سے تو چیخا بھی نہیں گیا تھا۔ شوکت کی کرسی کے بالکل قریب رکھا کیمیکل کا پیپا دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ دائرے میں ناچتے وحشی آگ کے موٹے شعلے — سرخ یا پیلے یا شاید نارنجی، پیٹر کو کچھ پتا چل رہا تھا نہ اس کو رنگوں کے اتنے نام آتے تھے؛ ہاں شعلوں کے اوپر، پل بھر میں جمع ہو جانے والے سیاہ، گاڑھے، دم گھونٹ دینے والے دھوئیں کے رنگ کو وہ خوب پہچان گیا تھا۔ اپنی پوری کھلی آنکھوں سے اسی دھوئیں میں اسے شوکت دکھائی دیا تھا — دونوں ہاتھوں میں ٹین کا جلتا ہوا پیپا اٹھائے، چہرہ لپٹوں سے دور رکھنے کی کوشش میں ذرا سا دائیں طرف گھمائے ہوئے، سانس روک کر آنکھیں ذرا ذرا سی میچے باہر کی طرف بھاگتا ہوا۔ بیٹھک کی دہلیز پار کرتے ہی شوکت نے پیپا پورے زور سے گلی میں لڑھکا دیا تھا۔ آگ کے شعلے گلی میں دور دور تک پھیل گئے لیکن پٹرول کے ڈرم بچ گئے تھے۔ پھر اتنی دیر میں گلی کے

Scanned with CamScanner

سوئے جاگے باسی بھی پوری طرح بیدار ہو گئے۔ شور تو بہت مچا لیکن آگ کو مچنے سے روک لیا گیا تھا۔ بعد میں کئی روز تک اس محلے میں باتیں ہوتی رہیں، کچھ لوگوں نے دبی دبی آواز میں ممکنہ نقصانات کا ذکر کرنے کی بھی کوشش کی تھی، لیکن شوکت کے جل کر سوکھے کیلے کی طرح پھٹ جانے والے ہاتھوں اور سب سے اونچے، دس مرلے کے ٹائل لگے تین منزلہ گھر نے ایسی آوازوں کو بلند ہونے سے روک دیا، اور گونج رہ گئی تو شوکت کی بہادری کے قصے کی۔

پیٹر کو وہ گاڑھا دھواں یاد آیا تو اس نے ایک دم زور سے سانس کھینچا—اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اس کے منہ میں شوربے کا ایک بڑا گھونٹ بھی ہے۔ اسے اچھو لگ گیا، وہ کھانستے کھانستے بے حال ہو گیا لیکن اس وقت کوئی بھی اس کی کھانسی کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ آخر وہ اٹھا، ہاتھوں کی اوک بنا کر سرکاری نل سے پانی پیا، قمیض کے میلے دامن سے آنکھیں اور ناک پونچھی اور بنچ پر ذرا سا ٹک کر دھیان سے شوکت کی بات سننے لگا۔

''اس دن، اس دن جب میرے گھر آگ لگی تھی، اس دن تو یہ جیدا بڑا اچھل رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ جل گئے، اس نے پوچھا تک نہیں۔ اپنے بھائی ہی کو روئے جا رہا تھا، مادر چود۔ اگر میں اس دن وہ پیپا اٹھا کے گلی میں نہ پھینکتا تو پورا محلہ مارا گیا ہوتا۔ اس وقت میرا ہی حوصلہ تھا۔ باقی سب کی تو مت ماری گئی تھی۔''

''ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے۔ میری تو واقعی ماری گئی تھی،'' پیٹر نے پھر سوچا۔

''اب اس کے بھائی پر دو چار چھینٹے پڑ گئے تھے تو کیا ہو گیا تھا؟ میں نے کوئی جان بوجھ کے پھینکا تھا جلتا ہوا تیل؟ اس نے بھی تو اُس کی منجی بیچ گلی میں رکھ دی تھی۔ اتنا ہی درد تھا بھائی کا تو رکھتا نا اپنے گھر کے اندر! یاد ہے چاچا؟ پورے دس ہزار دیے تھے میں نے۔ قصور تھا کوئی میرا؟ پھر بھی دیے تھے۔ اور کیا کہتا تھا تب؟ بھائی کا گوشت بیچنے والا نہیں ہوں میں! یہ موت کا دھندا بند کراؤں گا۔ واہ! بڑا آیا دھندا بند کرانے والا۔ پھر پکڑ لیے پیسے۔ آپ نے ہی تو پکڑائے تھے چاچا۔ کتنا احسان جماتا تھا کہ ہاں چھوڑ دیا، محلے داری ہے۔ یاد ہے، یاد ہے نا؟ چوتیا سالا! اب دیکھو جو کیا ہے اپنے بھائی کے ساتھ!'' شوکت مسلسل چاچے نور محمد کو گواہ بنائے جا رہا تھا۔ چاچے نورے کے ساتھ، اکبر، پیٹر اور دوسرے سننے والوں کو بھی لگا کہ دو چار چھینٹے ہی تھے، پوری ٹانگ کی کھال تھوڑا ہی اتر گئی تھی۔ یہ بھی نہ

پڑتے اگر شیدا اپنی ٹانگ پرے کھینچ لیتا یا منجی سے اٹھ کر بھاگ ہی جاتا۔ اب شوکت تو اس کے فالج کا ذمہ دار نہیں تھا نا۔

''ہا ہا... '' چاچے نور محمد نے اپنا پٹکا سر سے اتار کر ہولے سے جھاڑا، سدا کی نم گدلی آنکھوں کو دھیرے سے پونچھ کر منظر کی دھند صاف کرنا چاہی اور ناکام ہو کر پٹکا پھر دوہرا کر کے سر پر رکھ لیا۔ ''بھائی بھائی دے ویری ہوندے، تے بھائی بھائی دیاں بانہواں... ایک وقت تھا پتر، سگے رشتے تو کیا، یاری میں لوگ جان دے دیتے تھے۔ جیدے شیدے کا باپ بڑا یار تھا میرا۔ ننکے ننکے، میرے ہاتھوں کے پلے ہیں دونوں۔ کیا بتاؤں، کتنا دل کڑھتا ہے میرا۔ نذیر سے بڑی دوستی تھی میری۔ اکھٹے نکلے تھے بھکیکی سے۔ جوانی کا جوش تھا، ڈولوں میں سختی تھی، توانو اویاہ ہوا تھا، ہم دونوں کا۔ ماسی روکتی رہی، میری زنانی پلا سر پہ لیتی رہی، آپا چوڑیاں کھنکھاتی رہی، پر ہم دونوں پٹھوں نے لاہور کی گڈی پکڑی اور سٹیشن پر آ کر ہی دم لیا تھا۔'' چاچے نور محمد نے اپنے بازو کو دیکھا جس کی کمزوری سفید ڈھیلے کرتے میں نمایاں ہو رہی تھی۔ نصف صدی سے بھی پہلے کے قصے یاد کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو بھر آئے اور وہ پھر پٹکا اتار، آنکھوں پہ رکھ، سسکنے لگا۔

ایک لمحے کے لیے ماحول میں ایک نامانوس سی خاموشی چھا گئی، جیسے بھاگتی ہوئی ریل گاڑی سٹیشن سے پہلے ہی کہیں اجاڑ میں اچانک رک جائے۔ شوکت کو کچھ بے چینی سی ہوئی۔ ''زمانہ تو اب بھی نہیں بدلا چاچا، اب بھی رشتے ناتے نبھاتے ہیں لوگ۔ یاد نہیں، جب تیری ٹانگ ٹوٹی تھی تو کتنی خدمت کی تھی تیری بہو نے تیری؟ کھلاتی پلاتی تھی، اٹھاتی بٹھاتی تھی۔ چاچی بیچاری تو خود محتاج تھی اس وقت۔ اس جیدے کنجر کی طرح کا تو کوئی نہیں ہوتا نا۔ تیری بہو عورت ہو کر تیری خدمت کرتی رہی۔ اس کنجر نے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا اپنے سگے بھائی کو۔'' شوکت نے پھر سب حاضرین کو اہم ترین معاملے کی طرف متوجہ کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔

منیرے تیلی کو بھی یاد آ گیا کہ سارا دن شیدا گلی کی دھوپ میں سڑتا رہتا تھا۔ ''ہاں ملک صاحب، خود تو وہ دفتر چلا جاتا تھا اور منجی مکان کے شیڈ تلے پڑی رہتی تھی۔ وہاں تو آٹھ بجے ہی دھوپ آ جاتی ہے۔ کئی اوقات تو میں نے خدا خوفی کی، اسے کھینچ کر اِدھر اُدھر کر دیا۔ پر ملک جی، توبہ توبہ! اتنی بو آتی تھی اس میں سے۔ نماناں اوپر ہی وڈا چھوٹا پیشاب کرتا رہتا تھا ـــــ نکل جاتا ہوگا نمانے کا۔ کوئی

صاف بھی نہیں کرتا تھا۔ جیدا تو ایک دفعہ سویرے اور ایک دفعہ رات کو منجی پہ بیٹھ کے بھائی کو چمچے بھر بھر دلیہ کھلا دیتا تھا۔ اور بس، سمجھتا تھا کہ فرض پورا ہو گیا۔ اب جو چیز اندر گئی ہو، وہ باہر تو آئے گی نا۔ اس کا کوئی دھیان نہیں۔ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ اس نے بھائی کو صاف کیا ہو، نہلایا دھلایا ہو۔ روٹی پانی کھلانے جب بیٹھتا تھا پاس، تو اسے بھی بو تو آتی ہو گی؟ بے رحمی سرکار، بے رحمی۔ ایک دن تو میں نے پیٹر کو پیسے دیے، اس نے کنستر بھر بھر کر پانی ڈالا، اسے الٹا پلٹا کر دھویا، منجی بھی ساتھ ہی دھو دی تھی۔ بڑی ہمت کی پیٹر نے! توبہ، اللہ معاف کرے، گلی میں کپڑے تو نہیں اتارے جا سکتے تھے نا، پھر بھی شلوار اٹھا کر اور قمیص اتار کر دھو ہی دیا نمانے کو۔ اتنے بڑے بڑے زخم بنے تھے اس کی کمر پر، پیپ پڑ گئی تھی۔ میں نے جیدے کا دروازہ کھٹکھٹایا کہ زخموں پہ لگانے والی کوئی دوائی ہی دے دے، اس کی زنانی نے تو جی دروازہ ہی نہیں کھولا۔ میں نے تو تبھی فیصلہ کر لیا تھا جی کہ جب اس کے گھر والوں کو پروا نہیں تو میرا کیا ماے کا پتر ہے؟ پھر نہیں پلٹ کر دیکھا جی میں نے۔ روز بڑا جی کڑھتا تھا، اس کے پاس سے گزرتے ہوئے۔''

''چل چپ کر منیرے، کسی کی ماں بہن کا نام نہیں لیتے چوک میں۔ عزتیں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔'' جیدے کی زنانی کے ذکر پر اکبر کے چہرے کے بگڑتے زاویوں کو شوکت نے بھانپ لیا تھا، اس لیے بروقت ٹوک دیا۔

''ہاں جی، ویسے بھی ذمہ داری تو جیدے کی تھی۔ اپنے گھر کو بھی اس نے ہی سنبھالنا تھا۔ مرد کی پکڑ بھاری ہو تو زنانی کی کیا مجال جو ہاتھ سے نکل جائے۔'' منیرے تیلی نے اپنی طرف سے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی اور اکبر کا وہاں بیٹھنا ناممکن کر دیا۔

''تو بھی نا، سانڈ کا کھڑ ہی رہے گا ساری عمر! تیل نکالتے نکالتے تیرے دماغ کا بھی تیل نکل گیا ہے۔'' اکبر کے اٹھ جانے پر شوکت کو افسوس ہوا — خواہ مخواہ ایک اچھا سامع کم ہو گیا تھا، اس لیے اس نے منیرے تیلی کی گدی پر ایک زوردار ہاتھ جمایا۔

منیرے تیلی کی زبان سے اپنا نام سن کر پیٹر چونک سا گیا تھا اور بنچ سے اٹھ کر، شوکت کے قریب، زمین پر متوقع سے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ بات کا رخ بدلتا دیکھ کر اسے مایوسی سی ہوئی۔ سوکھے سوکھے چوتڑوں کے نیچے رکھی اینٹ پر اس نے پہلو بدلا اور ذرا سا کھنکھارا۔ بلی کے ایک چھوٹے،

مریل سے بچے نے سہمے سہمے انداز میں چچوڑی، زمین پر پھینکی ہڈیوں کی خوشبو سونگھتے ہوئے، میز کے نیچے گھسنے کی کوشش کی تو شوکت کی پنڈلی سے ہلکا سا چھو گیا۔ اپنی لٹھے کی کڑکڑاتی شلوار کے پائینچے پہ اجنبی سرسراہٹ محسوس کر کے شوکت نے بے اختیار پاؤں پیچھے کیا اور سرسراہٹ کی وجہ تلاشنے کے لیے نظر گھمائی۔ اس کی نظر کے محیط کو پہلے اس کے پیٹ کے عرض نے اور پھر پیٹر کے مدقوق چہرے نے مختصر کر دیا، اور اکبر کی روانگی کا افسوس کچھ ماند سا پڑ گیا۔ شوکت سے نظر ملتے ہی پیٹر نے لنڈے سے خریدے بھورے سوتی پاجامے کا پائینچہ ذرا سا اٹھا کر ٹانگ کو کھجانا شروع کیا اور دھیرے سے بولا،
''وہ ملک جی، بوٹے سے جب بات کی تھی میں نے...''

''ہاں، ہاں!'' شوکت کو سارا قصہ یاد آ گیا۔ ''پیٹر نے اپنے برادری بھائی سے بات کرائی تھی میری۔ منشی ہسپتال والے اٹھا کے لے گئے شیدے کو۔ پر وہاں بھی اپنی حرامزدگی سے باز نہیں تھا آیا یہ جیدا۔ پتا ہی غلط لکھوا دیا۔ ایک دو دن تو جاتا رہا وہاں، پھر بھاگ گیا۔ بوٹے بیچارے کی تو شامت آ گئی، اس نے بڑے ڈاکٹر کے سامنے ذمہ داری لی تھی۔ بھاگا بھاگا آیا میرے پاس۔ میں اور پیٹر جا کے لے آئے اسے...''

''ملک چاچا، بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے!'' منظور کو جوان کے نوجوان لڑکے ارسلان کو بھی اپنا دکھڑا یاد آ گیا تھا، اس نے اپنے جوش میں شوکت کی بات کاٹ دی اور شوکت کی پیشانی پہ پڑے بل کو بالکل نہ دیکھا۔ ''اس دن جب میری ٹیم کے لڑکے کھیل رہے تھے گلی میں، میں نے شاٹ ماری تو گیند چاچے شیدے کو جا لگی۔ توبہ، اتنا رولا ڈالا شام کو چاچے جیدے نے! ابّے کے پاس پہنچ گیا شکایت لے کے۔ میں نے بھی ابّے سے کہا کہ اب ہم کہاں کھیلیں؟ ہر گلی کی اپنی ٹیم ہے، کوئی نہیں کھیلنے دیتا اپنی گلی میں۔ نا جی نا، نہ مانا۔ بس لڑتا رہا کہ کہاں لے جاؤں بابے کو؟ گھر میں جگہ نہیں، پرائیویٹ ہسپتال کا پیسہ نہیں، سرکاری داخل نہیں کرتے، اور گلی والے کچھ خیال نہیں کر رہے۔ اس کا پٹنا دیکھ کے ابّے نے پابندی لگا دی کہ کوئی گلی میں نہ کھیلے۔ بس اتوار کی اتوار مون مارکیٹ کی سڑکوں پر جا کے کھیلتے رہے ہم۔ پریکٹس نہیں کی پورا مہینہ۔ کوئی میچ نہیں جیتا ہم نے۔''

''حوصلہ کا کے، حوصلہ!'' شوکت نے دوبارہ بات شروع کی تو لہجہ خاصا تیز تھا۔ ''جب بڑے بات کر رہے ہوں تو بیچ میں نہیں بولتے۔'' بات ختم کرتے کرتے شوکت کی آواز ذرا مدھم پڑ گئی۔ اس

نے عرصے بعد ارسلان کو اتنے غور سے دیکھا تھا— سیدھا تنا ہوا جسم، سانولا رنگ، جوانی کی سرخی سے ذرا تمتمایا ہوا، آنکھوں میں ایک بے باک چمک، اور کچھ کر گزرنے کو بے تاب ہاتھ۔

''معاف کر دو ملک جی۔ لونٹھے کا لونٹھا ہو گیا پر عقل ابھی گٹوں میں ہے جی۔ چل وے ارسلان، سلام کر سب کو اور گھر جا، تجھے کالج سے دیر ہو رہی ہے!'' منظور جہاں دیدہ تھا، فوراً بول اٹھا۔ ارسلان نے ایک شکایتی سی نظر باپ پر ڈالی، کچھ کہنے کو منہ کھولا، پھر موڑھے سے اٹھ کر شوکت کو خصوصی اور باقی سب کو عمومی سلام کر کے نکلتا چلا گیا۔ شوکت کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔

''ہاہ... کیا ٹور ہے اس جوان کی! ایک وقت تھا، ہم بھی ایسے ہی چلا کرتے تھے،'' چاچے نور محمد کو پھر گزرا زمانہ یاد آیا۔

''بس دعا کریں چاچا، یہ بھی آپ کے تنویر کی طرح سعادت مند اور کماؤ نکلے۔ میرا بڑھاپا بھی سنور جائے،'' منظور کوچوان نے موقع غنیمت جان کر سب کی توجہ ارسلان سے پھیر دی۔ وہ بڑا وہمی تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو بھی سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کسی سے ارسلان کی پڑھائی بارے بات نہ کرے۔ پچھلے مہینے جب ارسلان کو وظیفہ ملا تو اس نے محلے میں مٹھائی بانٹی نہ بیوی کو گھر میں میلاد کرانے دیا۔ اس بات پر میاں بیوی میں خوب چخ چخ ہوئی تھی۔ بیوی نے تو غصے میں کہہ دیا تھا، ''تو وہابی ہو گیا ہے۔ میلاد نہ کرایا تو اگلا وظیفہ نہیں ملے گا۔'' منظور نے یہ طعنہ بھی برداشت کر لیا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ جب ارسلان کو بڑی نوکری ملے گی تو وہ بڑا میلاد کرائے گا اور چھوٹے گوشت کی چار دیگیں اتارے گا۔ پھر دیکھیں گے کون اسے وہابی کہتا ہے! اور اسی دن وہ اپنا تانگہ گھوڑا بھی بیچ دے گا۔

ویسے بھی اب شہر میں تانگوں کا رواج ہی کہاں رہا تھا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی اہلکار اسے نکر جاتا۔ گھوڑے کی لید کا جرمانہ اسے بھرنا پڑ جاتا تھا اور اس روز اس کی آدھی کمائی گندگی میں نکل جاتی۔ اس مصیبت سے بچنے کے لیے اس نے گھوڑے کی دم کے نیچے چوکور کپڑا بھی باندھا، مزید احتیاط کے لیے اسے دوہرا بھی کر دیا، پر پیشاب کا تو کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اوپر سے سواری بھی نہیں ملتی تھی۔ جب سے موٹر سائیکل رکشوں کا رواج ہوا تھا، اس کے تانگے کی ٹخ ٹخ سب کو بری لگنے لگی

Scanned with CamScanner

تھی۔خدا جانے یہ شیطانی سواری کس نے نکالی تھی۔نوجوان لونڈے تھوڑے بہت پیسے اکٹھے کر کے موٹر سائیکل خرید لیتے، پھر لوہار سے لوہے کا ایک بڑا سا چوکھٹا بنوا کر آگے پیچھے تین تین سواریوں والی سیٹیں جڑوا کر مکینک سے اس کے نیچے دو چھوٹے ٹائر لگوا لیتے۔موٹر سائیکل آگے، چوکھٹا پیچھے، ایک دو سواری کی جگہ موٹر سائیکل کی گدی پر بھی نکل آتی۔بس پھر زوم زوم کرتے، دھواں چھوڑتے، اِدھر اُدھر مست ناگ کی طرح لہراتے اس کے قریب سے یوں نکلتے جاتے کہ وہ تو وہ، اس کا گھوڑا بھی سہم جاتا اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیتا۔ایک آدھ دفعہ تو وہ بالکل ہی الف ہو گیا۔رکشوں کی تیزی سے گھبرائے جو دو چار بوڑھے اس کے تانگے میں بیٹھ جاتے تھے، اس واقعے کے بعد وہ بھی چالو ہو گئے۔ایک اور ستم میونسپلٹی نے کیا۔شہر کی بڑی سڑکوں پر تانگوں کا داخلہ ہی بند کر دیا گیا تھا۔بحکم سرکار، اس تیز رفتاری کے دور میں آہستہ خرامی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔پھر ایک اور افتاد آئی۔ایک دن دو آدمی اس کے دروازے پر چاک سے کچھ لکھ گئے۔وہ شام کو واپس آیا تو ارسلان نے بتایا کہ میونسپلٹی والوں کا نوٹس ہے۔اسی وقت اس نے شوکت ملک کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ملک صاحب نے کمال مہربانی کی اور اگلے دن اس کے ساتھ میونسپلٹی کے دفتر چلے گئے۔وہاں پہنچ کے پتا چلا کہ اس نے شہری رہائشی علاقے میں مویشی پال رکھے ہیں، اور ان کی مناسب دیکھ بھال بھی نہیں کرتا، جو شہری قانون کے تحت قابلِ تعزیر جرم ہے، جس کی سزا بیس ہزار روپے جرمانہ اور جانور کی ضبطی ہے۔منظور تو جرم کا لفظ سن کر ہی گھبرا گیا تھا۔اس نے مدد طلب نظروں سے شوکت کی طرف دیکھا تھا۔شوکت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔پھر کوئی تین گھنٹے تک منظور دفتر کے چک لگے دروازے کے سامنے بیٹھا، نائب قاصد کو بوتلیں، چائے کی پیالیاں اور سموسوں کی پلیٹیں اندر لے جاتے دیکھتا رہا۔شوکت کی طرح کے کئی اندر رہے اور اس جیسے کئی باہر۔شوکت باہر آیا تو منظور لپک کر اس کے سامنے آیا تھا۔''چل بھئی چل!'' اسی کے تانگے میں بیٹھ کر شوکت محلے میں واپس پہنچا اور اسے بتایا کہ کام ہو گیا ہے۔اب وہ دروازے سے نشان صاف کر دے۔

''بھئی، اس افسر نے تو میرا بڑا حیا کیا۔یہ جب تک ہے تب تک تو میرا ذمہ، اگر بدل گیا تو تیری قسمت!''

''میری قسمت تو جی آپ کے جوتوں کی طرح کالی ہے،'' منظور آہستہ سے بولا تھا۔شوکت

نے آدھا جملہ سنا اور جان لیا کہ اب وہ اپنی اگلی بات بھی کہہ سکتا ہے۔
''بھائی، تو محلے دار ہے، تو نے تو میری مدد نہیں کی تھی، پر میں تو محلے داری کی شرم رکھتا ہوں نا۔''
منظور بھی شاید اسی جملے کا منتظر تھا۔''نہ نہ ملک جی، میری کیا مجال! اس وقت بھی میں نے آپ کو بتایا تھا، ارسلان کے پکے پرچے ہو رہے تھے۔ اب وہ فارغ ہے۔ کل سے آپ کا حساب دیکھنے آ جائے گا، آپ کا اپنا بچہ ہے جی۔''
''ہنھ، اب ضرورت تو نہیں ہے، پر تم بھیج دینا، کچھ سیکھ لے گا حساب کتاب۔ سرکاری سکولوں میں تو کچھ پڑھایا نہیں جاتا،'' شوکت نے ایک فتحمندانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا اور اگلے تین مہینے باپ کی مدد کے بدلے ارسلان شوکت کے سودی کاروبار کا حساب دیکھتا رہا تھا۔
''کاکا سنبھالنے والا بھی ہونا چاہیے۔ میں نے اور نذیر نے اکھٹے شیدے اور تنویر کو بھیجا تھا کویت۔ تنویر مکینکی جانتا تھا چنگی طرح۔ وہی پتا کر کے آیا تھا سرکاری ویزے کا۔ ایجنٹ کو بھی اسی نے پکڑا تھا۔ تیری دونوں چاچیاں روتی تھیں کہ پہلے آپ پنڈ چھوڑ کے آئے، اب منڈوں کو دیس نکالا دے رہے ہو۔ ہاہ... کیا زمانہ تھا! آدھا محلہ خالی ہو گیا تھا۔ دستکار، ڈرائیور، مکینک — بس جس کے ہاتھ میں کوئی بھی ہنر تھا، نکل گیا وہ باہر۔ تھیلے بھر بھر کے سامان لاتے تھے واپس۔ تنویر بتاتا تھا، وہاں مل کے رہتے تھے۔ جو پردیسی ہونے کا دکھ ہوتا تھا نا، وہ بھی دور ہو جاتا تھا۔ ان کے کفیل بھی ان سے خوش تھے۔ بڑی دعوتیں ہوتی تھیں ہماری۔ جس کو بھی پتا چلتا کہ منڈے باہر گئے ہیں، وہ آگے پیچھے پھرنے لگتا۔ کتنے لڑکے تھے جان پہچان والے، جن کو تنویر نے بلوا لیا۔ اپنے پاس ٹھہرایا بھی۔ مجھے اور تیری چاچی کو تین بار حج بھی کرایا۔ وہ تو جب فراڈ شروع ہوئے تو میں نے تنویر کو روک دیا۔ ایسے ہی نیکی گلے نہ پڑ جائے۔''
شوکت کو یاد آیا۔''چاچا، تیرے پتر نے تو کمایا ہی ہے نا! اس شیدے نے تو گھر بار بھی نہیں بنایا۔ چاچے نذیر کی زندگی میں ایک دو بار جب آیا تو سب نے کتنا کہا تھا کہ ویاہ کر لے۔ تب تو اسے ہیرا منڈی کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ کہتا تھا، جب بازار سے دودھ ملتا ہے تو گھر میں بھینس کیوں باندھوں؟ تنویر بھی تو اسی لیے پیچھے ہٹ گیا تھا نا۔ سنا ہے، وہاں بھی اس نے کوئی راستہ ڈھونڈ لیا تھا، شیخوں کے تلوے چاٹ کر۔''

''اسلامی ملک میں ایسا نہیں ہوسکتا ملک صاحب۔'' خورشید ابھی ابھی سبزی منڈی سے واپس آکر، ناشتہ کرنے وہاں پہنچا تھا، اس نے شوکت کی بات سے اختلاف کیا۔

''او تجھے کیا پتا! سڑے بینگنوں کے کیڑے گھس گئے ہیں تیرے دماغ میں۔ تو بس بیٹھا موٹی مرچیں بیچا کر۔ تو کبھی گیا ہے وہاں؟'' شوکت نے اس انداز میں کہا کہ جیسے وہ ہر مہینے کسی نہ کسی اسلامی ملک کو فتح کر کے آتا ہو۔ اس کے بے ہنگم قہقہے سے اس کا پیٹ بھی ہنسنے لگا اور اس کے ہنستے پیٹ کے احترام میں سب حاضرین نے بھی ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

''نہ جی!'' خورشید اپنے سڑے بینگنوں کے کیڑوں میں مست تھا۔ ''شیدے نے بھی بڑا کمایا تھا جی۔ اتنا کمایا تھا کہ میرا تو اپنا جی چاہنے لگا تھا کویت جانے کو۔ مسلمانوں کا جلوہ دیکھ کے خوشی ہوتی تھی۔ کیسے چنگے مسلمان ہیں، اپنے بھائیوں کی کیسی مدد کرتے ہیں، اور کتنا پیسہ ہے ان کے پاس! پھر میں نے سوچا کہ ہم سب اکٹھے ہو جائیں گے۔ اسی مٹی سے سونا مل جائے گا ہمیں بھی۔ پردیس جانے کی کیا ضرورت۔ ایسا ہو بھی جاتا... ہاہ ہائے! لعنت ہو امریکہ پر! وہ جب لڑا دیا عراق کو کویت سے... وہ کیا نام تھا جی عراقی بادشاہ کا؟'' خورشید نے نام یاد کرنے کی کوشش کی، پھر مداخلت کے لمحے کو قریب آتا دیکھ کر کوشش ترک کر دی۔ ''بڑا تگڑا بادشاہ تھا جی۔ اکڑ کے کھڑا ہو گیا جی امریکہ کے سامنے۔ سازش کر دی جی انھوں نے۔''

''کوئی تگڑا وگڑا نہیں تھا... پھٹو تھا پھٹو!'' اچھو پہلوان کو خاصی تپ چڑھی تھی خورشید کی بات پر۔ اس کے دہی بلوتے ہاتھ رک گئے تھے اور وہ اتنی دیر میں پہلی مرتبہ اس معاملے میں بولا تھا، ورنہ ابھی تک تو اس کی زبان بلّے کو حکم دینے میں ہی متحرک رہی تھی۔ ''پہلے سارا بارود لیا امریکہ سے، پھر اپنے ہی مسلمان بھائیوں پہ چلا دیا!'' اچھو اپنی گدی پر پہلو بدل کر کہنے لگا۔

''امریکہ نے دیا تو لیا نا! اور چنگا کیا — کیوں نہ لیتا؟ ان کو انھی کے داؤ سے مارا اس نے۔ کچھ نہیں کر سکے ماں کے یار، تو بھائی کو بھائی کے سامنے لے آئے۔ یہ انگریز سالے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ یہاں بھی تو گوروں نے یہی کیا تھا۔'' خورشید کو عراقی بادشاہ کے خلاف کچھ سننا گوارا نہیں تھا۔

''تیل کی لڑائی تھی ساری، تیل کی!'' اچھو بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ جیسے خم ٹھونک کر اکھاڑے میں اتر آیا تھا۔ ''امریکہ کو تیل چاہیے تھا، اور کیا! تیرے بادشاہ کو بانس پہ چڑھا کے پہلے

ایران کی گانڈ میں دیا۔ اس کا اپنا تیل نکل آیا تو کوتیتیوں کی چوت میں گھسیڑ دیا۔''
''چپ کر بے!'' خورشید کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ ''زبان کو لگام دے۔ تیرے گھر سے لے کے گیا تھا تیل؟ اس کا اپنا تھا، جس کو چاہے دے، جس سے چاہے لے۔''
''اوئے، اوئے، کیا بکواس کر رہے ہو! آپس میں لڑنے کی کیا بات ہے؟'' شوکت کی موجودگی میں کوئی اتنی زور سے بولے، اس سے اس کی مردانگی کو ٹھیس پہنچتی تھی، سو دہاڑ کر بولا۔
شوکت کی شہ پا کر بھی منصف بننے لگے تھے۔ قدیر مستری خشک ہاتھوں کی پھٹی لکیروں پہ نظریں جما کر بولا، ''خورشیدے، تجھے پتا بھی ہے پہلوان کی کمزوری کا۔ کیوں چھیڑتا ہے پھر؟ کبھی سوچا، کیا بیتتی ہے اس پہ گلابے کو دیکھ کے؟ ہاہ! ایسا سوہنا جوان، پر اکھیاں لے گیا خسرہ۔''
قدیر مستری کی بات سن کر خورشید کی نظر جھک گئی۔ اسے خیال آیا کہ اچھو پہلوان کا غصہ بجا تھا۔ اوپر تلے کی چھ لڑکیوں کے بعد جب اللہ نے ساتویں مرتبہ امید دلائی تو شاہ صاحب کی ہدایت پر اچھو نے زیارت کی منت مان لی تھی۔ مزید احتیاط کی خاطر یہ بھی مان لیا کہ معصومین کے مزار پر جا کر دعا کرے گا اور چادر چڑھائے گا۔ مولا کا کرم ہوا اور اسے بیٹے کا منہ نصیب ہوا — گول مٹول، لال گالوں والا۔ بڑے چاؤ سے اس کا نام گلاب علی رکھا تھا۔ اس کی بیوی نے اسے امام حسین کا فقیر بنایا۔ مانگے تانگے کے کپڑے اسے پہناتی تھی۔ اچھو کو ان دنوں سوائے کربلا نجف کے کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ زیارتوں پہ جائے گا اور حج کر کے واپس آئے گا۔ غلامانِ علی کے قافلے میں جگہ بھی پکی کرا لی۔ اپنی اکلوتی بھوری بیچ کر سفر کے لیے پیسے بھی اکٹھے کر لیے۔ بس بی بی پاک دامناں پہ آخری سلام باقی تھا کہ عراق ایران جنگ چھڑ گئی۔ ویزے بند ہو گئے، اور نہ بھی ہوتے تو اب وہاں جانے کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔ وہ انتظار کرتا رہا، کرتا رہا۔ سارا سارا دن بیٹری والا ریڈیو، جس پر پہلے وہ نور جہاں کے گانے سنتا تھا، کان سے لگائے رہتا، سکول کے لڑکوں سے اخبار پڑھواتا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ خبریں، تجزیے اور کالم سنتا جن میں جنگ کے بارے کوئی بات ہوتی۔ جمع جتھا ختم ہونے لگا، روٹی کے لالے پڑ گئے، پر وہ زادِ راہ کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا تھا۔ دوبارہ بھوری خریدتا نہ دکان کھولتا۔ پھر علی کا گلاب مرجھانے لگا۔ اسے ایک دن زور کا بخار آیا اور اگلے دن پورا جسم چھوٹے چھوٹے سفید پانی بھرے دانوں سے بھر گیا۔ چھوٹے سے حلق میں، آنکھوں کے اندر، کانوں میں،

Scanned with CamScanner

کہاں نہیں تھے دانے۔ ماں لے کر حکیم کی طرف بھاگی، پھر بڑے ڈاکٹر کی طرف۔ اور جب اجل کے سائے ننھے بدن کو سیاہ کرنے لگے تو زادِ راہ کو ہاتھ لگ ہی گیا۔ اس دن اچھو چوک میں رویا تھا۔ اپنا لمبا چوڑا بھاری بدن، زمین پر پھینک پھینک کر رویا۔ کون تھا محلے میں اس کی ٹکر کا کہ اسے سنبھال لے، وہ بھی ایسی دکھ کی حالت میں۔ بس روتا رہا، روتا رہا، پھر خود ہی اٹھ کر شاہ صاحب کے دروازے پر پہنچا اور فریاد کی کہ منت پوری نہ ہونے میں اس کا کیا گناہ، مولا جانتے ہیں کہ وہ تیار تھا، تو شاہ صاحب نے تسلی دی کہ مولا اس کی نیت کو جانتے ہیں۔ نیت قبول ہوئی، اس کے گلاب علی کی جان بچ جائے گی، ہاں جو کفارہ بھی آئے اس کو صبر سے بھگت لے۔ اچھو وہاں سے اٹھا تو اسے پتا چلا کہ اس کا بچہ بچ گیا ہے — ہاں، نہ پوری ہوئی منت اس کی آنکھیں لے گئی ہے۔

واقعہ ایسا نہ تھا کہ آسانی سے بھلایا جا سکے۔ چوک کی فضا افسردہ سی ہو گئی۔ شوکت کو کچھ خیال ہوا۔ ''چل او بلے، آج ذرا، سب کو اَدھ رڑ کا پلا، میری طرف سے۔'' اس نے فیاضی کا مظاہرہ کیا، اور بڑھتا ہوا جھگڑا اور بعد کی اداسی دہی کے کونڈے میں جم کے رہ گئے۔

''میں تو جی، شیدے کی بات کر رہا تھا'' حالات معمول پر آئے تو خورشید کو، شوکت کی موجودگی میں، اپنا جوش گستاخی سا لگا۔ ''شیدا پرانا یار ہے جی، لنگوٹیا۔ کویت سے اکیلا نکلا تھا، بس جان بچا کے۔ سڑکوں سڑکیں سفر کرتا ہوا، خجل خراب ہوتا ہوا، پندرہ، بیس دنوں میں پہنچا تھا یہاں۔ ایسا خالی ہاتھ بھی نہیں تھا جی، وہ تو جی اپنے ہی لوگوں نے لوٹ لیا اسے۔ جب اس نے یہاں پلاٹ خریدے تھے، جعلی پلاٹ بیچ دیے بیچارے کو۔ آپ تو جانتے ہیں جی...''

خورشید کو ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا بھیانک غلطی کرنے جا رہا ہے۔ شوکت نے فوراً اسے ٹوک دیا، ''اتنا درد ہے اس کا تو کچھ کرتا کیوں نہیں؟ کم سے کم جیدے کو تو سمجھا۔''

''میں کیسے سمجھاؤں جی، میری کون سنتا ہے؟ اسے اللہ سمجھائے تو سمجھائے۔''

خورشید نے اپنے بھولپن میں شوکت کو نئی راہ سجھا دی تھی۔ اس سے پہلے کہ سب کو یاد آ جائے کہ شیدے کو جعلی، کئی کئی بار کے بکے ہوئے پلاٹ لے کے دینے والا اور دیوانی مقدموں میں الجھانے والا شوکت تھا، اس راہ کا سوجھ جانا بڑی کارآمد بات تھی۔

سورج بھی ان کی باتیں سننے کے لیے منڈیروں پہ چڑھ آیا تھا اور اس کی تیز کرنیں دھوپ کو

Scanned with CamScanner

سرکاتی ہوئی ان کے سروں تک پہنچ گئی تھیں۔ اچھو کی دکان کے چھجے سے ٹنگی ترپال ان کا راستہ روکنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ اٹھ جانے کے لیے اب مناسب ترین وقت تھا۔ کم از کم شوکت کو یہی احساس ہوا۔

''میرا خیال ہے سجنو، یہاں بیٹھے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایک جان کا سوال ہے۔ ہم ایسے تو اس معاملے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ چلو اللہ کے گھر چلتے ہیں، مولانا صاحب سے بات کرتے ہیں۔ وہ ضرور کوئی سبیل نکالیں گے،'' شوکت نے تقریر کرنے کے انداز میں کہا، اور کسی کے سوچنے سمجھنے سے پہلے اٹھ کر چاچے نور محمد کا بازو تھام لیا۔ ان دونوں کو اٹھتا دیکھ کر باقی بھی دھیما دھیما بسم اللہ، اللہ اکبر کہتے، دکھتے گھٹنوں پہ ہتھیلی کا زور دے کر اٹھنے لگے۔

اکبر اچھو پہلوان کی دکان سے منیرے تیلی کی زبان کا گھاؤ لے کر نکلا تو اس کی حالت کسی اناڑی کی سی ہو رہی تھی جس نے پہلی مرتبہ دم لگایا ہو۔ راستے لمبے ہوتے جا رہے تھے اور اسے لگ رہا تھا کہ شاید وہ ماں کے پیٹ سے پیدل چلتا ہوا نکلا تھا اور قبر تک یوں ہی چلتا رہے گا۔ اس کے دماغ میں خیالات لکن میٹی کھیل رہے تھے، یا شاید پکڑن پکڑائی، یا پھر کبڈی... ایک خیال تیزی سے بلا بولتا۔ ابھی وہ شعور کی لکیر پوری طرح پار نہیں کر پاتا تھا کہ ایک اور خیال کسی ماہر کھلاڑی کی طرح پورے زور سے ابھر کر پہلے خیال کی کمر کو چھو لیتا اور پھر دونوں میں زور آزمائی ہونے لگتی۔ اتنے میں ایک اور خیال جانے کہاں سے آ ٹپکتا اور دونوں الجھے ہوئے کھلاڑیوں کو ٹھینگا دکھاتے ہوئے لکیر کی دوسری طرف جا نکلتا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اسے چاچے شیدے کا فالج سے ٹیڑھا چہرہ یاد آ رہا تھا، جسے ہر روز گلی سے گزرتے ہوئے نہ دیکھنے کی شعوری کاوش میں وہ کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بڑھتا چلا جاتا تھا — چھوٹا سا، آنکھیں ہمیشہ مندی ہوئیں، منھ ہمیشہ کھلا ہوا، اور زبان ہمیشہ بائیں طرف کو نکلی ہوئی۔ جلی ہوئی سیاہ رنگت پہ سدا بڑھی ہوئی ڈاڑھی، جیسے چیونٹیوں کے سفید سفید انڈے۔ پھر یہ انڈے بڑھ کر پیٹ کے کیڑوں جیسے ہو جاتے، سفید، باریک، ذرا ذرا سر اٹھائے، نامحسوس طریقے سے ہلتے ہوتے۔ اسے خیال آیا کہ ایک دفعہ جب وہ مٹی بہت کھانے لگا تھا، اور اس کا رنگ بھی پیلا پڑ گیا تو اماں نے اسے ڈسپنسر سے ایک سفید رنگ کی دوائی لا دی تھی۔ ابا نے اسے گود میں جکڑ کر اس کی ناک بند کی۔ جب اس نے رونے کے لیے پورا منھ کھولا تو اماں نے جھٹ پوری دوائی کی

شیشی اس کے منہ میں خالی کر دی تھی۔ اس دن اماں نے حاجت بھی اپنے سامنے کرائی تھی، اور جب وہ فارغ ہو کے اٹھا تو اسے اپنی گندگی کی ڈھیری میں سفید سفید سے دھاگے نظر آئے۔ اس نے جھک کر غور سے دیکھا تو وہ دھاگے زندہ ہو گئے اور ان کے سرے بے چینی سے ہلنے لگے۔ وہ سخت ڈر گیا اور چیخیں مارتا ہوا اماں کی گود میں چھپ گیا تھا۔ اماں کا خیال آتے ہی اسے اپنا گھر یاد آیا اور بیٹھک کے نام پہ بنا کمرہ بھی جہاں ہر روز اس کی فجر قضا ہوتی تھی۔ فجر کا سوچتے سوچتے اسے روزی کی یاد آئی۔ روزی کا سفید پنڈا، بچوں کے بعد ذرا بڑھا ہوا پیٹ، اور پیٹ کے دونوں طرف چرے ہوئے ماس کے نشان۔ وہ ہر صبح روزی کی قمیص اتار کر ان نشانوں پہ ہاتھ پھیرتا، پھر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ روزی کی بھری چھاتیوں کی طرف اٹھتا چلا جاتا، اور پھر چھاتیوں کے ابھار پر رکھے خشک، خفیہ طور پر رس بھرے، کالے پشاوری شہتوت... روزی کے بارے سوچتے سوچتے اس کا ہاتھ اپنی قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے پر جا پہنچا تھا اور وہ ناڑے کی گانٹھ پر انگوٹھا رکھے، دو انگلیوں سے شلوار کی سلوٹوں میں اپنے نیم خفتہ بدن کو سہلائے چلا جا رہا تھا۔ دو نو عمر لڑکے اس کے قریب سے گزرے اور ٹھٹھا مار کر ہنسے۔ وہ ایک دم چونکا اور شرم سے تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر نہ جانے کیسے اس نے خود کو استانی جی کے جانے پہچانے گھر کے سامنے کھڑے پایا۔ سیمنٹ کی تین سیڑھیاں، بیچ میں بنی سپاٹ ڈھلان، اوپری زینے کے ساتھ لوہے کا زنگ آلود دروازہ جو ہمیشہ کی طرح کھلا تھا، دروازے کے پار لٹکتا ہوا کتھئی رنگ کا پردے نما کپڑا جو شاید کبھی عنابی رہا ہو... وہ سوچنے لگا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے، اور اگر آ گیا ہے تو اب کیا کرے؟ دستک دے یا چپ چاپ لوٹ جائے؟ پردہ ہوا سے ہلا تو اس کی نظر استانی جی کے صحن میں پڑی۔ کئی عورتوں میں گھری استانی جی سامنے ہی بیٹھی تھیں۔ انھوں نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ واپس پلٹتا، اس نے دیکھا کہ استانی جی اپنی پلنگڑی سے اٹھ کر باہر آ رہی ہیں۔

''کیا حال ہے، اکبر پتر؟ بڑے دنوں بعد آیا ہے۔ آج ٹھیلا نہیں لگایا تو نے؟'' ہمیشہ کی طرح استانی جی نے پردے کی اوٹ سے پوچھا تھا۔

''بس استانی جی، ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا آپ کو سلام کر لوں۔'' اس نے بھی ہمیشہ کا لگا بندھا جملہ دہرا دیا۔ ''چنگا کیا پتر، بڑا بیبا بچہ ہے تو۔ اللہ تجھے سلامت رکھے۔'' ذرا سے ردوبدل کے ساتھ

Scanned with CamScanner

استانی جی کا جواب بھی معمول کے مطابق ہی تھا۔ اب اسے اللہ حافظ کہہ کے چلے جانا چاہیے تھا،لیکن صبح سے کچھ بھی تو معمولی نہیں ہو رہا تھا—— وہ کھڑا رہا۔ استانی جی کے چہرے کی سلوٹ ذرا گہری ہو گئی۔ ''اچھا، بیٹھک کھلی ہے۔تو بیٹھ جا!'' چند لمحے اس کے جانے کا انتظار کرنے کے بعد استانی جی نے کہا اور اندر کی طرف مڑ گئیں۔

اکبر بیٹھک کے باہری دروازے سے اندر داخل ہوا۔ کمرے کے فرش پر بچھی دری پر تین چار لڑکے قاعدہ لیے بیٹھے، ایک ہی ردم میں ہل ہل کر کچھ یاد کر رہے تھے۔ اکبر کے اندر داخل ہونے پر ان کا سُر تو مدھم ہوا لیکن جسم اور لبوں کی حرکت میں کچھ فرق نہیں آیا۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ لگے، بغیر ہتھے کے، اسپرنگ والے پرانے صوفے پر بیٹھنے تک اکبر کو کوئی خبر نہ تھی کہ وہ استانی جی سے کیا بات کرے گا۔

''کاکا، جا ذرا، بھٹی کی دکان سے ایک ٹھنڈی بوتل تو پکڑ لا۔ میرا کہہ دینا، حساب میں لکھ لے گا۔'' استانی جی نے بیٹھک میں آتے ہی سب سے چھوٹے لڑکے کو نکڑ کی دکان پہ چلتا کیا۔ اکبر کے رسمی انکار سے بھی پہلے لڑکا دہلیز پار کر چکا تھا۔ اب استانی جی اکبر کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''آج بڑی رونق ہے گھر میں،'' اکبر نے بات شروع کرنے کی نیت سے کہا۔

''ہائے، اللہ بچائے ایسی رونقوں سے پتر! زنانیاں اکٹھی ہوئی ہیں۔ کہہ رہی ہیں، جیدے کے گھر جانا ہے۔ تو نے بھی تو خبر سنی ہوگی...''

''ہاں استانی جی، اچھو کی دکان سے سن کر آ رہا ہوں،'' اکبر کو چکر سا آنے لگا، بمشکل اس نے کہا تھا۔

''ہاں، ادھر بھی سویرے سے سب جمع ہو رہی ہیں۔ آپا رقیہ بھی آئی ہیں۔ سب کہتی ہیں کہ جا کے رفیعہ کو سمجھاتی ہیں، جیدے نے خیال نہیں کیا تو وہ ہی کچھ سوچ لے۔ جیٹھ بھی تو سر سمان ہوتا ہے۔ پھر اس کے آگے تین تین بیٹیاں ہیں، بڑی بدنامی کی بات ہے پتر، پورا محلہ تھو تھو کر رہا ہے۔ ایسی سنگدل مشہور ہو گئی تو کون اپنے پتر کی بارات لے کر اس کے دروازے پر آئے گا؟ سب ڈر جائیں گے۔ کہیں گے، جیسی ماں ویسی بیٹی۔''

''یہ تو چاچے کو سوچنا چاہیے تھا نا استانی جی۔ کہتے ہیں، مرد کی پکڑ...'' اکبر کے حلق میں

Scanned with CamScanner

منیرے تیلی کا جملہ اٹک گیا تھا۔

''نہ پتر، آپا رقیہ کو تو میں نے صاف کہہ دیا، میں رفیعہ سے کچھ نہیں کہوں گی۔ جب بھاشیدا بیمار ہوا تو اس نے بھاجیدے کی ناک میں دم کر دیا تھا۔ گھر میں نہیں رہنے دیتی تھی۔ ایک طرح تو بات اس کی بھی ٹھیک تھی۔ تم بتاؤ، ایک کمرہ آگے، ایک پیچھے، نہ کوئی صحن، نہ کمروں میں کوئی آڑ۔ بچیاں بھی جوان ہیں۔ بھاشیدے کا تو کچھ ڈھکا چھپا تھا نہیں۔ بڑی شرم کی بات تھی۔ اپنے گھر میں ہی قیدی بن کے رہ گئی تھیں سب۔ کون اٹھائے، کون دھلائے! آپا تو سمجھتی نہیں ہیں، میرے سر ہو رہی ہیں۔ کہتی ہیں، ولایتی کپڑے بھی تو رفیعہ ہی پہنتی رہی ہے۔ اور کچھ نہیں تو پچھلے کمرے کی دو چھتی میں رکھی پیٹی کے جاپانی سامان کو دیکھ لے — کس نے لا کے دیا تھا وہ سامان؟ محلے کی عورتیں بھی انھی کے ساتھ ہیں۔ دیکھو، کون بات کرے اور کیسے کرے۔'' استانی جی نے اکبر کے ادھورے جملے کو گویا سنا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی پریشانی میں تھیں۔ ''اچھا پتر، تو بوتل پی، میں اندر جاتی ہوں۔ یہ مسئلہ ایسے حل ہونے والا نہیں۔'' چھوٹے لڑکے کو بوتل پکڑے اندر آتے دیکھ کر استانی جی اٹھیں اور میزبانی کی رسم نبھا، محلے داری کا فریضہ ادا کرنے چل دیں۔ اکبر نے بوتل اسی لڑکے کے ہاتھ میں رہنے دی اور خود منیرے تیلی کے جملے کا سرا پکڑے پھر گلی میں نکل آیا۔

شوکت کی سربراہی میں محلے داروں کا وفد چوک سے نکل کر گلی کے آدھ میں پہنچ چکا تھا، جب اپنے دھیان میں گم اکبر نے منیرے تیلی کو دیکھا۔ اب پلٹنے کا مطلب اپنی پکڑ کی کمزوری کا اعتراف کرنا تھا، اس لیے وہ آگے بڑھ کر ان میں شامل ہو گیا۔ شوکت نے اسے دیکھا ضرور اور ایک مطمئن سا سانس بھی بھرا، لیکن کہا کچھ نہیں۔ یوں بھی وہ جانتا تھا کہ زیادہ بولنا کمیوں کا کام ہے جنھیں ہر بات کی صفائی پیش کرنے کی عادت ہوتی ہے؛ چودھری تو بس آنکھ کے اشارے سے کام لیتا ہے اور اگر وہ بولنے پہ آ جائے تو پھر کوکتی کوئل بھی اپنے کالے پر سمیٹ کر آم کے بُور میں چھپ جاتی ہے۔ اس نے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے اپنی اٹھی مونچھ کو سہلایا۔ اب اس کے پاس مربعے نہیں تھے تو کیا ہوا۔ شہر کی تقریباً ہر نئی بستی میں اس کے پاس ایک دو خالی پلاٹ تھے۔ کچھ کچے پکے مکان بھی اس نے رشتے داروں کے نام سے لے رکھے تھے جن کا کرایہ ہر مہینے وہ سود پر ضرورت مندوں کو دے دیتا تھا۔ پھر علاقے کا ناظم اس کا پکا دوست تھا۔ پچھلے الیکشن میں سارے پیسے اسی نے تو لگائے تھے۔

Scanned with CamScanner

ووٹروں کو پولنگ سٹیشن تک لانے کے لیے اس نے اس روز اپنی ساری گاڑیاں بھی منگوا لی تھیں جو دوسرے دنوں میں شہر اور شہر سے باہر کی سڑکوں پہ دوڑتی رہتی تھیں۔ اس کے پاس مربعوں سے زیادہ کچھ تھا۔ بیوی بچے بہت کہتے تھے کہ یہ محلہ چھوڑ کر امیروں کے کسی علاقے میں بسا جائے۔ اس کی بیوی کو کسی نے کہا تھا کہ اس علاقے میں بچوں کے اچھے رشتے ملنا ناممکن ہے۔ شہروں میں لوگ گھر بار دیکھتے ہیں، علاقہ دیکھتے ہیں۔ ان کی ضد پر اس نے ڈیفنس میں دو دو کنال کا جوڑا پلاٹ لے کر ایک شاندار گھر بھی بنوا لیا تھا۔ اب وہ سب وہیں رہتے تھے۔ شوکت بھی کچھ عرصہ اُدھر رہا، پھر اسے اپنا پرانا محلہ یاد آنے لگا تھا۔ وہاں جب وہ اپنے گیٹ سے باہر نکلتا تو چوکیدار کے سوا کسی کا ہاتھ اس کے سلام کو نہیں اٹھتا تھا، کوئی بڑھ کر اس کے پجنے کی سلوٹ دور نہیں کرتا تھا اور وہ کسی کی گدی پر ہاتھ جما کر اسے ماں بہن کی گالی نہیں دے سکتا تھا۔ وہاں سب نوگزے ہوں نہ ہوں، لگتے ضرور تھے۔ وہ اپنے دس مرلے کے پکے ٹائل لگے تین منزلہ مکان میں واپس آ گیا۔ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ جا کر راشن پانی کا خرچہ بھی دے آتا اور بیوی بچوں سے بھی مل لیتا۔ بچے بھی مست، وہ بھی راضی۔ اس نے سر کے اشارے سے گویا اکبر کو وفد میں شمولیت کی اجازت دے دی۔

اچھو پہلوان کی دکان سے چلنے والا چھوٹا سا قافلہ، قبرستان کی باہری دیوار سے جڑ کے بنی مسجد یا حبیب اللہ تک پہنچتے پہنچتے، اچھا خاصا جلوس بن چکا تھا۔ شوکت چاچے نور محمد کا ہاتھ کب کا چھوڑ چکا تھا اور بالکل کسی سیاسی رہنما کی طرح، جو اپنے مخالف کو خفیہ طور پر مرعوب کرنے اور اپنی شان دکھانے، حواریوں سمیت اس کے علاقے میں بے دھڑک گھستا چلا آ رہا ہو، تیز تیز قدم اٹھاتا، مسجد کی طرف بڑھا جاتا تھا — کسر تھی تو صرف یہ کہ اس کا سینہ پھولوں کے ہاروں سے چھپا ہوا نہیں تھا۔

محلے میں شیدے کی خبر تو پھیل چکی تھی۔ چوک سے نکل کر، مسجد تک جاتے ہوئے، راستے میں جس کو بھی پتا چلا کہ مولانا صاحب کے پاس اس معاملے کے سلجھاؤ کی خاطر جایا جا رہا ہے، وہ ساتھ ہو لیا۔ گھروں کے باہری کمروں میں بنی چھوٹی چھوٹی کریانے کی دکانوں کے مالکوں میں سے بھی بعض نے اپنے بچوں میں سے کسی کو بلا، دکان پر بٹھایا اور خود دین و آخرت کی کامیابی کا نسخہ پانے جلوس میں شامل ہو گئے تھے۔ ایک دو گلیوں سے، کرکٹ کھیلنے میں مصروف چند لڑکوں کو بھی جوش آیا اور وہ بھی اپنے گیند بلے ہاتھ میں لیے یوں ساتھ ساتھ چلنے لگے جیسے مسجد کا نہیں، میدانِ جنگ کا ارادہ ہو۔

Scanned with CamScanner

مسجد والی گلی خاصی کھلی تھی۔ مرکزی بازار سے شروع ہو کر یہ گلی مسجد پر ختم ہوتی تھی۔ یہیں سے ایک اور گلی داہنے ہاتھ نکلتی تھی، جس کے ایک طرف گھروں کی قطار اور دوسری جانب قبرستان کی دیوار تھی۔ یہ دوسری گلی تھوڑی دور جا کر مرکزی شاہراہ سے مل جاتی تھی۔ اس جلوس کی وجہ سے یہ کھلی گلی کچھ تنگ تنگ دکھنے لگی۔ مرکزی شاہراہ سے مڑنے والے دو چار موٹر سائیکل سواروں کو جنازے کا شائبہ ہوا اور انھوں نے احتراماً اپنی سواری کی رفتار کم کر لی، ایک آدھ تو سواری سے اتر کر کھڑا بھی ہو گیا، لیکن جب جلوس ان کے قریب سے گزرتا گیا اور اخیر میں کچھ کم رفتار بوڑھے رہ گئے اور کندھوں پر کسی میت کی کوئی چارپائی نظر نہ آئی تو وہ مایوسی سے سر ہلاتے اپنی سواریوں کی رفتار یکدم بڑھا کر پیچھے رہ جانے آہستہ خرام بوڑھوں کی منتشر سی ٹولی کے بیچ میں سے نکلتے چلے گئے۔ مسجد کے اونچے محرابی مرکزی دروازے تک پہنچتے ہوئے شوکت کے تیز قدم کچھ دھیمے پڑ گئے۔ خورشید تیزی سے آگے بڑھا اور مسجد کے زینے چڑھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے بلا جھجکتے ہوئے دولڑ کے بھی اندر داخل ہوئے۔

''السلام علیکم!'' خورشید نے آخری زینہ چڑھتے ہی بآوازِ بلند گویا شوکت کی آمد کی اطلاع دی۔ دروازے کے ساتھ کی دیوار میں جوتے رکھنے کا باقاعدہ انتظام موجود تھا لیکن مرکزی راستہ چھوٹی چھوٹی چپلوں، پھٹے پرانے بوٹوں اور ٹوٹے یا کئی بار کے گانٹھے ہوئے چمڑے کے کھسّوں کی بے ترتیب ڈھیریوں سے اٹا ہوا تھا۔ خورشید نے اپنی چپل اتار کر ہاتھ میں تھامی اور پاؤں سے ایک آدھ ڈھیری کو کھسکا کر شوکت کے کھڑے ہونے کی جگہ بنا دی۔ اسی اثنا میں شوکت بھی داخل ہوا تو خورشید نے لپک کر اس کے جوتے اتارنے میں اس کی مدد کی اور اس کے جوتے، اپنی چپلوں پر رکھ کر، بغل میں دبا لیے۔

مسجد کے اندر کئی بچے دورویہ قطاروں میں، شلوار قمیض پہنے، چوکڑی مارے، گود میں سپارہ اور سر پر ٹوپی رکھے، اونچے نیچے سروں میں مبہم الفاظ رٹ رہے تھے۔ انھوں نے اتنے بہت سے افراد کو اذان کے بغیر اندر آتے ہوئے دیکھا تو کچھ حیرت زدہ سے ہوئے، لیکن ان کی رٹائی میں خلل نہیں آیا۔ بچوں کی پڑھائی پر کم اور نگرانی پر زیادہ مامور نوجوان اٹھ کر تیزی سے ان کی طرف آیا اور بڑے احترام سے شوکت کا ہاتھ پکڑ کر مہمانوں کے حجرے کی طرف لے گیا۔

شوکت کو کچھ مایوسی سی ہوئی۔ ''مولانا صاحب کے دیدار کب نصیب ہوں گے؟ معاملہ کچھ

Scanned with CamScanner

گمبھیر ہے، فوری توجہ کا طالب،'' حجرے میں پہنچنے سے بھی پہلے شوکت نے نوجوان سے پوچھ لیا۔

''آپ تشریف رکھیے۔ حضرت کو آپ کی آمد اور مسئلے، دونوں کی خبر ہے۔ مجھے آپ کی خدمت پر مامور کرنے کے بعد سے وہ اسی سلسلے میں مصروف ہیں۔ ابھی جلوہ افروز ہوتے ہیں،'' نوجوان نے، جس کی ابھی مسیں بھی پوری طرح نہیں بھیگی تھیں، نہایت بزرگانہ انداز میں شوکت کو جواب دیا، اور واپسی کی اجازت چاہی۔

شوکت نے آگے بڑھ کر بیٹھنے کے لیے مناسب مقام کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ حجرہ کیا، اچھا خاصا ہال کمرہ تھا۔ چھت پر لاثانی کی شیشوں کا آرائشی کام تھا اور مناسب روشنی کے انتظام سے کمرے میں مقدس نور پھیلا ہوا تھا اور فرشی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ فرش پر خوبصورت، دیدہ زیب مخملی قالین بچھے تھے، جن پر مناسب فاصلے سے گاؤ تکیے اور دبیز کشن رکھے تھے۔ ایک طرف زمین سے قریب دو فٹ اونچا، سات فٹ چوڑا چبوترہ سا تھا، جس کی آرائش اور آسائش میں خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ شوکت کو بیٹھنے کے لیے مناسب مقام مل گیا۔ جیسے ہی شوکت چبوترے کے قالین پر بیٹھا، اس کے سب ساتھی بھی فرش پر بیٹھ گئے۔ زیادہ تر نے چبوترے کے قریب ترین جگہ پسند کی، البتہ چاچے نور محمد کو شوکت نے خود آواز دے کر اپنے ساتھ بٹھالیا تھا، کہ آخر بزرگی کا بھی کچھ وقار ہوتا ہے۔

کمرے کی دیواروں سے سیمنٹ کی مہک آرہی تھی، اور تازہ پلستر پر کیے رنگ روغن میں یوں تو ابھی نئے پن کی چمک باقی تھی لیکن کچھ اکھڑا ہوا سا محسوس ہوتا تھا جیسے پلستر کو مناسب وقت تک دھوپ نہ لگنے دی گئی ہو۔ ''یہ حجرہ نیا بنا ہے؟'' منیرے تیلی نے خاصی اونچی آواز میں نہ جانے کس سے پوچھا۔ منیرا تیلی چھوٹی عید کے بعد اب مسجد آیا تھا، اور عید پر بھی اسے صحن میں جگہ ملی تھی۔ یہ تو شوکت صاحب کا ساتھ تھا جس کی وجہ سے ان میں سے اکثر کو پہلی مرتبہ مہمانوں کے حجرے کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔

''دو تین مہینے ہوئے ہیں،'' قدیر مستری نے خود کو منیرے کا نامعلوم مخاطب قرار دیتے ہوئے جواب دیا۔ پھر ایک ثانیے کو خاموش ہو کر مدھم مگر واضح سرگوشی میں کہا،'' قبرستان کی دیوار توڑ کر مسجد کو بڑھایا گیا ہے۔''

قدیر مستری کی بات سن کر، گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے شوکت کو سردی سی محسوس ہوئی اور وہ یوں

Scanned with CamScanner

سیدھا ہوا کہ جیسے گاؤ تکیے سے نہیں، کسی کچی قبر کی ڈھیری سے ٹیک لگائے ہوئے ہو۔

''قبرستان بھی اللہ کا، مسجد بھی اللہ کی۔ یہ تو بہت اچھا ہوا ہے۔ خالی پڑی زمین پر سجدے ہوں، اس زمین کے تو بھاگ کھل گئے ہیں، ورنہ نہ جانے کس کس کی گلتی ہڈیاں یہاں ہوتیں، کیڑے کلبلاتے، اور کن بدبختوں کے اعمال کا عذاب ان کے ساتھ ساتھ یہ زمین بھی بھوگتی۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں، قبر میں جب کسی مردے پر عذاب آتا ہے تو دھرتی بھی کانپتی ہے...'' ان کی خاطر کے لیے بڑے سے تھال میں رکھے مٹی کے کٹوروں میں شربت لیے، اندر داخل ہوتے ہوئے جوان مولوی نے بھی قدیر مستری کی بات سن لی تھی، اس لیے رعب دار لہجے میں جواب دیا۔

''ہاں جی ہاں، میں تو خود یہاں تھا جی جب تب... زمین صاف کی گئی تھی جی،'' گھبراہٹ کے باوجود قدیر نے پھسلتی زبان کو بروقت قابو کر لینے پر سکھ کا سانس لیا۔

جوان نے مسکرا کر اسے دیکھا اور سب کو شربت کے کٹورے پیش کرنے لگا۔ ہاتھ میں نقرئی تھال تھامے، سرخ شربت سے لبالب شیشے کا نازک سا جگ اور چند گلاس لیے ایک اور جوان مولوی سیدھا چبوترے کی طرف گیا تھا، وہ تعظیماً ذرا سا جھکا اور شوکت کو شربت کا گلاس پیش کیا۔ شوکت نے گلاس لے کر پاس بیٹھے چاچے نور محمد کی طرف بڑھا دیا اور خود دوسرا گلاس اٹھا لیا۔ نوجوان مولوی نے جگ اور بقیہ گلاس چبوترے پر ان کے درمیان رکھ دیے اور الٹے قدموں واپس ہونے لگا تو شوکت نے پوچھا،''مولانا صاحب زیادہ مصروف ہیں کیا؟ ابھی تک دیدار کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔''

نوجوان مولوی نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے کہ اتنے میں حجرے کے داخلی دروازے پر ہلچل سی مچی۔ اطمینان سے پاؤں پسار کر بیٹھے محلے دار چونکے ہو کر اپنی اپنی جگہ سے اٹھنے لگے۔ زیادہ تر نے اپنے ہاتھوں میں تھامے بھرے، ادھ بھرے کٹورے حجرے کی دیوار کی جڑ کے ساتھ، فرش پر رکھ دیے تھے اور دروازے کی طرف لپک گئے تھے۔ ہجوم کی وجہ سے جن کو دروازے پر جانے کا موقع نہ مل سکا وہ کچھ حسرت آمیز بے تابی سے، اچک اچک کر، لوگوں کے سروں کے اوپر سے، مولانا کی ایک جھلک کے متلاشی ہوئے۔ شوکت نے دو تین بڑے بڑے گھونٹ لے کر گلاس خالی کیا اور اٹھ کر چبوترے سے نیچے اترا۔ قدیر مستری، جو چبوترے کے قریب کھڑا تھا اور جسے آگے جانے کا موقع نہیں ملا تھا، اس کی نظر چبوترے سے اترتے شوکت پر پڑی تو اس نے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور اپنے

Scanned with CamScanner

آگے کھڑے دو تین لوگوں کے کاندھے پر تھپکیاں دے کے اور دو چار کو اِدھر اُدھر دھکیل کر شوکت کے گزرنے کے لیے جگہ بنائی۔ باقیوں کو بھی احساس ہوا اور مولانا صاحب اور شوکت کے درمیان ایک راستہ سا بن گیا۔ دست بوسی کے لیے بے تاب لوگوں کی طرف بزرگانہ شفیق بے نیازی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے مولانا صاحب پُر تمکنت انداز میں دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ تین نوجوان، خوبصورت لڑکے، سفید شلوار قمیض پہنے، شلواریں ٹخنوں سے اونچی کیے، سر پر پنج پلی ٹوپی اوڑھے، مولانا کو لوگوں کی زیادہ قربت سے پوشیدہ طور پر محفوظ رکھتے، ان کے ہم قدم تھے۔ گوری، صحتمند، بھری ہوئی گول پنڈلیوں کو چھپانے میں قدرے ناکام مولانا صاحب کا لمبا، ڈھیلا لبادہ ان کے جسم پر بہت جچ رہا تھا۔ لبادے پر سیاہ عبا، جس پر سنہری زردوزی کی نازک سی بیل لشکارے مار رہی تھی؛ کاندھوں پر سنہری رومال، جس کا ایک حصہ سر کو بھی ڈھانپے ہوئے تھا، اور رومال کے نیچے، سر پر بل والی نیچی سیاہ پگڑی؛ پگڑی سے نکلے، کندھوں کو چھوتے، مہندی سے رنگے سرخ بالوں کی لٹیں، اور اسی کی ہم رنگ، پیٹ کے بالائی ابھار تک دراز سرخ گھنگھریالی ڈاڑھی۔ شوکت مولانا صاحب سے کچھ مرعوب سا ہوا لیکن اس نے بروقت خود کو یاد دلایا کہ اس وقت وہ سرپنچ کی حیثیت سے مسجد میں آیا ہے۔ اس کے بڑھتے قدم کچھ سست ہو گئے۔

مولانا نے شوکت کو دیکھا تو گرمجوشی سے دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ ''مرحبا مرحبا ملک صاحب۔ آپ تشریف لائے، کیا خوب!''

شوکت بڑھ کر مولانا سے بغل گیر ہوا۔ تین مرتبہ گالوں سے گال چھونے کے بعد وہ چبوترے کی طرف چلے گئے۔

''حضرت، بہت انتظار کرایا آپ نے!'' جب سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور پنچایت کا ماحول سا پیدا ہو گیا تو شوکت نے شکوہ کیا۔

''بس ملک صاحب، ہم معذرت خواہ ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں، ہم اشراق کے بعد کچھ وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ زندگی فانی ہے اور یہ بندہ بہت گنہگار۔ ساری عمر کے بعد اب احساس ہوا ہے۔ یہ بھی اسی کی توفیق ہے کہ آخری سانس سے پہلے دنیا کی ناپائیداری کھول دی اس مالک نے۔ آج صبح کی خبر نے ویسے بھی جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ سفاکی، اللہ، سفاکی!'' مولانا کی آواز

بھرانے لگی۔ ایک خلیفے نے بڑھ کر سوتی رومال پیش کیا جسے مولانا نے آنکھوں پر لگالیا۔ ایک آدھ لمحے کے بعد مولانا گویا ہوے، ''اشراق کے وقت خبر ملی، اسی وقت خصوصی دعا اور وظائف کا اہتمام کرایا ہم نے۔ تب سے مدرسے کے سب بچے آیاتِ سکینہ کا ورد کر رہے ہیں۔ ہم نے بھی استخارے کی خاطر خود کو گوشۂ خاص میں بند کرلیا تھا۔ وظائف کے بعد سے اب تک حکم کے انتظار میں تھے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔''

مولانا بدستور محوِ گفتگو تھے۔ شوکت کو ان کی ڈاڑھی کے گھنگھریالے بالوں میں کوئی چیز چمکتی محسوس ہوئی، جیسے روٹی کے ذرے، لیکن وہ ایسے چکنائی زدہ نہیں ہوتے... شاید پراٹھے کا کوئی حصہ، ان کا رنگ بھورا ہوتا ہے... شاید پُوڑی کے ریزے—— وہ طے نہیں کر پایا تھا۔

''بس اسی میں دیر ہوگئی، ورنہ آپ کو انتظار کی زحمت دینا ہرگز منظور نہیں۔ مولانا صاحب دنیاداری ترک کر چکے ہیں۔ بس وہ خلیفہ جو دینی علوم میں بہت مہارت حاصل کرلیں، انھی کو منزلِ آخر تک پہنچانے کی کاوش میں لگے رہتے ہیں۔ اب تو آپ امامت بھی نہیں کراتے، صرف عیدین پر یا بڑے میلاد پر دیدارِ عام بخشتے ہیں،'' مولانا کے خاموش ہوتے ہی خلیفۂ خاص نے مودبانہ انداز میں کہا۔ ''مولانا کو بہت دکھ تھا اس خبر کا۔ جب صبح کا کے نعمان نے ہمیں یہ خبر سنائی، ہماری فہم ناقص میں کچھ نہیں آیا، تو حضرت کا در کھٹکھٹایا۔ حضرت نے شرفِ بازیابی بخشا تو رخِ انور پہ نگاہ پڑتے ہی اندازہ ہوگیا کہ حضرت کو کشف ہو چکا ہے۔ آپ کا چہرۂ مبارک متغیر تھا، لیکن آپ نے ہم سب کو صبر کی تلقین کی تھی۔''

''ابھی آپ لوگوں کی تشریف آوری سے پہلے انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں آپ کی میزبانی کروں جب تک حضرت اللہ کے حکم کا انتظار کرتے ہیں،'' خلیفۂ ثانی نے بھی اپنی رائے کا اظہار ضروری سمجھا تھا۔

اس اثنا میں مولانا صاحب، منقش یاقوت کی تسبیح پر نہ جانے کن آیات کا ورد کرتے ہوے، عالمِ استغراق میں جا چکے تھے۔ شوکت کو پکارنے میں کچھ ہچکچاہٹ محسوس ہوئی—— کسی اور میں تو یہ ہمت نہیں تھی کہ مولانا، پیر و مرشد، افضل السالکین حضرت عارف الٰہی مدظلہٗ کے استغراق میں مخل ہونے کا گمان بھی کر سکیں۔

Scanned with CamScanner

''وہ تو ٹھیک ہے پر یہ دنیا کا نہیں، دین کا مسئلہ ہے۔ اللہ کے ایک عاجز بندے کا سوال ہے، خلیفہ جی۔ اب ہم مولانا کے پاس نہ آئیں تو کہاں جائیں؟ یہی تو سمجھا سکتے ہیں اسے۔ خون کا لحاظ ہی کر لے وہ!'' شوکت نے ذرا سا لہجہ بلند کر کے بظاہر خلیفۂ اول کو سنایا۔

مولانا صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ ''بجا فرمایا ملک صاحب، ہمیں بھی یہی حکم ہوا تھا۔ اسی لیے تو ہم آپ سے ملاقات کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ کو شاید علم نہیں اس جیدے کی حرکات کا۔ اسے اللہ کے گھر کی حرمت کا احساس نہیں، وہ اللہ کے بندوں کا کیا احساس کرے گا۔ ہم تو مایوس ہیں اس سے۔ اس سے پہلے بھی ہم بذاتِ خود اس کو سمجھا چکے ہیں۔'' اتنا کہہ کے مولانا پھر خاموش ہو گئے۔

فرش پر بیٹھے مدرسے کے طالب علم زاہد نے خلیفہ کی آنکھ کا نا معلوم اشارہ پا کر جوش سے کہنا شروع کیا، ''دو مہینے پہلے جب بڑی گیارھویں شریف کا ختم تھا مسجد میں، تو بڑا رش تھا یہاں۔ آدھی رات تک میلاد ہوتا رہا۔ پھر دیگیں کھلیں۔ تہجد سے ذرا پہلے فرصت ملی۔ خلیفہ جی نے حکم دیا کہ سب جلدی جلدی تھوڑی نیند لے لیں، ورنہ تہجد جائز نہیں ہوگی۔ ہم سب جہاں تھے، وہیں لیٹ گئے۔ باہر کا بڑا دروازہ بھی کھلا رہ گیا۔ صبح جب میں اٹھا تو صحن میں کوئی پڑا تھا۔ پہلے تو میں نے دھیان نہیں دیا، سب کو اٹھانا تو اس کو بھی جا کے ہلانے لگا۔ بس جی، منہ سے چادر جو کھینچی تو میری تو چیخ ہی نکل گئی۔ میں نے سمجھا کوئی بندہ مار کر اِدھر پھینک گیا ہے۔ بھاگا بھاگا خلیفہ جی کے پاس پہنچا۔ یہ آئے، دیکھا کہ بندے کی سانس چل رہی ہے، شکر کیا اللہ تعالیٰ کا جی۔ بابے کو تو کوئی سہانتا نہیں تھا، اوپر سے تہجد کا وقت بھی نکلا جا رہا تھا... خیر، بابے کو کھینچ کھانچ ایک طرف کیا۔ فجر ویلے محلے کے بابے آنے لگے تو انھوں نے پہچانا۔ اتنی دیر میں اس بابے نے پوری مسجد پلید کر دی۔ بدبو الگ، ہائے ہائے الگ۔''

''اس وقت ہمیں مولانا صاحب کو زحمت دینی پڑی،'' اب خلیفہ نے زاہد کی بات اچک لی۔ ''سب نمازی بہت پریشان تھے۔ اللہ کا گھر ہے جی، کوئی خیراتی ہسپتال تو نہیں۔ چپ چپیتے بندہ پھینک جاؤ، ایسا تو اُدھر بھی نہیں ہوتا، وہاں بھی ذمہ داری لینی پڑتی ہے۔'' سب کو ہیٹر کی بات یاد آئی۔ ''کوئی ہبی نبی (اونچ نیچ) ہو جائے تو؟''

مولانا ایک دفعہ پھر عالمِ حیرت سے باہر آئے اور بولے، ''اس بیچارے کی حالت دیکھ کر ہم نے چاہا کہ ہم اس کی خبر گیری کریں۔ اس دن بھی مجھے دنیا نے الجھا لیا۔ مسجد کمیٹی کا اجلاس بلوایا۔ آپ

Scanned with CamScanner

ان دنوں محلے میں نہیں تھے، اس لیے آپ کو شاید اس اجلاس کی خبر نہ ہوئی۔ خیر، مسجد کمیٹی کا متفقہ فیصلہ تھا کہ جیدا اپنے بھائی کی نگہبانی کا حق جس طرح ادا کر سکتا ہے، کوئی اور نہیں کر سکتا۔ ہم کچھ بھی کر لیں، خون کا رشتہ تو جیدے کے ساتھ ہے۔ چلو، بندہ بشر ہے، گناہ کبیرہ کا بھی مرتکب ہو سکتا ہے، معافی کا در تو کھلا چھوڑنا چاہیے نا۔ پھر ہم نے بھی سوچا کہ جیدے کو توبہ کا موقع نہ دینا سخت ناانصافی ہوگی۔ قیامت کے روز جب اس پر عذاب آئے گا تو یہ ہم سے شکایت کرے گا کہ ہم جانتے تھے اور ہم نے سمجھایا نہیں۔ اسی لیے ہم نے جیدے کو بلوایا، دو گھنٹے مسجد کا حرج کر کے اسے سمجھایا۔ بتایا کہ اللہ باری تعالیٰ اپنا حق معاف کر دیتا ہے، اپنے فرض میں کوتاہی برداشت کر لیتا ہے، اپنے بندے کا حق معاف نہیں کرتا۔ قیامت کے دن اپنے بھائی سے حق کیسے بخشوائے گا؟ اس سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کو واپس لے جائے، توبہ کرے اور اس کی خدمت کر کر اللہ سے معافی کا خواستگار ہو۔ اللہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

مولانا پھر رقت زدہ ہوئے تو خلیفہ ثانی نے آگے بات کرنے کی ذمہ داری سنبھالی۔ "اس دن تو بہت روتا رہا، اپنی مجبوریاں بتاتا رہا۔ کہتا تھا، گھر میں بیوی صحیح طرح دیکھ بھال نہیں کر سکتی، بچیوں کو بھی تائے سے شرم آتی ہے، تنخواہ بھی بہت کم ہے، پورا نہیں پڑتا، پھل فروٹ کہاں سے لائے، دوا دارو کہاں سے کرے، اکیلی جان، سارا دن دفتر میں صاحب لوگوں کے لیے بھاگنا، گھر آ کر بابے کی خدمت کیسے کرے۔ ہم جانتے تھے کہ جان چھڑا رہا ہے۔ صاحب لوگوں کے لیے بھاگ سکتا ہے، بھائی کے لیے نہیں؟ لیکن ہم نے اللہ کے حکم کے مطابق پردہ پوشی کی اور اس کا عیب اسے نہ جتایا، یہاں تک کہ مسجد کمیٹی نے اسے پانچ ہزار روپیہ اسی وقت مسجد فنڈ سے نکال کر دیا تھا۔ لے گیا بابے کو مدرسے کے لڑکوں نے ریڑھی بھی لا دی۔ پھر ہفتے بعد دوبارہ آ کے رونے پیٹنے لگا۔ پیسے بٹورنے کا بہانہ بنا لیا تھا اس نے۔ کہتا تھا، بچیوں کی فیس بڑھا دی ہے سکول والوں نے، بڑی کا داخلہ بھجوانا ہے، سارے پیسے لگ گئے۔ اللہ معاف کرے، کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں! مسجد کی تو اپنی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ ہم یہاں بچوں کو تعلیم دیتے ہیں، تبلیغ کا کام کرتے ہیں، یہاں رہنے والے بچے اپنے گھروں کو تج کر آتے ہیں، ان کی بھی ساری ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ کھانا کپڑا..."

منیرے تیلی کے انہماک میں صبح شام روٹی اکٹھی کرنے والے مدرسے کے بچوں کی آواز نے

خلل ڈالا۔''لاحول ولا!''منیرے نے فوراً سر جھٹک کر خلیفہ ثانی کی بات سننے کی کوشش کی تھی۔

خلیفہ ثالث، جو ابھی پوری طرح مولانا کی خلافت کا اہل نہیں ہوا تھا، زیادہ دیر ضبط نہ کر سکا۔
''کافروں کی حکومت ہے ہم پر! کافروں کا کھاتے ہیں، اور دین کے نام پر روشن خیالی یاد آ جاتی ہے۔ اوقاف والوں سے جو ملتا ہے اس میں تو ایک وقت کی روٹی بھی پوری نہیں پڑتی۔ یہ تو سر پھرے ہیں جو دین کے لیے یہاں بیٹھے ہیں۔ ابھی مسجد کی توسیع کا معاملہ تھا۔ پچاس دفتروں کے چکر لگائے، بیسیوں افسروں سے ملاقاتیں کیں، تب جا کے بل منظور ہوا۔ اب ہم رشوت تو دیں گے نہیں۔ اللہ کے آسرے پر جہاد کرتے ہیں، دین کی خاطر۔ مسجد کمیٹی نہ ہو تو یہاں دیا جلانے کو تیل بھی نہ رہے۔''

شوکت کو یاد آیا کہ چھ مہینے سے مسجد کی بجلی کا خرچہ اس نے لے رکھا ہے، اور یہ بھی یاد آیا کہ اسی میٹر سے ایک موٹی سی تار مسجد سے ملحقہ مولانا صاحب کے آستانے میں بھی جاتی ہے، اور مولانا اور ان کے اہل خانہ کو گرمیوں میں ٹھنڈک اور سردیوں میں گرمائش کی سہولت پہنچانے کا سبب بنتی ہے — اب دنیاداروں پر ان خانہ نشینوں کا اتنا حق تو بنتا ہے۔ اس کے کندھے کچھ اور سیدھے ہو گئے اور اس نے مولانا صاحب کو براہ راست مخاطب کرنے کا فیصلہ کیا۔

''بس جی، خداخوفی ہی سب کچھ ہے۔ جتنا جس سے ہو سکتا ہے، وہ کرتا ہے، اسے کرنا چاہیے۔ دنیا ہی تو سب کچھ نہیں۔''

''بجا فرمایا ملک صاحب!''مولانا کو بھی شاید میٹر سے نکلتی تار یاد آ گئی تھی۔''آپ جیسے اصحاب سے ہی دین کی محفل میں رونق ہے۔ آپ تو ماشاللہ مسجد کمیٹی کے سب سے فعال رکن ہیں، دین کے کاموں میں سب سے آگے رہتے ہیں۔ آپ جیسے اصحاب کی وجہ سے ہی اس محلے پر عذاب نہیں آیا، ورنہ تو جو جیدے نے کیا، اللہ چاہے تو دھرتی پھٹ جائے، اور جیدا اپنی سنگدلی کے ساتھ اس میں دھنس کر رہ جائے؛''مولانا نے ایسی بھاری بھر کم آواز میں کہا کہ زمین پر بیٹھے سب افراد کو دھرتی ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ انھوں نے اپنے پہلو بدلے۔ بعضے بے اختیار اکڑوں بیٹھ گئے۔

دھرتی کی تھرتھراہٹ بند ہونے سے پہلے گاڑیوں کے تیز ہارنوں، چیختے ٹائروں کی بریک اور تیزی سے کھلتے بند ہوتے، گھسٹتے دروازوں کی آواز نے مولانا صاحب کو بھی چونکا دیا۔ زاہد پھرتی سے اٹھ کر باہر کی جانب لپکا اور اس سے پہلے وہ واپس آتا، ایک دو طالب علم ہانپتے کانپتے حجرے میں آ

گئے۔

''باہر ٹی وی والے آئے ہیں، بڑی بڑی گاڑیوں میں!'' دین کے نابالغ، نادان مجاہد اپنے شوق میں ادب کے قرینے بھول سے گئے۔

مولانا صاحب اور شوکت بیک وقت اٹھے۔ ان سے پہلے باہر جانے کے لیے پر تولتے محلے کے لوگ کھڑے ہو چکے تھے اور بمشکل ان کی روانگی تک خود کو روک رہے تھے۔ ان کے نکلتے ہی جملہ حاضرین، یہاں تک کہ مدرسے کے بیشتر بچے، نگرانوں سے لاپروا ہو کر باہر آ گئے۔

قبرستان کی باہری دیوار کے ساتھ تین چار بڑی بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں، ایک دو مرکزی شاہراہ سے اندر کی طرف مڑتی ہوئی بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ کئی ننگ دھڑنگ یا ناکافی لباس پہنے بچے، قمیض کا دامن چوستے، ایک ہاتھ سے ٹانگوں کے بیچ کھجاتے، متجسس نگاہوں سے ان گاڑیوں کے گرداگرد جمع تھے۔ نوجوان لڑکے، اپنی قمیص کا کالر ٹھیک کرتے، پشت سے ہاتھ اندر ڈال کر تنگ جینز کی پینٹ کو چوتڑوں پر ٹھیک سے چڑھاتے، جیب سے کنگھی نکال کر سنورے ہوئے بالوں کو مزید سنوارتے اور دھوپ کی سستی سی عینک لگا کر متوقع انداز میں کیمرے والوں کی طرف دیکھتے تھے۔ چاروں طرف سے بند کالے شیشوں والی ویگن نما ان گاڑیوں کے اندر کا احوال اسی وقت جانا جا سکتا تھا جب دروازہ کھلتا اور دھوپ سے سنولائے، پختہ چہروں والے جوان آدمی اندر سے باہر نکلتے۔

گاڑیوں سے نکل کر کیمرے اور مائیک تھامے کئی افراد قبرستان میں بکھر گئے۔ مولانا، شوکت اور ان کے ساتھیوں کو دیکھ کر چند ایک ان کی طرف بھی بڑھے۔ وہ سب اس واقعے کے عینی شاہدین سے بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ کچھ کیمرے قبرستان کے سامنے گھروں کی قطار کو فلمانے لگے۔ مولانا صاحب نے اپنا عمامہ درست کیا اور شوکت نے زور سے کھنکھار کر اپنی آواز میں بہتری پیدا کی۔ قبرستان جانے والوں میں سے ایک ٹولی کو بالآخر من چاہا منظر مل گیا۔ کیمرامین نے ہاتھ میں تھاما کیمرا کندھے پہ رکھ کر چالو کیا۔ سرخ رنگ کی جلتی بجھتی بتی نے افضل وڑائچ کو گویا اشارہ کیا اور وہ ہاتھ میں مائیک تھامے سنسنی خیز لہجے میں کہنے لگا:

''ناظرین، انسانی بے حسی کی ایک اور مثال! ایک بھائی اپنے بوڑھے معذور بھائی کو زندہ قبرستان میں پھینک گیا۔ دیکھیے، اس شخص کی بے بسی اور اس کی اذیت کا اندازہ کیجیے جس کو جیتے جی

قبرستان کی مٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ دیکھیے اور سوچیے، اس شخص کی حالت کا ذمہ دار کون— خون کا رشتہ یا حکومت کی نا اہلی؟''

آخری جملہ بولتے ہی اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ کیمرے والے نے، وسعت بڑھاتے ہوئے، قبرستان کا ایک لمبا، کھلا منظر قید کیا، پھر آہستہ آہستہ منظر، کچی قبروں کے بیچ میں رکھی شیدے کی منجی تک محدود ہو گیا۔ اور زوال آمادہ سورج سوچتا رہا کہ اس منجی کو یہاں تک پہنچانے والے، جیدے کے علاوہ، باقی کندھے کن کے تھے۔

❊❊

صائمہ ارم نے 2011 میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، سے اردو میں پی ایچ ڈی کیا اور اسی ادارے کے شعبۂ اردو میں تدریس سے منسلک ہیں۔ کہانیاں لکھنا انھوں نے حال ہی میں شروع کیا ہے۔ اس کے علاوہ نظمیں اور مضامین لکھتی رہتی ہیں اور ترجمے بھی کرتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

جعفر زٹلی

زٹل نامہ

(کلیات)

مرتب: رشید حسن خان

قیمت: 300 روپے

اردو زبان اور ادب کے تاریخ نگاروں نے دو بڑی غلط فہمیوں کو رائج کر رکھا ہے: ایک یہ کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا، اور دوسری یہ کہ شروع ہی سے غزل اردو شاعری کا اصل سرمایہ رہی ہے۔ جعفر زٹلی اور ولی دکنی کا تعلق ایک ہی زمانے سے ہے، اور زٹل نامہ کے عنوان سے جعفر کا دیوان ولی کے دہلی آنے سے برسوں پہلے مرتب کیا جا چکا تھا۔ جعفر کے کلیات میں ایک بھی غزل نہیں۔ اس طرح یہ بات مسلّم ہو جاتی ہے کہ دہلی میں اردو کی شعری روایت کی بنیاد رکھنے والوں میں جعفر کو اولیت حاصل ہے، اور یہ بھی کہ دہلی میں اردو شاعری کا آغاز غزل گوئی سے نہیں، سماجی حقیقت نگاری سے معمور شاعری سے ہوا جو سرتاسر نظموں پر مشتمل ہے۔

جعفر زٹلی کا کلام ایک طرف شمالی ہند میں ارتقائے زبان کی پہلی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے، اور دوسری طرف سماجی مسائل و مشکلات کے پُرزور اور پُرشور بیان کے لحاظ سے وہ اردو کا اولین شاعر ہے جس نے اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے۔ کلامِ جعفر کی یہ بڑی اہمیت ہے کہ اس کی بنیاد پر اردو زبان اس پر فخر کر سکتی ہے کہ شروع ہی سے اردو شاعری میں سماجی مسائل و مشکلات کا بے لاگ بیان موضوعِ سخن کے طور پر ملتا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے لہجے میں بے باکی ہے اور کھردرا پن۔ جعفر اس روایت کا بنیاد گزار ہے۔ بگڑتے ہوئے سیاسی حالات، بیکاری، بد نظمی، افلاس، ان سب کے ہلکے گہرے بیانات اس کی شاعری میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ وہ با اقتدار افراد جن کے نکمے پن کے نتیجے میں یہ حالات پیدا ہو رہے تھے، ان کا نام لے کر ان کو اس کا ذمے دار کہنا، یہ صاف گوئی اور بے باکی بھی اس شاعری کا حصہ رہی ہے۔ وہ زمانہ مطلق العنان شخصی حکومت کا تھا، آج کل جیسی جمہوریت کا نہیں تھا، اُس زمانے میں واقعتاً بات پر زبان کٹتی تھی: ایسے زمانے میں یہ بے باک بلند گفتاری داد کے قابل ہے۔ دورِ اول کی اس روایت نے، جس کا سب سے بڑا نمائندہ جعفر ہے، ایک بڑا کام یہ بھی کیا کہ اس کے اثر سے لسانی سطح پر اُس کھردرے پن نے فروغ پایا جس کے بغیر احتجاجی شاعری سرسبز نہیں ہو پاتی: لہجے کے بھاری پن کو برقرار رکھا، پُرشور لفظیات کا ذخیرہ فراہم کیا، بیان کو ریشمی پن سے محفوظ رکھا اور اُس آہنگ کی تشکیل کی جو رومانیت سے دور ہے۔

جعفر زٹلی کا کلام شمالی ہند میں ارتقائے زبان کی ابتدائی شکل صورت کو پیش کرتا ہے۔ اس میں 'ریختہ' کی ابتدائی مثالیں محفوظ ہیں اور لفظیات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جس کو ادب، زبان، لغت اور لسانیات کا کوئی سنجیدہ طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا۔

Scanned with CamScanner

ہوانگ سُن وون (Hwang Sun-won) کا شمار کوریا کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کا زمانۂ حیات 1915۔2000 ہے۔ اس کی تصنیفات میں سو سے زائد کہانیاں، سات ناول اور دو شعری مجموعے شامل ہیں۔

اس کے اوائل عمر میں کوریا جاپان کے قبضے میں تھا۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی شکست کے نتیجے میں کوریا کو کسی سخت جد و جہد کے بغیر استعمار سے آزادی نصیب ہوئی۔ لیکن اس کے فوراً بعد داخلی نظریاتی تنازعوں، خانہ جنگی اور بیرونی مداخلت کی وجہ سے یہ ملک بڑی خونریزی اور برادر کشی کے تاریک دور سے گزرا، اور آخر کار دو ملکوں (شمالی اور جنوبی کوریا) میں بٹ گیا۔ سُن وون نے جنوبی کوریا میں رہائش اختیار کر لی۔ یہاں بھی آزادی کے بعد کی چار دہائیاں طرح طرح کے ہنگاموں کی نذر ہو گئیں، بالخصوص جمہوریت اور آمریت کا تصادم، زرعی معیشت سے صنعتی معیشت تک تبدیلی، دیہی علاقوں سے شہروں کی طرف وسیع پیمانے پر ہجرت، اور ان سب سے منتج معاشرتی انقلابات۔ سُن وون کے اکثر موضوعات اسی قسم کے خلفشار سے کوریائی زندگی پر پڑنے والے اثرات سے متعلق ہیں۔ مگر کوریائی حالات کے پس منظر میں وہ عمومی انسانی قدروں پر قلم اٹھاتا ہے۔ وہ آشوبِ زمانہ سے متاثر افراد پر ٹوٹی ہوئی آفتوں کا یکساں ہمدردی اور غیر جانبداری سے ذکر کرتا ہے، خواہ ان افراد کا روایتی طور پر شمار 'اچھے' لوگوں میں ہو یا 'برے' لوگوں میں!

زیرِ نظر کہانی، جس کے انگریزی ترجمے کا عنوان Booze ہے، 1945 میں شائع ہوئی تھی۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک جفاکش اور باضمیر، غریب آدمی ہے جو ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے، اور دل سے فیکٹری کا خیر خواہ اور وفادار ہے۔ سیاسی انقلاب کی وجہ سے فیکٹری کے انتظام کے لیے کشمکش شروع ہوتی ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کی تگ و دو میں اس آدمی کے کردار میں رفتہ رفتہ تنزل ہوتا ہے اور اس کی شخصیت بالکل بدل جاتی ہے۔ کہانی اس حقیقت کی ترجمان ہے کہ انسانی کردار بذاتِ خود بہت غیر مستحکم ہے، اور خارجی اثرات میں اتنی طاقت ہے کہ اچھے سے اچھا انسان بھی اپنی صفات اور قدروں کو آسانی سے کھو سکتا ہے۔

— کمال ابدالی

Scanned with CamScanner

ہوانگ سَن وون

انگریزی سے ترجمہ: کمال ابدالی

حاصل کشید

سوسونگ نی شہر کے ناکامورا کشید خانے پر جیسے ہی نئی حکومت کا قبضہ ہوا، چنہو کو اس کشید خانے کا منتظم بنا دیا گیا۔ عمر اور تجربے کے لحاظ سے چنہو اس عہدے کے لیے سب سے موزوں آدمی تھا۔ اس نے ساری عمر یہیں کام کیا تھا۔ پچیس برس کے لگ بھگ سن میں وہ ہرکارے کے طور پر ملازم ہوا تھا، اور اب چالیس برس کی پختہ عمر میں صدر کلرک کا عہدہ پا چکا تھا۔ اس ترقی میں تعلیم کا دخل کم تھا کیونکہ بیچارے کی تعلیم اپنے دیہات کے اسکول میں صرف چینی زبان کی الف بے کا قاعدہ حفظ کرنے تک محدود تھی۔ مگر ہرکارے سے صدر کلرک تک کے پیشہ ورانہ عروج میں اس کی دوسری ذاتی صلاحیتیں کام آئی تھیں۔ سنی اور دیکھی ہوئی ساری باتیں فوراً اس کے ذہن میں اتر جاتی تھیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ غیر معمولی یکسوئی اور تندہی سے کام کرتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ کشید گھر چلانے کے سارے گر اس کو آ گئے تھے۔ کسی کے ذہن میں کشید خانے کی کسی بھی کارروائی کے بارے میں کیسا ہی کوئی سوال اٹھے، چنہو اس کا جواب جانتا تھا!

یہ بھی واضح رہے کہ 15 اگست 1945 کو واقع یوم آزادی کے بعد سے سابق مالک ناکامورا نے کشید خانے کے اثاثے لوٹنے کی جو کوششیں بھی کی تھیں وہ چنہو کی جانفشانی کی وجہ سے ناکام رہیں۔ بلکہ بال بچوں سمیت چنہو کشید خانے کے چوکیدار کے کمرے میں منتقل ہو گیا تھا، تاکہ وہ چوبیس گھنٹے وہاں کی عمارتوں کی نگہداشت کر سکے۔

Scanned with CamScanner

ناکامورا کشید خانے کا سب سے اہم حصہ چن نامپو میں واقع اناج کے ذخیرے کا ایک بہت بڑا گودام تھا۔ مالک اکثر وہیں دیکھا جاتا تھا۔ آزادی کے دن وہ اسی جگہ تھا۔ اگلے چند دنوں میں اس نے کئی دفعہ کوشش کی کہ کشید گاہ سے 'سوجو' شراب کی بڑی مقدار ٹرک میں لاد کر چلتا بنے، لیکن ہر دفعہ چنمو اس کے آڑے آیا۔ یہ زمانہ بڑا خطرناک تھا کیونکہ شہریوں کے اسلحے ضبط کرنے کی مہم ابھی تک مکمل نہیں ہوئی تھی اور بہت سے لوگ لڑنے جھگڑنے کو تیار رہتے تھے۔ لیکن چنمو جان کے خطرے کی پرواکیے بغیر ناکامورا سے کسی قسم کی مصالحت یا مفاہمت پر راضی نہیں ہوا۔ ساتھی کلرک کونسوپ کا نعرہ" آج سے سب کچھ ہمارا ہے!" چنمو کے دلی جذبات کا ترجمان تھا۔

ناکامورااور اس کے ٹولے کو سوجو چرانے کا خیال تو خیر چھوڑ دینا پڑا، مگر پھر بھی ان کی کوشش رہی کہ کم ازکم ٹرک ہی ان کے ہتھے چڑھ جائے۔ لیکن چنمو نے ان کا یہ ارادہ بھی خاک میں ملا دیا۔ ناکامورا کے ایما پر ایک اور جاپانی موقع پا کر چنمو کو ہٹا کر کنارے لے گیا اور وہاں اس کی ہتھیلی پر سو 'وون' کے نوٹوں کی ایک گڈی رکھ دی۔ اس آدمی کی پیش قدمی ویسے ہی چنمو کو ناگوار گزری تھی۔ رشوت کے روپے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے گڈی زور سے اس آدمی کے منھ پر دے ماری، جس سے سارے نوٹ گر کر زمین پر پھیل گئے۔ اس کے بعد سے ناکامورا میں مزید کسی اقدام کی ہمت باقی نہیں رہی۔

جاپانیوں کے کاروبار پر مکمل قبضہ کیے جانے کا وقت قریب آرہا تھا۔ چنمو نے کشید خانے کی دیکھ بھال میں جتنی دلجمعی اور استقلال سے کام لیا تھا، اس کا فطری تقاضا یہی تھا کہ اس کے ساتھی اسی کو کشید خانے کا منیجر چن لیں۔ پیش عملی کے طور پر چنمو نے پہلے تو کشید خانے کو 'یگ یونگ کشید خانہ' کے نئے نام سے رجسٹر کروایا اور پھر اسی دن چوکیدار کے کمرے سے منیجر کی رہائش گاہ میں منتقلی کی تیاری شروع کر دی۔ صرف ایک کمرہ کرائے پر لے کر اسی میں پورے خاندان سمیت پندرہ برس تک رہنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی، بالخصوص ایسے کمرے میں جہاں ہر سال گرمیوں میں مانسون کے موسم میں چولھے میں پانی جمع ہو جایا کرتا تھا۔ مگر حالات کی مجبوری تھی اور اس کمرے کا کرایہ ذرا سستا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ کرائے کا کمرہ جس مکان میں تھا وہ مکان موسم بہار آنے پر مسمار کر دیا گیا، کیونکہ یہ مکان اور کئی مکانوں کے ساتھ ایک ایسی گنجان آبادی میں تھا جس پر اتحادیوں کی بمباری کا

Scanned with CamScanner

خطرہ تھا۔ اب جو چنھو نے نئی جگہ ڈھونڈنی شروع کی تو پتا چلا کہ کرائے آسمان پر پہنچے ہوے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی مالک مکان ایک کمرہ بہت سارے بچوں پر مشتمل خاندان کے رہنے کے لیے کرائے پر دینے کو رضامند نہیں ہوتا تھا۔ (بچے پانچ تھے — چنھو نے معمول کے مقابلے میں ذرا دیر سے گرہستی شروع کی تھی۔) کرائے کے کمرے کی تلاش میں جو پاپڑ بیلنے پڑے اس سے بیچارے چنھو کو اپنا حال کہاوت کے اس گونگے آدمی کا سا لگا جو کسی خوبصورت عورت کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے قاصر تھا۔ چنھو سے اور کچھ تو نہیں بن پایا، البتہ خود کلامی سے اپنی تسکین کے لیے اس نے کچھ اس قسم کے جملے ڈھال لیے: ''اگر تم کو پیونگ یانگ شہر کی فصیل کے اندرون بسنے کی خواہش ہے تو بچے مت پیدا کرو، ورنہ بس خواب ہی دیکھتے رہ جاؤ گے۔'' آخرکار وہ کشید خانے کے چوکیدار کے کمرے میں منتقل ہو گیا، جس کے باہر اس کو پکانے کی ضروریات کے لیے چولھا وغیرہ لگانا پڑا۔ مگر یہ اس کے نصیب تھے کہ رہنے کے لیے ایک مفت جگہ مل گئی۔ البتہ اسے کسی طرح مستقل انتظام نہیں مانا جا سکتا تھا، اس لیے چنھو نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ کشید خانے کے سابق منیجر کی رہائش گاہ میں منتقل ہو جائے۔

چنھو کی منتقلی کی معینہ تاریخ سے ایک دن پہلے یہ افواہ اڑی کہ راتوں رات ناکامورا اپنی بیش قیمت چیزیں ایک ٹرک میں لاد کر چن نامپو سے سیول فرار ہو گیا ہے۔ اسی دن چنھو تین ساتھیوں کو لے کر کشید گاہ کے منیجر کے مکان پر پہنچا تاکہ وہاں کے حالیہ مقیموں کو مکان خالی کرنے اور چنھو کے خاندان کی آمد کے لیے جگہ تیار کرنے کو کہے۔ مکان پیونگ یانگ کی مشرقی حدود پر واقع محلے ئمسان میں تھا، اور جنوب کی سمت کھلتا تھا۔

پہلی نظر میں عمارت ذرا خستہ حال لگی، مگر یہ بہت اچھی طرح بنی ہوئی تھی۔ نقشہ انگریزی کے حرف "یو" پر مبنی تھا، اور باہر کی دیوار سیمنٹ لگا کر پکی کی گئی تھی۔ مختلف وقتوں میں اس میں چار خاندان آباد رہے تھے، جن سب کو نئے سال کی تقریبوں میں مبارک باد دینے کے مقصد سے چنھو کئی بار اس مکان تک آیا تھا۔ مگر یہ زیارتیں صرف چوکھٹ پر اپنا ملاقاتی کارڈ چھوڑنے تک محدود تھیں۔ اس نے مکان کو اندر سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یوم آزادی سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے جب سابق منیجر دل کے عارضے سے اچانک فوت ہو گیا، تو چنھو تعزیت کے لیے یہاں آیا تھا۔ مگر اس موقعے پر بھی سارے

Scanned with CamScanner

ملاقاتی مکان کے باہر ایک جگہ جمع ہوئے تھے، جہاں اس نے واپسی سے پہلے تاتامی کے فرش پر گھٹنے ٹیک کر صدمے کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے چنھو کو بالکل علم نہیں تھا کہ مکان اندر سے کیسا ہے۔ لیکن اب سے پہلے ایسی معلومات کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ عمارت اسے ماضی میں بڑی رعب انگیز اور رسائی سے پرے لگتی تھی۔ اب اس کی کشادہ راہداری دیکھنے پر چنھو کے دل میں مالک مکان بن جانے کا طمانیت بخش احساس ابھرا اور اس پر ایک خاص تشفی اور خوشی کی کیفیت طاری ہوئی۔

دوسرے دن چنھو وہاں پہنچا تو اسے مکان خالی خالی سا لگا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ منیجر کی وفات کے بعد سے وہاں صرف عورتیں مقیم تھیں: سابق منیجر کی بیوہ، جو پچاس سے ذرا اوپر عمر کی تھی؛ بہو (جس کا شوہر، یعنی منیجر کا بیٹا، فوج کی جبری بھرتی میں لے لیا گیا تھا)؛ اور گھر کی ملازمہ۔ کیا یہ تینوں عورتیں ناکامورا کے ساتھ فرار ہو چکی تھیں؟ سامنے کا دروازہ، جسے گھنٹی کی آواز کے ساتھ کھلنا چاہیے تھا، بند تھا۔ چنھو نے ''کوئی ہے؟'' کی آواز لگائی۔ جواب میں ایک زنانہ آواز اتنی دور سے آئی جیسے وہ کسی اور مکان سے آ رہی ہو۔ پھر اور دور سے راہداری میں قدموں کی صدا سنائی دی۔ آخر کار دروازہ کھلا۔

دروزہ کھولنے والی خادمہ نہیں بلکہ خود بوڑھی بیوہ تھی۔ چنھو کو اس نے دو تین دفعہ سے زیادہ نہیں دیکھا ہوگا، جو اس وقت جاپانی کپڑوں کی بجائے یورپی کپڑوں میں ملبوس تھا، مگر بظاہر وہ اسے پہچان گئی۔ چنھو کو حیرت ہوئی کہ بیوہ نے استقبال کے لیے گھٹنے فرش پر ٹیک دیے — اس کے لیے ایسے احترام کا مظاہرہ کسی خادمہ تک نے کبھی نہیں کیا تھا — اور پھر کھڑی ہو کر اس نے بار بار گردن جھکا کر تسلیم کی۔ عورت کی جلد میں دھاتی نیلاہٹ کی جھلک تھی جو بڑھاپا آنے پر کھال کی لچک چلے جانے کی علامت تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد اس کا وزن بہت کم ہو گیا تھا، اور کھال سانولی اور کھردری ہو چلی تھی۔ چنھو نے اپنے آنے کا مقصد بتایا اور بیوہ کو دروازے پر ہی چھوڑ کر استقبال کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

جاپانیوں کے ہر نشان اور یادگار کو مٹا دینے کے جذبے کے تحت، اور کونسوپ کے نعرے ''سب کچھ ہمارا ہے'' کے بمصداق، چنھو نے زور سے پکارا: ''آؤ کامریڈو!'' اور سب نے دیواروں

پر رنگی ہوئی تصویریں اور مزین پارچے کے طومار (اسکرول) اتارنے شروع کر دیے۔ کچھ تو سالم اترے اور لپیٹ کر رکھ دیے گئے، لیکن کچھ جھٹکے سے کھینچ لیے جانے کے باعث نُچ گئے یا بیچ میں سے پھٹ گئے۔ چنھو نے انھیں دیکھ کر کہا، ''کوئی بات نہیں۔ جاپانی کوڑے کرکٹ کے ساتھ جو کرو ٹھیک ہے!''

تاتامی چٹائیاں ابھی مزید استعمال کے لائق تھیں۔ ''مکانوں کے ساتھ یہ مصیبت ہے کہ ان کی درستی کے لیے چاہے کتنا ہی خرچ کرو، ہمیشہ مزید روپے کی ضرورت نکلتی رہتی ہے!'' یہ سوچتے ہوئے چنھو نے اگلے کمرے کا جائزہ لیا تو وہاں کی چٹائیاں بھی کام کی دکھائی دیں۔ اسے ایسے کمرے کی تلاش تھی جس میں فرش کو گرم رکھنے کا انتظام ہوتا۔ چلتے چلتے اس کو قیمتی پاؤلونیا لکڑی کی بنی ہوئی ایک الماری نظر آئی۔ اس نے کہا، ''ہٹاؤ یہاں سے اس جاپانی غلاظت کو!''

چنھو بیوہ کے پاس واپس جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ اس کے پیچھے ہی کھڑی نظر آئی۔ اس کے چہرے پر حیرت، افسوس اور خوف کا تاثر تھا۔ کیا اس کو مکان اور اس کے لوازمات سے اتنا لگاؤ تھا؟ چنھو نے پوچھا، ''مکان کا بھنڈار کدھر ہے؟'' عورت نے دور کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا اور کہا، وہ خود ہی اس کو وہاں لے جائے گی۔ ''کامریڈو!'' چنھو نے پکارا اور جب وہ جمع ہو گئے تو ان سے کہا کہ الماری بھنڈار میں پہنچا آئیں۔

اگلا کمرہ چھوٹا تھا اور اس کا فرش چوبی تھا۔ دروازہ، جس پر منقش کاغذ چسپاں تھا، جیسے ہی کھلا، دھوپ اڈکر اندر آئی اور کمرہ روشنی سے بھر گیا۔ ایک میز پر رکھے ہوئے گملے میں اگتے آلوچے کے ننھے درخت پر چنھو کی نظر پڑی۔ یہ ویسا ہی آلوچے کا مصغّر درخت (bonsai) تھا جو کشید خانے میں منیجر کے دفتر کی میز پر بھی براجمان تھا۔ ایک رائے یہ سننے میں آتی تھی کہ اسی ننھے سے درخت کے ہم شکل، سوکھے، سکڑے چہرے والے منیجر صاحب کو یہ پودا پھول بھرے پیڑوں سے کہیں زیادہ پیارا تھا۔ اس درخت کے بارے میں سوچتے ہوئے چنھو کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس درخت کا کوئی نہ کوئی تعلق کشید خانے کے مالک ناکامورا سے بھی ہوگا جو خود ہی آلوچے کے درختوں کا شیدا تھا۔ ادھر ادھر سے سنی ہوئی افواہوں کے مطابق سابق منیجر چن نامپو شہر کے ایک بینک میں اپنی ملازمت کے دوران جب ناکامورا سے ملا تھا تو اس وقت تک منیجر کو آلوچے کے درختوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر

Scanned with CamScanner

جیسے ہی اسے ناکامورا کے شوق کا علم ہوا، وہ اس موضوع کی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے آلوچے کا ایک مصغر درخت بھی اگا یا۔ پھر ایک مناسب موقع ڈھونڈھ کر اس نے ناکامورا کو ایک درخت تحفے میں دیا۔ اسے کشید خانے میں منیجر کا عہدہ اسی واقعے کے بعد ملا۔ لیکن اس کے برعکس ایک اور کہانی یہ بھی سنی گئی تھی کہ منیجر خود ہی ہمیشہ سے آلوچے کے درختوں کا دیوانہ تھا۔ ان درختوں کے شائقین کی انجمن نے ایک دفعہ چن نامپو میں ایک نمائش کا اہتمام کیا تھا جس میں منیجر اور ناکامورا پہلی دفعہ ملے تھے۔ منیجر کی بینک میں سابقہ ملازمت کی وجہ سے ناکامورا اکثر کاروباری سلسلے میں اس سے ملتا تھا۔ اس طرح ان کی باہم خاصی اچھی جان پہچان ہو گئی۔ ایک دفعہ منیجر ناکامورا کے گھر ملاقات کے لیے آیا تو وہاں اسے گملے میں اگتے ہوئے ایک آلوچے کے درخت میں دو شگوفے کھلتے نظر آئے۔ منیجر نے خوش طبعی سے کہا کہ جب بھی کہیں آلوچے کے دو پھول کھلیں وہاں ایک تیسرا پھول بدمزگی پیدا کرے گا۔ یہ فقرہ ناکامورا کو بہت پسند آیا اور وہ بولا کہ اس کا اپنا خیال بھی اسی قسم کا ہے۔ دونوں کے تعلقات اتنے بڑھے کہ منیجر کو کشید خانے میں عہدے کی پیشکش ہوئی۔ منیجر کے کشید خانے سے متعلق ہونے کا سبب یہی پیشکش تھی، نہ کہ اس کی طرف سے یہاں ملازمت کی تلاش کے لیے کوئی درخواست!

بہرحال، چنمو نے آلوچے کا گملا اٹھایا اور اسے بھنڈار میں ڈال دینے کے لیے چلا— کشید خانے میں منیجر کے دفتر میں رکھے ہوئے آلوچے کے درخت کو بھی اس نے اسی طرح ہٹا دیا تھا —جیسا کہ عورت نے بتایا تھا، بھنڈار "یو" شکل کی عمارت کی ایک شاخ کے کنارے واقع تھا۔

بھنڈار کے ٹھیک سامنے ایک اور استقبالی کمرہ تھا، جس کی آرائش مغربی طرز کی تھی اور اس وقت یہ کمرہ ایک غیر معمولی چمک کی دھوپ سے منور تھا۔ وہاں چنمو کا ایک ساتھی دیوار سے ایک تصویر اتارنے میں مصروف تھا۔ اور دوسرے دو آدمی، آلوچے کے ایک اور مصغر درخت کا گملا اور ایک سفید گل داؤدی کا گملا اٹھائے، بھنڈار کی طرف جانے والے تھے۔ جو آدمی گل داؤدی کا گملا اٹھائے ہوئے تھا اسے چنمو نے کہا کہ یہ پودا وہ یہیں چھوڑ دے۔

کرسی، صوفہ، اور قالین کافی حد تک گھسے ہوئے تھے، پھر بھی ابھی کچھ اور دن استعمال ہو سکتے تھے۔ عورت ایک طرف کھڑی تھی۔ انکسار اور تواضع سے اس کا دراز قد کبڑا ہو رہا تھا، مگر اجنبی مردوں کو

Scanned with CamScanner

سب چیزوں پر قبضہ کرنے کے لیے اکیلا چھوڑ دینے کے لیے آمادہ نہیں لگ رہی تھی۔ گھر کی چیزوں سے اس کی وابستگی دیکھ کر چنھو نے اسے بتایا کہ اب اسے اس مکان کی مزید فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ عورت نے جواباً سر بہت نیچا جھکا یا جیسے کہ چنھو کی بات سے پوری طرح متفق ہو۔ پھر بولی کہ اب مکان اور اس کی چیزیں خود اس سے تو چھٹ ہی چکی ہیں، مگر پھر بھی اسے خوشی ہے کہ یہ چنھو کے کام آئیں گی۔

چنھو نے کونسوپ کے اقوال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عورت کو یہ سمجھایا: کوریا میں جاپانیوں کی جو ملکیتیں ہیں وہ اصل میں کوریائی لوگوں کی ہی ہیں۔ جاپانی جاپان سے آخر یہاں کیا ساتھ لائے تھے؟ چونکہ وہ یہاں خالی ہاتھ آئے تھے اس لیے کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ انھوں نے یہاں عیش و آرام کے بہت سارے دن گزار لیے؟ انھیں کسی بات کی شکایت کا کیا حق ہے؟ انھیں شکر بجالانا چاہیے کہ ان کی زندگیاں محفوظ ہیں۔ یہ ان کی خوش نصیبی ہے کہ جاپان میں بھی کوریائی آباد ہیں، جو اب کوریا واپس لوٹنا چاہتے ہیں۔ کوریا نے جو آزادی کے بعد بھی جاپانیوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا، کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ 36 سال طویل استعماری قبضے کی مدت میں جاپانیوں نے کوریا کو کمزور اور کھوکھلا کر دیا ہے۔ عورت سے یہ سب کچھ کہتے ہوئے چنھو کو احساس ہوا کہ جوان کلرک کونسوپ کی باتوں میں بڑا وزن ہے۔ پھر اس نے عورت کو مزید خبردار کر دیا کہ مکان اور اس کے مشمولات لے لیے جانے کی شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ان کے ناخوش ہونے کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ عورت نے پھر تعظیم سے جھک کر جواب میں کہا کہ وہ اور اس کے خاندان والے بھی یہی رائے رکھتے ہیں اور، جیسا کہ وہ پہلے ہی بتا چکی ہے، اسے خوشی ہے کہ یہ مکان چنھو کے قبضے میں آ رہا ہے۔ لیکن عورت کے چہرے کے تاثرات سے چنھو نے یہ نتیجہ نکالا کہ عورت کی مکان سے لگن ابھی تک نہیں گئی ہے۔

غسلخانے تک جانے والی راہداری میں ایک کھلے دروازے سے ایک بڑا سا کمرہ نظر آیا، جس میں ایک جوان عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ عورت ابھی شاید تیس سال سے کم عمر کی تھی۔ ان لوگوں کے داخل ہونے پر وہ چونک پڑی اور اس کا جھکا ہوا سر اور نیچے ڈھلک گیا۔ یہ منیجر کے اکلوتے بیٹے کی بیوی ہوگی جو فوج میں جبری بھرتی کے بعد جنگ لڑنے کے لیے محاذ پر چلا گیا تھا۔ کمرے کے فرش پر تاتامی چٹائیاں بچھائی گئی تھیں۔ خانہ داری کی طرح طرح کی اشیا کی موجودگی سے واضح تھا کہ خاندان کی

Scanned with CamScanner

رہائش کا مرکز یہی کمرہ تھا۔ فرنیچر میں ایک نمایاں چیز پاؤلو نیا لکڑی کی ایک الماری تھی جو غالباً اس جوان عورت کے ملبوسات کے لیے تھی۔

یہاں بھی چنہو نے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ کمرے میں جو کچھ ہے وہ سب بھنڈار میں پہنچا دیں۔ مرد جس دوران کمرے کی چیزیں ہٹا رہے تھے، جوان عورت سرنگوں بیٹھی کچھ ایسی حالت میں تھی جسے ازلی انجماد کا نام دیا جا سکتا تھا۔ بیوہ نے کئی دفعہ چنہو سے پوچھا کہ چیزوں کو اپنی جگہ پر رہنے دیا جائے تو کیا حرج ہے۔ اس طرح وہ چنہو کے خاندان کے استعمال میں آسکتی ہیں، کیونکہ بیوہ کے اپنے خاندان کو اب ان کی ضرورت نہیں۔ چنہو نے جواب دیا کہ اس نے اور اس کے بال بچوں نے اب تک اس قسم کی چیزوں کے بغیر گزارہ کیا ہے، اس لیے اسے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ چنہو کی نظریں ادھر اُدھر حرکت کرتی ایک نقطے پر رک گئیں۔ جب بیوہ نے دیکھا کہ چنہو کی نگاہیں کدھر ہیں تو بے اختیار اس کی چیخ نکل گئی۔ صرف اسی آواز پر جوان عورت نے سر اوپر اٹھایا اور جب بیوہ نے دیوار کی طرف اشارہ کیا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

دیوار پر دو تصویریں ساتھ ساتھ آویزاں تھیں۔ ایک تصویر فوت شدہ منیجر کی تھی، دوسری ایک فوجی وردی اور ٹوپی میں ملبوس کسی جوان آدمی کی تھی جو غالباً منیجر کا بیٹا تھا۔ منیجر کا فوٹو بظاہر حال ہی کا تھا اور اس میں ایک توانا، دبنگ شخصیت نمایاں تھی۔ لیکن دوسرے فوٹو سے چنہو کا تاثر تھا کہ لڑکا باپ سے زیادہ ماں سے مشابہ تھا۔ اس کے گالوں کی ہڈیاں چوڑے چہرے پر ابھری ہوئی تھیں اور پھیلے ہوئے کاندھے مضبوط ساخت کے جسم کے گواہ تھے۔ چنہو کے دل میں خیال آیا کہ اگر بیٹا جنگ کے محاذ سے زندہ لوٹ آیا تو شاید اپنے باپ سے زیادہ لمبی عمر پائے گا۔ دونوں عورتیں بدحواس نظر آ رہی تھیں کہ اب چنہو ''کامریڈو!'' پکارے گا اور ساتھیوں کو یہ تصویریں نکالنے کا حکم دے گا۔ وہ خود ہی دوڑتی ہوئی دیوار کے پاس گئیں اور پھر کرسیوں پر چڑھ کر انھوں نے وہ تصویریں اتار لیں کیونکہ ان تصویروں کا اجنبیوں کے ہاتھ لگنا شاید ان کے لیے بے حد دل شکن ہوتا۔ چنہو سوچنے لگا کہ اگر تنک چڑھا منیجر وہاں ہوتا تو اس موقعے پر کیا کرتا۔ اس بات پر ضبط کی کوشش کے باوجود اس کو زور سے ہنسی آگئی۔ دونوں عورتیں کانپ اٹھیں۔

اس کمرے سے متصل باہر کے دروازے کی طرف ایک اور کمرہ تھا، جس میں جاپانی طریقے

Scanned with CamScanner

سے فرش کو گرم رکھنے کا انتظام تھا۔ فرش کی کئی تہیں تھیں جو کئی سال پرانی تھیں۔ فرش پھر بھی قابل استعمال نظر آرہا تھا۔ چنہو کو یہ بات اچھی لگی۔ کمرہ سات آدمیوں کے لیے چھوٹا پڑے گا، لیکن اگر گھریلو استعمال کی اشیا برابر کے کشادہ رہائشی کمرے میں ڈال دی جائیں تو پھر یہ کمرہ گھس گھسا کر سونے کے کام آسکتا ہے۔ کمرے کی دوسری جانب ایک اور کمرہ تھا جس میں تاتامی چٹائی بچھی تھی۔ یہ خادمہ کا کمرہ ہوسکتا تھا۔ لیکن خادمہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ غالباً وہ گھر چھوڑ کر جا چکی تھی۔

کمروں کے بعد چنہو نے اتر کر اندرونی صحن کا معائنہ کیا۔ اس معیار کے اکثر مکانوں کی طرح اس کا صحن بھی آرائشی پتھروں اور پودوں سے آراستہ تھا۔ بلکہ اس میں ایک چھوٹا سا مصنوعی حوض بھی بنا ہوا تھا۔ صحن کے پرلے کنارے پر ایک بغلی پھاٹک گلی میں کھلتا تھا۔ اور اس دروازے کے سامنے بمباری سے بچنے کی ایک پناہ گاہ بھی تھی۔ عین ممکن تھا کہ یہ کشید خانے کے مزدوروں سے کھدوائی گئی ہو۔ پھاٹک اور پناہ گاہ کے بیچ میں دو سنگی مجسمے آمنے سامنے نصب تھے۔ ''ستیاناس ہوں یہ جاپانی فضولیات!'' سوچتے ہوئے چنہو نے زور سے پکار کر عورتوں سے کلھاڑی مانگی۔

بیوہ عقبی صحن سے مطلوبہ اوزار اٹھائے ہوئے، فوراً لپکتی ہوئی حاضر ہوئی۔ چنہو نے اپنے سوٹ کے جیکٹ کی آستینیں چڑھانے کی کوشش کی، مگر آستینیں بہت تنگ تھیں۔ شکر ہے اس نے ٹائی نہیں پہن رکھی تھی ورنہ اس موقعے کے لیے لباس اور ناموزوں ہوتا۔ آستینیں ویسے ہی چھوڑ کر اس نے عورت سے کلھاڑی لے لی۔ وہ چھوٹے قد کا اور بظاہر کمزور آدمی تھا، مگر طاقت آزمائی کی دھن میں اس کا جسم تن گیا اور آنکھیں معمول سے زیادہ ابل پڑیں۔ ایک ہی وار سے اس نے پہلے مجسمے کی گردن اڑادی، جس کا کٹا ہوا سر لڑھکتا ہوا پناہ گاہ کے گڑھے میں جا گرا۔

پھر اس نے دوسرے مجسمے کی بھی اسی صفائی سے گردن زنی کی، لیکن اس کا سر گڑھے تک نہیں لڑھکا۔ اس عرصے میں دوسرے آدمی مکان کے اندر سے نکل کر یہاں پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے زور کی لات مار کر اس سر کو بھی گڑھے میں گرادیا۔ ''ان لوگوں نے اپنے پتھر کے ساتھیوں کے لیے پہلے ہی سے قبر کھود رکھی ہے،'' اس نے کہا، جس پر سارے مردوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ عورتیں ٹھٹک پڑیں۔ اغلب یہ تھا کہ ان کو مجسمے ٹوٹنے سے زیادہ مردوں کے بلند قہقہوں کی آواز نے سہما دیا تھا۔ ان مجسموں کا کام تمام کرنے کے بعد چنہو نے حوض کے قریب ایستادہ سنگی لالٹین پر اپنی تیشہ

Scanned with CamScanner

زنی کی مہارت دکھلائی، مگر اس میں سے صرف پتھر کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر زمین پر آ گرا۔

اس دوران میں دوسرے مرد ملاقات کے کمرے کے متصل تہہ خانے سے ہو آئے اور یہ اطلاع لائے کہ وہاں سوجو شراب سے بھرے ہوئے تین بڑے پیپے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ انکشاف کرتے وقت ان کے لہجے سے مایوسی ٹپک رہی تھی کیونکہ انھیں شاید کہیں بڑا ذخیرہ دریافت کرنے کی امید تھی۔ ان کی سانس میں الکحل کی بو بھی تھی۔ چنہو کا خیال تھا کہ ان لوگوں نے شراب کی مقدار ناپنے کے لیے پیپوں میں نلکی ڈالی ہوگی اور سیال کی نوعیت کے تعین کے لیے اس کے چند گھونٹ پی بھی لیے ہوں گے۔ اس کے جی میں خود بھی تھوڑی سی سوجو پینے کی خواہش پیدا ہوئی، مگر چونکہ سب کے سامنے یہ مناسب نہیں تھا، اس لیے اس نے ضبط سے کام لیا۔

عورت نے وضاحتاً کہا کہ اس نے شوہر کی وفات پر سوجو کے پیپے سوگ کی رسموں میں استعمال کے لیے گھر منگوائے تھے۔ ہنگامے شروع ہو جانے کی وجہ سے وہ اب تک یہیں پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن چنہو کے علم کے مطابق منیجر کی موت کے بعد صرف ایک پیپا اس گھر میں بھیجا گیا تھا۔ ہو نہ ہو، منیجر اپنی حیات کے دوران کمپنی کے تحفے کے طور پر استعمال کے بہانے شراب گھر پر منگواتا رہا ہوگا، اور اس کو ذاتی استعمال کی چیزیں حاصل کرنے کے لیے ذریعۂ مبادلہ کے طور پر استعمال کرتا ہوگا۔

عورت نے کہا کہ وہیں پر حمام بھی ہے، کیا وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے؟ عورت شاید اس کے رویے کی درشتی سے خوفزدہ تھی اور کسی طرح یہ درشتی کم کرنے کی خواہاں تھی۔ ''میں اس عورت کے نخرے بہت اٹھا چکا ہوں،'' چنہو نے سوچا۔ اس نے عورت کو جواب میں کہا کہ وہ اگلے دن یہاں منتقل ہو جائے گا، اس لیے وہ لوگ مکان فوراً خالی کر دیں۔ پھر کونسوپ کے الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے بولا کہ انفرادی ملکیت کا زمانہ اب گزر گیا ہے اس لیے وہ گھر کی کسی چیز سے مزید کوئی تعلق نہ رکھے۔ یہ کہہ کر وہ اسے چھوڑ کر باہر چلا آیا۔

دوسرے دن چنہو اپنے خاندان سمیت کشید خانے کے ٹرک پر اپنا سامان لاد کر منیجر کے مکان پر پہنچا۔ ٹرک میں سامان سے زیادہ اس کے ساتھی بھرے تھے۔ مکان میں بیوہ ابھی تک موجود تھی۔ کیا وہ بہت سویرے یہاں پہنچ گیا تھا؟ لیکن اس نے ادھر ادھر گھوم کے دیکھا تو کم از کم جوان بہو وہاں

Scanned with CamScanner

کہیں نہیں دکھائی دی۔ بیوہ چنھو کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ملتجیانہ آواز میں چنھو سے پوچھا کہ کیا وہ اسے کچھ دن اور یہیں رہنے کی اجازت دے سکے گا۔ چنھو کا خیال تھا کہ وہ عورت اپنے رشتے داروں پر بوجھ بننے سے بچنا چاہتی ہے۔ اس لیے بولا کہ اس زمانے کے حالات کے باوجود جاپانی لوگ ایک دوسرے کا لحاظ کرنے اور احسان اٹھانے کے بارے میں فکر مند ہونے وغیرہ کے مہمل تکلفات میں کیوں پھنسے ہوئے ہیں؟ وہ کیوں ایسی بیکار باتیں کر رہی ہے؟ سیدھے سادے طریقے سے اپنی بہو کے رشتے داروں کے ساتھ رہنے کیوں نہیں چلی جاتی ہے؟ عورت بولی، وہ بالکل یہی کچھ کرنا چاہتی تھی، لیکن اپنی بہو کے رشتے داروں کے مکان پر پہنچی تو دیکھا کہ وہ پہلے ہی مانچوریا سے آئے ہوئے مہاجرین سے بھرا پڑا ہے۔ مکان خاصا بڑا ہے مگر اب اس میں تل دھرنے کی گنجائش بھی باقی نہیں۔ اور اگرچہ یہ زیادتی کی بات تھی مگر اس نے ٹھونس ٹھانس کر بہو کو وہیں روک دیا ہے۔ البتہ خود وہ یہاں آنے پر مجبور تھی۔ کچھ ہی دنوں میں جاپانیوں کا انخلا ہونے والا ہے۔ کیا اس وقت تک اسے یہیں ٹھہرنے کی اجازت ہے؟

چنھو نے عورت کی تھکی تھکی تاریک آنکھوں پر نظر ڈالی، جس کے پپوٹے اور سفیدی باہم ملے جلے دکھائی دیتے تھے۔ عورت کی التجا کا جواب دیے بغیر اس نے سامان ٹرک سے اتار کر گھر میں رکھنا شروع کر دیا۔ عورت نے جواب نہ ملنے کو ہاں سمجھا ہوگا کیونکہ جب چنھو کی بیوی باورچی خانہ دیکھنے آئی تو بیوہ نے اسی گھر کے ایک مطمئن باسی کی حیثیت سے تاتامی والے بڑے کمرے میں نئی مالکہ کا استقبال کیا۔ اس برتاؤ کا پیغام یہ ہو سکتا تھا کہ یہ جاپانی باورچی خانہ بہت چھوٹا نہیں اور نئے خاندان کی ضروریات کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ پھر لائے ہوئے مختصر اسباب سے گھر سجانے میں بیوہ نے چنھو کی بیوی کا ہاتھ بھی بٹایا۔ ماضی میں چنھو کو اپنی اتنی کم حیثیت اور مختصر سی گرہستی پر اس جاپانی عورت کی نظر پڑنے سے شرم آتی، اور بچوں کا اچھل کود اور شور غل تہذیب کے خلاف لگتا، لیکن اس وقت اسے یہ باتیں ذرہ بھر بھی نامناسب نہیں لگیں۔

آخرکار بیوہ چنھو اور اس کے خاندان کے ساتھ اسی گھر میں رہنے لگی۔ چنھو کے ذہن میں اکثر یہ کرید ہوئی کہ بیوہ کی درخواست کا سیدھا سا ہاں یا نہیں میں جواب دینے کی بجائے وہ چپ کیوں رہا تھا۔ چنھو نے سوچا کہ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کوریائیوں کے دل میں ہمیشہ مصیبت زدہ افراد سے

ہمدردی ہوتی ہے خواہ یہ افراد دشمن ہی کیوں نہ ہوں۔ چنہو کے دل میں اکثر ہمدردی کا یہ جذبہ اٹھا تھا اور وہ اسے دبا دینے پر قادر نہیں تھا۔

اگلے دن سے ہی بیوہ نے روزانہ صبح تڑکے اٹھ کر سارے گھر کی صفائی کا کام سنبھال لیا۔ گو مکان اب اس کا نہیں رہا تھا مگر شاید اس سے بیوہ کی وابستگی ہنوز قائم تھی اور اس کے اختیار سے باہر تھی۔ یا شاید وہ اس مکان میں رہنے کی اجازت کے لیے احسان مند تھی اور بدلے میں گھر کے کام کاج میں شریک ہونا چاہتی تھی۔ بہرصورت، پو پھٹتے ہی سابق مالکہ کے جھاڑو چلنے کی آواز آنے لگتی۔ چنہو، جسے پہلے بہت سویرے اٹھنے کی عادت تھی، اس وقت اکثر بستر ہی میں ہوتا۔

چنہو ہر رات تہہ خانے میں رکھے پیپوں میں سے ڈھالی ہوئی تھوڑی سی سوجو پی کر، اور سرور کے عالم میں نیم گرم پانی سے غسل کا لطف اٹھا کر، مہمان خانے میں لیٹ رہتا۔ پھر صبح سویرے اس کی آرام دہ، لمبی، گہری نیند بیوہ کے جھاڑو دینے کی سڑاک سڑاک سے ٹوٹ جاتی۔ کبھی کبھی وہ دل ہی دل میں شکایت کرتا کہ جو کچھ اچھی قسمت اس کے ہاں آنے والی ہوگی، بڑھیا کا جھاڑو اس کو واپس باہر بھگا دے گا۔ ویسے بھی جھاڑو سے دور کیا ہوا سارا گرد و غبار تھوڑی دیر بعد پھر گھر میں آکر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ خود کو کوستا کہ اس نے بڑھیا کو پہلے ہی گھر سے نکل جانے کا حکم کیوں نہ دے دیا تھا۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ صبح سویرے جھاڑو کی سڑاک سڑاک کی آواز سنتے ہوئے اس کے ذہن میں مختلف طرح کے خیالات آتے۔ اسے اکثر احساس ہوتا کہ اگرچہ اس کی زندگی کے پچھلے چالیس سال بڑے سخت کٹے تھے مگر اب آرام اور اطمینان کا زمانہ آنے والا ہے۔ ایسے پرمسرت خیال سے اسے پھر گہری نیند آجاتی، جیسے اس کی ساری تکان ایک دم سے غائب ہوگئی ہو۔ رفتہ رفتہ وہ صبح کی اس سڑاک سڑاک کا نہ صرف عادی ہوگیا، بلکہ یہ اس کی روزینہ ضروریات میں شامل ہوگئی، کیونکہ اس آواز سے یقین دہانی ہوتی تھی کہ اس کا مکان صاف ستھرا کر دیا گیا ہے! اس کے بچوں کو دوڑنے بھاگنے کے لیے اتنا بڑا امکان مل گیا تھا۔ ان کی شرارتوں سے گھر میں جو گندگی پھیلتی تھی اس کی صفائی گھر کی نئی مالکہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ ذمے داری بھی بیوہ نے اپنالی۔ وہ دن بھر بچوں کی گندی کی ہوئی چیزیں صاف کرتی اور بکھیری ہوئی چیزیں قاعدے سے ان کی جگہوں پر لگاتی۔ وہ بچوں کی حرکتوں سے پیدا شدہ آلودگیاں دیکھنے کی عادی نہیں رہی تھی، اس لیے ان کی فوراً صفائی کے

Scanned with CamScanner

لیے ہر وقت مستعد رہتی تھی۔ چنہو کو آخر کار احساس ہوا کہ اس عورت کو گھر میں ٹھہرنے دینا ٹھیک ہی رہا، بلکہ اس میں اس کا اپنا ہی فائدہ ہوا۔ اس کے غسل کے لیے ٹب کا پانی بالکل صحیح درجۂ حرارت پر رہتا ہے، اور نہ گرم لگتا ہے نہ ٹھنڈا۔ بھلا اس عورت کے علاوہ اور کس کو اس کی مہارت حاصل ہے؟

ایک ایسے ہی دن چنہو کے دل میں ایک نیا خیال آیا۔ اس نے مختلف کمروں میں گھوم کر دیکھا اور ہر جگہ اسے ایک قسم کی کمی کا احساس ہوا۔ کمروں میں اشیائے آرائش کی کمی تھی! ان چیزوں کو بلاوجہ کمروں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ کونسوپ جن تمام چیزوں کو مکان بدر کرنے کی نصیحت کرتا تھا وہ یہ چیزیں تو نہیں ہوسکتی تھیں۔ ویسے بھی اس اعلیٰ درجے کے پُرثروت مکان کو شایانِ شان لوازمات سے مزین کیے بغیر رکھنا مکان کے ساتھ ناانصافی تھی۔ چنہو نے فیصلہ کرلیا کہ جو چیزیں بھنڈار میں ڈال دی گئی تھیں انھیں واپس لاکر اپنی صحیح جگہوں پر لگوادے گا۔

مغربی طرز کے کمرے میں چنہو نے تصویریں دوبارہ آویزاں کر دیں۔ حسب توقع کمرے کی سابقہ رونق لوٹ آئی۔ اس کے بعد آلوچے کے مصغر درخت واپس لائے گئے۔ پھر دوسری سجاوٹوں کی باری آئی۔ ان میں سے جو بھی خوشنما تھیں یا کارآمد، وہ ذخیرے سے واپس لاکر اپنی اپنی پرانی جگہوں پر جمادی گئیں۔ پاؤلونیا کی الماری مہمانوں کے کمرے سے متصل کمرے میں جب واپس رکھی گئی تو وہ کمرہ پہلے کی طرح پھر سے زیبا اور قابلِ رہائش لگنے لگا۔ فریم چڑھی تصویروں اور لپٹے ہوئے منقش پارچہ جات میں جو جو اتارنے اور ہٹانے میں خراب نہیں ہوئے تھے انھیں دوبارہ دیواروں پر ٹانگا گیا۔ چوبی فرش والے جنوب رخ کمرے میں آلوچے والا گملا پھر واپس اپنی پرانی جگہ پر رکھا گیا۔ پتھر کے مجسموں سے توڑ کر علیحدہ کیے ہوئے سروں کو دوبارہ مجسموں پر جوڑنے کی ضرورت تھی۔ سنگی مجسموں اور لالٹین کے بغیر بھلا کوئی صحن صحن ہوتا ہے؟ اس لیے چنہو نے مجسموں کے سر واپس لاکر ان پر جمائے — پتھر کے سروں کی شکل سے اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ کتنے بھاری تھے — پھر وہ سنگی لالٹین کا ٹوٹا ہوا پتھر ڈھونڈ کر واپس لایا۔ اس کو لالٹین میں جوڑنے کے لیے سیمنٹ لانی ہوگی۔

چنہو مغربی کمرے میں آلوچے کے درخت سے آراستہ میز سے لگ کر بیٹھا۔ یہاں کا ماحول اسے بہت اچھا لگا۔ مگر پھر بھی کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ ''ارے ہاں، میری اپنی تصویر! سابق

منیجر کی تصویر ہی جتنی بڑی، اسی دیوار پر!'' اس نے تصویر کشی کے اسٹوڈیو جانے کی تیاری کی اور اس کے لیے اپنے یورپی قطع کے سوٹ کو برش سے رگڑ رگڑ کر اتنا صاف کیا جتنا وہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ بہار اور خزاں کے موسموں میں پہننے کے لیے یہ سوٹ اس نے دس سال قبل سلے سلائے ملبوسات کی ایک دکان سے خریدا تھا۔ دکان کے مالک کے بیان کے مطابق یہ سب سے اچھا سوٹ تھا۔ کپڑا چمڑے سے زیادہ موٹا، گہرا بھورا رنگ جس پر پڑی ہوئی گرد کبھی نظر نہ آئے، بظاہر بہار اور خزاں کے لیے سلا ہوا سوٹ لیکن گرما اور سرما کے لیے بھی ویسا ہی مناسب! البتہ جب چنھو نے پہننا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ سوٹ صرف سردی کے لیے ٹھیک تھا، گرمی کے استعمال کے لائق بالکل نہیں تھا۔ جب سوٹ کا جیکٹ تنگ نکلا تو پھر چنھو نے اسے پہننا بہت کم کر دیا، اور یہ مدتوں الماری کے اندر نچلی تہہ میں پڑا رہا۔ حالانکہ ایک طویل عرصے میں جیکٹ اور چنھو میں سے کسی کے ناپ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، لیکن پھر بھی اس دفعہ پہننے پر آستینیں تنگ محسوس ہوئیں اور جیکٹ کی لمبائی بھی کم لگی، البتہ سوٹ کی پتلون پہلے ہی کی طرح اس کے دبلے اور چھوٹے جسم پر لمبی اور ڈھیلی ثابت ہوئی۔ گویا سوٹ کے اوپر اور نیچے کے حصوں کا ایک دوسرے سے جوڑ نہیں بیٹھتا تھا۔ ٹائی باندھنے پر پورا سوٹ اور زیادہ بھدا دکھائی دیا۔ پھر بھی جب چنھو نے گھر سے باہر قدم رکھا تو اس کا چہرہ اطمینان اور اعتماد سے بھرپور نظر آ رہا تھا۔

اس رات کو گھر واپسی پر چنھو کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں، سانس میں شراب کی تیز بو تھی اور منہ سے کچھ ایسے الفاظ کی بوچھار ہو رہی تھی: ''ہاں، یہ حرامزادے پچھتائیں گے!'' تصویر کھنچوانے کے بعد وہ کشید خانے کی بجائے نجی تجارت کے محکمے چلا گیا تھا تاکہ کشید خانے کی منیجری کے عہدے کے لیے اپنی درخواست کا نتیجہ معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

اس دفتر کے کلرک نے ایک پلندے کی ورق گردانی اس طرح کی جیسے احسان کر رہا ہو، معنی خیز اور بارعب انداز سے سر موڑا، پھر اپنے کچھوے کے خول کے فریم والی عینک کے شیشوں سے اوپر نگاہیں اٹھا کر چنھو کو بتایا کہ اس عہدے کے لیے دو درخواستیں موصول ہوئی ہیں۔ یہ سن کر چنھو کا دل بیٹھنے لگا مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا اور کہا، ایسا ناممکن ہے، کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے، کیا کاغذات کو دوبارہ دیکھ سکتے ہیں؟ کلرک نے کاغذات کے پلندے کا دوبارہ معائنہ کیا اور کہا نہیں، کوئی

غلطی نہیں۔ تو اب کیا ہوگا؟ چنہو نے پوچھا۔ آدمی نے محسنانہ شان سے ایک دفعہ پھر وہی کاغذات دیکھے اور چنہو سے نام پوچھا، جو اس نے بتایا۔ آدمی نے کاغذوں پر نگاہ دوڑانے کے ساتھ دانستہ انداز میں سر ہلایا، اور پھر شیشوں کے اوپر سے چنہو کا چہرہ دیکھا۔ چنہو نے پوچھا کہ دوسرا امیدوار کون ہوسکتا ہے۔ آدمی کا جواب صرف ایک تاثرات سے عاری، مویشی صفت مسکراہٹ تھی۔ گویا مطلوبہ معلومات صرف خاص الخاص افراد کے لیے تھی۔ چنہو کو سوال پوچھ کر شرمندگی ہوئی، کیونکہ ایسے موقعے پر کریدنہ کرنے ہی میں عقلمندی تھی۔

چنہو کا دماغ نئی چالوں میں مصروف ہوگیا۔ دفتر سے باہر نکل کر اس نے حساب لگایا کہ کتنی دیر بعد اس آدمی کا کام ختم ہوگا اور وہ دفتر سے باہر آئے گا۔ اس عرصے تک اس نے انتظار کیا، اور پھر آدمی کو راستے میں اس طرح جا پکڑا جیسے ان کی اتفاقی مڈبھیڑ ہوئی ہو۔ چنہو نے آدمی سے کہا کہ سورج ڈوبنے والا ہے، اور اس وقت کا تقاضا ہے کہ یہ لوگ کہیں رک کر کچھ پییں۔ یہ کہتے ہوئے وہ اس آدمی کو ایک خاموش ماحول کے بار میں لے گیا۔ بار خالی تھا اس لیے صرف ان دو آدمیوں سے شراب نوشی کی محفل شروع ہوئی۔ عینک والا آدمی، جس پر جلد ہی مدہوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے، بار بار شراب کے مزے کی تعریف کررہا تھا۔ چنہو کے خیال میں شراب بہت معمولی قسم کی تھی۔ آدمی کو نشے میں پاکر اس نے کہا، ''جناب...'' اور چند لمحوں کے انتظار کے بعد، تاکہ یہ معزز لقب مخاطب پر اثر کرلے، اس نے پوچھا کہ کشید گاہ کی منیجری کے لیے دوسرا امیدوار کون ہے، اور کوشش کی کہ اس کے لہجے میں صرف بے غرض تجسس کا تاثر ہو۔ اس آدمی نے اپنے مخصوص مویشی صفت تبسم کے ساتھ کہا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ارباب حل وعقد کا پسندیدہ امیدوار چنہو ہی ہے لہٰذا اسے تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ مہذب گفتگو کے آداب پر عمل کرتے ہوئے چنہو نے بھی مسکرا کر کہا کہ اسے خود بھی بالکل تشویش نہیں ہے۔

اس ملاقات میں چنہو کو اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ بتیس سالہ عینک پوش حضرت اس کے اپنے جیسے بادہ نوش ہیں، یعنی موصوف کو سرور تو جلد ہی آجاتا ہے مگر مزید پینے سے ان کا نشہ نہیں بڑھتا۔ باہوش و حواس، متانت سے سامنے بیٹھے، وہ عینک کے شیشوں کے اوپر سے چنہو کو پرکھ رہے تھے۔ ان سے کچھ اور پوچھ گچھ کرکے اپنی بیتابی کو بے نقاب کرنا حماقت ہوتی۔ اس لیے چنہو نے کشید خانے کے

Scanned with CamScanner

بارے میں مزید بات نہیں کی، مہمان کے لیے مزید شراب منگوائی، اور گفتگو کا رخ ملاقات کے ابتدائی موضوع کی طرف پھیر دیا کہ سورج ڈوبنے کے منظر سے اسے پینے کی طلب ہوئی تھی، مگر اس شغل میں ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس آدمی سے رخصت ہوتے ہی چنھو کے دل میں طرح طرح کے وسوسے امڈ آئے۔ اس نے بظاہر تو اخلاص اور راست بازی سے کہا تھا کہ چنھو کے لیے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مگر اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ وہ دوسرے امیدوار سے بھی یہی باتیں نہیں دہرائے گا۔ چنھو کا سوال بالکل سادہ تھا، لیکن پھر بھی وہ آدمی جواب دینے سے گریز کر رہا تھا اور آخر تک اس نے دوسرے امیدوار کا نام نہیں بتایا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس آدمی کے چنھو کے حریف سے اچھے تعلقات تھے۔ کم از کم اتنا تو یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ وہ شخص لگی لپٹی باتیں کرنے میں استاد ہے۔ مشاہدے اور استدلال سے چنھو نے یہ عمومی کلیہ اخذ کیا: ''جو آدمی باہر سے مددگار اور مخلص نظر آتا ہے، عین ممکن ہے کہ وہ اندر سے مکار اور موذی ہو!''

تو پھر کون ہے وہ دوسرا امیدوار؟ وہ کوئی سہی، خود اسی کو خبردار رہنا چاہیے، کیونکہ چنھو حریف کے جال میں پھنسنے والا آدمی نہیں۔ کوریا کی قوم کتنی گر گئی ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں! ''سنبھل کے!'' وہ تقریباً چیخ کر پکارا جیسے کہ دشمن اندھیرے میں نزدیک موجود ہو۔ اس رات نشہ اترنے پر بھی ہر تھوڑی دیر پر اس کی نیند ٹوٹتی رہی اور ایک دفعہ ٹوٹنے پر دوبارہ نیند آنے میں بڑی مشکل ہوئی۔

اگلے دن دفتر پہنچتے ہی چنھو نے کونسوپ کو بتایا کہ کوئی اور آدمی کشید خانے کو قبضے میں لینا چاہتا ہے۔ ایسی بری خبر سے کشید خانے کے ہر وفادار ملازم کو سخت صدمہ پہنچنا چاہیے تھا، لیکن کونسوپ پر کوئی قابلِ ذکر اثر نہیں ہوا، بلکہ اس نے ایک اور کہانی چھیڑ دی۔ کل جب چنھو کشید خانے سے غائب تھا، وہ خود یونین کے جلسے میں حاضری دینے گیا تھا۔ وہاں اس نے یہ نئی باتیں سنیں۔ کشید خانے کا نظم و نسق وزارتِ تجارت نہیں بلکہ وزارتِ مالیات کے ہاتھ میں ہوگا۔ اگر کشید خانے کی ملکیت یونین کے سپرد ہوئی تو اس کی قیمت کی ادائیگی کے لیے ملازموں کی تنخواہوں سے قسطوں میں رقمیں کاٹی جائیں گی۔ لیکن اگر کوئی نجی سرمایہ کار کشید خانے کو خریدنا چاہے تو اسے یکمشت قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ چنھو کو یہ

Scanned with CamScanner

معلومات اہم تو لگیں مگر پھر بھی اس نے سوال کیا کہ کشید خانہ کیسے چلے گا؟ کونسوپ بولا کہ جیسے وہ پہلے ہی بتا چکا ہے، کشید خانہ چلنے کی دو ہی متبادل صورتیں ہیں: یا تو اسے یونین کے انتظام میں دے دیا جائے گا، یا پھر نجی مالکوں کے حوالے ہوگا۔ چنھو نے مزید وضاحت چاہی کہ اگر یونین کی ملکیت ہوئی تو کشید خانے کا مستقبل کیسا ہوگا؟ کونسوپ نے کہا، ''ہمارا مستقبل یونین سے وابستہ ہے۔ یہی صحیح راستہ ہے۔'' حالانکہ چنھو صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ اگر کشید خانہ یونین کے قبضے میں گیا تو اس کی اپنی منیجری کی درخواست کا کیا نتیجہ ہوگا۔

لیکن کونسوپ کے لیے اس قسم کے فیصلے غیر اہم تھے۔ چنھو مزید پوچھ گچھ کے لیے بے چین تھا، مگر یہ بے سود ہوتی۔ کچھ اور سوچ بچار کے بعد چنھو اس نتیجے پر پہنچا کہ کونسوپ نے جو بے تعلقی دکھائی تھی وہ اس لیے نہیں ہوسکتی تھی کہ کسی مخصوص فرد کے منیجر بننے سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ جب کوئی نامعلوم شخص منیجری کا امیدوار ہوسکتا تھا تو کونسوپ بھی یونین کے نمائندے کے طور پر کشید خانے کے انتظام میں دخل دینے کی خواہش رکھ سکتا ہے۔ اس کی یونین میں حد درجے کی سرگرمی اور وابستگی کے پیش نظر یہ عین ممکن تھا۔ مگر آج کل کے زمانے میں باتیں چھپانے، جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے کے بغیر کسی کا گزارہ نہیں ہوسکتا۔ اب اسی چار آنکھوں والے کلرک کو دیکھو جس نے وثوق سے کہا تھا کہ منیجری کی درخواست کے معاملے میں چنھو کو کسی فکر کی ضرورت نہیں، حالانکہ اس کی محکمے کی کشید خانے کے نظم ونسق پر کوئی دسترس نہیں باقی رہی ہے۔ (ازروئے انصاف یہ واضح رہے کہ اس کلرک کو دوسرے آدمی کی درخواست کا علم صرف ایک دن پہلے ہوا تھا۔)

چنھو پر اب سارے اسرار عیاں ہو چکے تھے! بدمعاش کونسوپ کے بلند بانگ دعوے، اصولوں پر اصرار، ''کامریڈ، کامریڈ'' تکیۂ کلام... سب ڈھونگ ہے۔ وہ اخباروں سے بھاری بھرکم الفاظ اڑا کر ان سے دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے، حالانکہ وہ سب ان جاہلوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔ چنھو نے خود کو ملامت کی کہ کیوں اب تک کونسوپ کے فریب کا شکار رہا، اور اس کو مثالی انسان سمجھتا رہا۔ پیٹھ میں چھری گھپوانا آخر اور کس کو کہتے ہیں!

کونسوپ کا خیال چنھو کے دماغ پر سوار رہا۔ بہت کم لوگ اس جیسے کائیاں ہوتے ہیں۔ اس کے موٹے موٹے نیلاہٹ لیے ہونٹوں اور لٹکتی ٹھوڑی سے صاف لالچ ٹپکتی ہے۔ اوپر سے یہ کہ جس

Scanned with CamScanner

دن سے اس نے کشید خانے میں کلرکی شروع کی ہے ——اور اس کی ملازمت کسی بڑی سفارش کا نتیجہ تھی —— اس نے اپنے بارے میں کسی ساتھی کو کچھ نہیں بتایا ہے۔ چنھو نے فیصلہ کرلیا کہ آئندہ وہ اس بدخصال شخص سے معاملت میں بہت محتاط رہے گا۔ بلکہ صرف احتیاط کافی نہیں، اگر کونسوپ کے کسی شیطانی منصوبے کا پتا چلا تو اس کا توڑ کرنا ضروری ہے، ایسا توڑ جس سے منصوبے کے ضرر کی مکمل نفی ہو! لیکن چونکہ ابھی تک ان شبہات کا خاطر خواہ ثبوت موجود نہیں، صبر اور انتظار سے کام لینا ہوگا۔ بہر حال اس وقت ذاتی مقاصد کے لیے اشد ضروری تھا کہ کشید خانہ چلانے کے لیے سرمائے کا انتظام کیا جائے۔

انھی سوچوں میں ڈوبا ہوا جب وہ گھر پہنچا تو بیوی نے ایک اور پٹاخہ چھوڑا۔ اسے کچھ عرصے سے شبہ تھا کہ بیوہ چپکے چپکے گھر کا سامان باہر لے جاتی ہے۔ اور آج لگتا تھا کہ وہ پھر یہی کر رہی ہے۔ بیوہ ہر چند دنوں پر بازار کا چکر لگاتی ہے۔ بظاہر یہ دکھانا مقصود ہے کہ وہ اپنے کھانے پینے کا خود انتظام کرتی ہے، مگر بازار کے پھیروں کو جاتے ہوئے اس کے ساتھ گھر کی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ ٹھیک ابھی وہ بھنڈار میں سامان الٹ پلٹ کر کے کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔ چنھو پہلے ہی کم بپھرا ہوا نہیں تھا۔ بیوی کی بات سن کر وہ آپے سے باہر ہو گیا اور دندناتا ہوا بھنڈار کی طرف دوڑا۔ حسبِ توقع بیوہ وہاں موجود تھی بلکہ اپنی طاقت سے زیادہ بوجھل ایک گٹھری اٹھائے ہوئے کوٹھری سے باہر نکل رہی تھی۔ چنھو نے ڈانٹ کر پوچھا، ''اس میں کیا باندھ رکھا ہے؟'' اس نے جواب دیا، ''بجلی کا ہیٹر۔'' پھر اس سے قبل کہ چنھو کچھ اور پوچھے، بیوہ نے خود ہی بتایا کہ آج جب وہ اپنی بہو سے ملنے گئی تو دیکھا کہ وہ بیمار ہے اور تاتامی کے ٹھنڈے فرش پر لیٹی ہوئی کانپ رہی ہے۔ اس کی اپنی سمجھ میں یہی آیا کہ کم از کم یہ ہیٹر ہی اس غریب کو دے آئے۔

چنھو نے طیش بھری آواز میں کہا کہ ہم لوگوں کو پتا چل گیا ہے کہ وہ اسی طرح سے گھر کی چیزیں چراتی رہتی ہے۔ اگر مان لیں کہ اس کی بہو بیمار ہے تب بھی اُس مکان میں کم از کم ایک کمرہ تو ایسا ہوگا جس میں فرش کو گرم رکھا جاتا ہوگا۔ اور اس کے خیال میں جو بھی اس کمرے میں مقیم ہے اس شخص کے دل میں اپنی ہم قوم جاپانی عورت کے لیے ہمدردی کا اتنا جذبہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے کمرے میں اس کو بھی رہنے دے۔ پھر اس کا بھی تو خیال رکھنا چاہیے کہ اگر کوئی اعلیٰ طبقے کا شخص چنھو کے گھر

Scanned with CamScanner

مہمان ہوتو اس کی تواضع کے لیے ہیٹر کی ضرورت تو ہوگی۔ چنھو نے بیوہ کو مزید بکواس بند کر کے ہیٹر کو مغربی طرز کے کمرے میں لے جا کر رکھنے کا حکم دیا اور مزید انتباہ کے لیے کہا، ''اگر تم نے دوبارہ ایسی حرکت کی تو معافی کی امید مت رکھنا۔'' نادانستہ چنھو نے بیوہ کو اسی طرح ڈانٹا جیسے خاندان کا سربراہ خادموں کو ڈانٹتا ڈپٹتا ہے اور کبھی کبھار رحم کھا کر ان کے قصور معاف بھی کر دیتا ہے۔ سابق مالکۂ مکان نے بھی گھر کی ملازمہ کی طرح کمر تک جھک کر عاجزی سے تسلیم کی جیسے شرمساری سے کہہ رہی ہو کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گی۔

چنھو اس وقت تک انتظار میں کھڑا رہا جب تک بیوہ مغربی کمرے سے واپس ہوتی نہیں نظر آئی۔ لیکن اسی وقت اس نے اپنے سب سے چھوٹے دو بچوں کو راہداری کے پرلے کنارے سے اچھل کود کرتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ اس نے چلا کر بچوں کو خاموشی کی تاکید کی، ''نالائقو، اگر تم لوگ اسی طرح بدتمیزی کرتے رہے اور تمھاری حرکتوں سے کسی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تو کیا نتیجہ ہوگا؟ میں دیواروں پر چپکے کاغذوں میں ایک خراش دیکھنا بھی نہیں برداشت کر سکتا۔ اگر کوئی معزز مہمان آئے تو میں چاہتا ہوں کہ وہ ہمارے رہن سہن سے ہمیں اس شاندار مکان میں قیام کا مستحق سمجھے۔ تمھارے وحشیوں کی طرح دوڑنے سے مہمان کے دل میں کیا خیال آئے گا؟'' بچے ٹھٹک کر پیچھے ہٹنے لگے۔ چنھو نے ایک دفعہ پھر چیخ کر کہا، ''اگر تم نے دوبارہ یہی حرکت کی تو پٹائی کے لیے تیار رہنا!'' اور اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا کہ بچوں کو سزا دینے کے لیے ایک ڈنڈا منگوا لینا چاہیے۔

ان ہیجان انگیز واقعات سے اس کو پینے کی خواہش محسوس ہوئی۔ مہمان خانے میں اپنے بستر کے سرہانے سے خالی بوتل نکال کر اس نے صحن کا رخ کیا۔

یہ اگر پہلے کا زمانہ ہوتا تو چنھو تہہ خانے کی شراب میں کشید خانے کے ساتھیوں کا بھی حصہ رکھتا۔ مگر اب وہ ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ وہ اس کو آئندہ کے لیے بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی نظر پتھر کی لالٹین پر پڑی۔ لو، ابھی تک اس کی مرمت کے لیے سیمنٹ نہیں منگوائی گئی ہے۔ آدمی بے حد مصروف ہو تو بہت اہم کام بھی اس کے ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ ایسے سخت محنت مشقت میں گزارے ہوئے دن کے بعد رات کو تھوڑا بہت ضرور پینا چاہیے!

Scanned with CamScanner

تہہ خانے کے سوجو کے ذخیرے سے بوتل بھر لینے کے بعد وہ مہمان خانے میں گیا۔ وہاں اس نے چاول کے پیالے میں شراب انڈیلی اور اس کے ساتھ شغل کے لیے بیوی سے کم چی کا اچار منگوایا۔ پرانے زمانے میں بسیارنوشی میں چنھو کا مقابلہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی (حالانکہ زیادہ تر وہ صرف دوسروں کی پیش کی ہوئی شراب پیتا تھا) مگر اِدھر اس کے جسم میں شراب کی مستقل موجودگی کی وجہ سے آدھی بوتل ہی میں اسے سرور آجاتا تھا۔ آج پیالہ ذرا بڑا تھا اس لیے اور جلدی اثر ہوا۔ ترنگ میں خیالات کا سلسلہ کچھ اس قماش کا رہا:

"دیکھ لینا میرے دوستو۔ اچھا تو کونسوپ برخوردار، تم اس زعم میں ہو کہ تم میرا پتّا کاٹ دو گے۔ کتے کے بچے! کشید خانے کی لیڈری کے شوق میں اپنا اصلی کام چھوڑ چھاڑ کر اب تو میری جگہ لینے کے چکر میں ہے۔ تجھی جیسے ننگِ وطن لوگوں کی وجہ سے آج کوریا یوں سڑ رہا ہے۔ اور یہ مجال تیری کہ مجھے 'کامریڈ' پکارے۔ ہاں، یہ ٹھیک ہے کہ مجھے خود شروع میں سب پر اعتبار تھا، اور میں بھی سب کو کامریڈ کہتا تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب کیسے ہوگیا کہ تجھ جیسا حرامی پلاّ بھی مجھے کامریڈ پکارے۔ اور اسی پر بس نہیں، اب ہرایرے غیرے نے مجھ کو اپنا کامریڈ سمجھ رکھا ہے۔ اب کچھ بھی ہو، مجھے کہیں نہ کہیں سے سرمایہ ڈھونڈ کر اپنی بات منوانی ہی پڑے گی! سرمایہ کہاں سے مل سکتا ہے؟ ارے ہاں، وہ پِل بائے! — اس نے کپڑوں کی فیکٹری لگا کر بڑی دولت کمائی ہے۔ مجھے پہلے کیوں اس کا خیال نہیں آیا تھا؟ ہم دونوں ایک ہی شہر کے تو ہیں۔ تو ابھی چلوں میں اس سے ملنے؟ نہیں، اتنی اہم بات کے لیے نشے کی حالت میں ملنا ٹھیک نہیں۔ کل صبح بہتر رہے گا۔ چلو فیصلہ ہوگیا۔ تو ٹھیک ہے، اس وقت ذرا سا اور پی سکتے ہیں۔"

... اس نے ایک پیالہ اور بھرا۔ بوتل سے پیالے میں گرنے میں شراب کی قلقل کی آواز کا مزہ لیا اور پورا پیالہ ایک ہی گھونٹ میں چڑھا کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ لیکن نشہ زائل ہونے پر اس کی نیند ٹوٹ گئی، اور پھر ساری رات دوبارہ نہیں آسکی۔

صبح ہوتے ہی چنھو نے اپنے سوٹ کو پھر برش سے خوب رگڑا، ٹائی باندھی، اور کشید خانہ جانے سے پہلے پِل بائے سے ملاقات کو روانہ ہوا۔ رستے بھر اس کا ذہن بھی دوڑ لگاتا رہا۔ ایک دفعہ جب وہ کشید خانے سے ملی ہوئی اپنے حصے کی شراب دے کر بدلے میں چاول یا کپڑے حاصل کرنا چاہتا تھا

تو اس وقت پل بائے سے کاروبار کرنے کا خیال اس کے ذہن میں آیا تھا۔ مگر بات یہ ہے کہ کسی سے جتنے قریبی تعلقات ہو جائیں، اس سے اپنے لیے زیادہ فائدے والا لین دین اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ اچھا ہی ہوا جو اس نے پہلے کبھی پل بائے سے مل کر کوئی کاروبار نہیں کیا تھا۔ لہٰذا دونوں کے درمیان بدگمانیاں پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اب بات یہ ہے کہ جامہ ساز پل بائے بھی تیز آدمی تھا، اور خود ہی جان پہچان کے لوگوں کے ساتھ لین دین کا قائل نہیں تھا۔ اس لیے صبح کی گفتگو کے دوران اس چالیس سالہ سیٹھ نے پیش بندی کے طور پر چنھو سے کہا کہ وہ صرف ایسے کاروبار میں ہاتھ ڈالتا ہے جس کی ساری جزئیات اس کی سمجھ میں آتی ہوں۔ مجبوراً چنھو کو پل بائے سے صرف ''میں اس کے بارے میں سوچوں گا'' کا چھوٹا سا جملہ اگلوانے کے لیے ایک لمبی چوڑی تقریر جھاڑنی پڑی۔ اس نے پہلے تفصیلی تاریخ بیان کی کہ کیسے ناکامورا جب کوریا پہنچا تھا تو اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ پہلے وہ ایک شراب کے تھوک فروش کے ہاں کلرکی کرتا رہا۔ پھر اپنے پیدائشی شہر کے ایک دولتمند آدمی سے سرمایہ ساجھے پر لے کر اس نے الکحل کی کشید کا ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کیا۔ اور دیکھو اب سات آٹھ سال کے بعد کاروبار کتنا بڑھ چکا ہے۔ چنھو نے اپنی آنکھوں سے یہ ترقی دیکھی ہے، کیونکہ شروع سے اس کشید خانے میں ملازم رہا ہے۔ اس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ چن نامپو میں ناکامورا نے جو مل لگائی تھی اس کا پورا سرمایہ کشید گاہ کے منافعے سے نکلا تھا۔ یہ کشید خانہ جلد ہی خریداری کے لیے دستیاب ہوگا اور اغلب یہی ہے کہ قیمت بڑی مناسب ہوگی۔ اگر کسی طرح چنھو اس کا منتظم بن سکے تو اسے پورا یقین ہے کہ وہ بس دو تین سال کے اندر اس میں لگا ہوا پورا سرمایہ واپس ادا کر سکتا ہے۔ ''میں دعوے سے کہتا ہوں!''

پل بائے کے مختصر جواب ''میں اس کے بارے میں سوچوں گا'' کو چنھو نے اپنی کامیابی سمجھا، اور شام کو دوبارہ ملاقات کے لیے آنے کا نوٹس دے کر وہاں سے واپس ہو گیا۔

کشید خانے پہنچتے ہی اس نے کونسوپ کو بتایا کہ کشید خانے کے لیے ایک سرمایہ کار مل گیا ہے۔ کونسوپ نے (چنھو کے خیال میں سرد مہری سے) جواب دیا کہ آج کل بہت سے لوگ جو فیکٹریوں اور کمپنیوں میں ذرا اونچے عہدوں پر ہیں خود کو کمپنی کا صدر سمجھنے لگے ہیں۔ ان بر خود غلط حضرات کو کہیں سے تھوڑا سا سرمایہ مل جائے تو ان کا دماغ اور آسمان پر چڑھ جاتا ہے۔ ان کے چکروں میں پڑنے

Scanned with CamScanner

سے کہیں بہتر ہے کہ ملازمین کشید خانے پر اپنی اجتماعی ملکیت کے لیے اسے یونین کے قبضے میں دے دیں۔

چنہو سمجھ گیا کہ کونسوپ اسے بھی ان ہی خود فریبوں میں گنتا ہے جو کمپنی کا صدر ہونے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ''بس اتنا ہی سننا کافی ہے۔'' ظاہر ہے کہ کونسوپ یونین کی سرگرمیوں کی آڑ لے کر کشید خانے کا نمائندہ بننا چاہتا ہے۔ ثبوت چاہو تو اس کی یخ بستہ نگاہوں کو دیکھ لو۔ اگر کونسوپ کشید خانے کا نمائندہ بننے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کرے تو چنہو کو بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے کونسوپ سے بحث کی: ''لیکن جب سرمایہ فراہم ہے ہی تو پھر یونین کو بیچ میں لانے کا کیا فائدہ؟'' کونسوپ نے سیدھا سا جواب دینے کی بجائے کہا کہ یونین کے معاملات سے متعلق اور کئی مسائل ہیں، اس لیے سب پر غور ہونے کے لیے یونین کا ایک عام جلسہ ہونا چاہیے۔

''گویا اس مردود نے جاہل ملازمین میں سے ہم خیالوں کا ایک ٹولہ بنا لیا ہے۔ اور وہ موقعے کو ضرور اپنی غرض کے لیے استعمال کرے گا۔ مگر سرمایہ مل گیا تو اس کے انھی مریدوں کو توڑنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ ویسے بھی ان میں سے اکثر لوگ کونسوپ سے پہلے ملازم ہوئے تھے۔ وہ اس کے مقابلے میں میرے ساتھ زیادہ رہے ہیں۔''

دن ختم ہونے والا ہی تھا کہ ایک ملازم نے چنہو سے کشید خانے کے باہر نکل کر ملنا چاہا۔ ملاقات کا مقصد یہ تھا: اس آدمی اور اس کے خاندان کے پاس رہنے کی کوئی جگہ نہیں تھی، اس لیے وہ لوگ بڑی مصیبت میں مبتلا تھے۔ کیا چنہو ان کو اپنے مکان میں ایک کمرہ دے سکتا تھا؟ چنہو نے پہچان لیا کہ نئے مکان میں منتقلی کے دوران اس آدمی نے مکان کی صفائی میں ہاتھ بٹایا تھا۔ چنہو نے کہا، ''تم کو معلوم ہی ہوگا کہ اگرچہ مکان خاصا بڑا ہے مگر وہاں سارے کمروں میں تاتامی کی چٹائیاں بچھی ہیں اس لیے مکان واقعی دو خاندانوں کے لیے موزوں نہیں ہے۔'' اس آدمی نے جواب دیا کہ وہ ایک کمرے سے تاتامی اٹھوا کر اس میں فرش گرم کرنے کا انتظام کروا سکتا ہے۔ چنہو کو کشید خانے میں بنا ہوا چوکیدار کا کمرہ یاد آیا، اس لیے اس نے اس آدمی کو وہاں رہنے کا مشورہ دیا۔ آدمی نے جواب دیا کہ اس کمرے میں بھی تاتامی ہی بچھی ہے اور اس کو سردی میں رہنے کے لائق بنانے میں کہیں زیادہ خرچہ اور محنت درکار ہے۔ اس نے دوبارہ بڑی منت سے چنہو کے مکان کے ایک ننھے سے گوشے میں

رہنے کی اجازت مانگی۔ چنھو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر وہ ضدی شخص چوکیدار کے کمرے میں رہنے سے کیوں کترا رہا ہے۔ آخر چنھو اور اس کے خاندان نے اس میں گزارہ کر ہی لیا تھا! پھر اگر ایک کمرہ کم ہو گیا تو اس مکان کی ساری شان و شوکت خاک میں مل جائے گی۔ اور ایمان کی بات یہ تھی کہ وہ مہمان خانے کی خلوت اور سکون کا عادی ہو چکا تھا۔ نہیں، کمرہ دینے سے ساری فضا بگڑ جائے گی۔ اس لیے اس نے آدمی کو بے ٹوک بتا دیا کہ اسے کمرہ نہیں مل سکتا۔ ظاہر ہے کہ آدمی کو یہ بات پسند نہیں آئی ہوگی۔ چنھو نے دل ہی دل میں سوچا: لو، کونسوپ کو ایک اور طرفدار مل گیا۔

اور اب نئے زاویے سے سوچنے پر سارے طبق اس پر روشن ہو گئے۔ پچھلے ہی دن اسے ساتھیوں کا برتاؤ بدلا ہوا لگا تھا۔ یہ لوگ دو دو تین تین کی تعداد میں اکٹھا ہو کر باتیں کیا کرتے ہیں۔ وہ ان باتوں کا صحیح تصور کر سکتا تھا: اگر ہمیں پتا ہوتا کہ کشید خانے کی سیاست یہ رنگ لانے والی ہے تو ہم کوئی اور ملازمت تلاش کرتے؛ فلاں آدمی لکڑی پھاڑنے کے کام سے اتنی اجرت کما رہا ہے؛ فلاں اپنے ٹرک پر لوگوں کا سامان ڈھوتا ہے اور اس کے اتنے پیسے لیتا ہے لیکن ان لوگوں کی شکایتیں سراسر ناجائز ہیں! کشید خانے کے کام میں کسی کا ہاتھ تک گندہ نہیں ہوتا۔ لیکن واقعی اگر کشید خانے کا انتظام بہتر نہیں ہوا تو یہ لوگ (اپنی جوؤں سمیت) فاقوں مریں گے، اور ان کے بچوں کو اتنا کم کھانے کو ملے گا کہ ان کا پاخانہ رک جائے گا۔ ملازمین کے درمیان کمپنی کی اندوختہ الکحل کے تقسیم ہونے کی معقول تجویز پر کل ان بیوقوفوں نے کان نہیں دھرا؛ آج انھیں پیپوں کے پاس پھٹکنے تک کی اجازت نہیں ہے۔ کیا نراج ہے!—اطراف میں ہونے والی ساری شکایتیں چنھو پر آشکارا ہو رہی تھیں۔

ملازمین کی شکایتوں میں خود اسی کا فائدہ تھا، چنھو نے سوچا۔ اب کشید خانے میں ذخیرہ کی ہوئی الکحل کے مسئلے ہی کو لو۔ کونسوپ نے کہا تھا کہ اس کا فیصلہ ملازمین نہیں کر سکتے تھے، لیکن چنھو دوسروں سے متفق تھا۔ اور اب جبکہ ان کی رائے غلط ثابت ہو گئی تو اس میں اکیلے اس کا قصور تو نہیں تھا۔ پھر بھی نہ جانے اسی کو کیوں الزام دیا جا رہا تھا۔ (اصل میں ملازمین کی شکایت کا ہدف کونسوپ تھا، کیونکہ وہی یونین آتا جاتا رہتا تھا۔ اگر وہ اکثریت کی رائے کو موثر دلیلوں سے یونین کو سمجھا دیتا تو شاید یونین والے بھی یہی رائے اختیار کر لیتے کہ ملازمین الکحل کا ذخیرہ جیسے چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔)

مگر چنھو کیوں فکر میں دبلا ہو۔ یہ لوگ ابھی جتنا چاہیں اس سے روٹھے رہیں۔ جیسے ہی سرمایہ اس کے ہاتھ میں آجائے گا، یہی لوگ قطار در قطار اس کی دہلیز پر حاضری دینے آئیں گے!

سورج ڈوبتے ہی چنھو سوجو کی تین بوتلیں لیے پل بائے کے گھر حاضر ہوا۔ مگر پل بائے کم نوش نکلا اور اسی الکحل سے چنھو کی تواضع کرنے لگا۔ اپنے ہی تحفے کی پینے میں بداخلاقی ہوتی، اس لیے چنھو بیچارہ یہاں جی بھر کر پی بھی نہ پایا۔ اُدھر ملاقات کے آخر تک پل بائے نے ملاقات کے مقصد یعنی سرمایہ کاری کے سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کی۔ اب چاہے وہ کسی نامانوس کاروبار کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتا تھا، یا کسی بھی طرح کے کاروبار میں کوئی بڑی رقم اس بحرانی دور میں علانیہ نہیں لگانا چاہتا تھا، پل بائے کی ہچکچاہٹ کی وجہ کسی طرح چنھو کی سمجھ میں نہیں آئی۔ پل بائے صرف اتنے پر رضامند ہوا کہ چنھو اسے بس کشید خانے کے اثاثوں کی تفصیلی فہرست اور ضرورت کے سرمایے کا تخمینہ مہیا کر دے۔ اس نے ایک کڑی شرط اور لگا دی کہ پل بائے سے خطاب میں چنھو ''بڑے بھائی'' کا لقب اور آداب استعمال کرے گا — یہ صریحاً زیادتی تھی کیونکہ وہ چنھو سے صرف ایک سال بڑا تھا۔ دونوں ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے اور پہلے ان میں کبھی اس قسم کا تکلف نہیں برتا گیا تھا — اس کے علاوہ پل بائے سے جواب لینے کے لیے چنھو کو کشید خانے کی تاریخ اور اپنی قابلیت کا مفصل ذکر نئے سرے سے کرنا پڑا۔ مثلاً یہ کہ ناکامورا جب کوریا آیا تھا تو پھکڑ تھا اور اب اس کے پاس بہت ساری دولت جمع ہوگئی ہے، یا یہ کہ چنھو کشید کے کام کے ہر پہلو کا ماہر ہے اور بند آنکھوں سے کشید خانہ چلا سکتا ہے۔ اور یہ کہ کاروبار اتنا ہی محفوظ ہے جیسے پانی میں بطخ۔ چنھو کو آخر آخر تک اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ مگر میزبان کے پیچھے پڑ جانا شریف آدمی کا وطیرہ نہیں ہوتا، اس لیے چنھو نے رخصت کی اجازت طلب کی اور کہا کہ چند دنوں کے بعد وہ پھر ملاقات کو حاضر ہوگا۔

باہر اندھیرا ہو چلا تھا۔ چنھو کو نشے کی بدمزگی محسوس ہو رہی تھی۔ گھر جاتے ہوئے وہ تائے دونگ دریا کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ ایک پولیس چوکی کے قریب سے، اور پھر ایک پلازا سے ہٹ کر، گزرتے ہوئے اس پر مستقل یہی فکر سوار رہی کہ اگر پل بائے سے بات چیت کامیاب نہیں ہوئی تو کیا بنے گا۔ لیکن مزید غور و فکر سے یہ خوش آئند نتیجہ برآمد ہوا کہ اگرچہ موجودہ مسئلے کا حل بچوں کا کھیل نہیں ہے، پھر بھی پل بائے جیسے سیانے کاروباری کو جس حد تک راضی کر لیا گیا ہے وہ بذات خود

Scanned with CamScanner

اس بات کا ثبوت ہے کہ گفت وشنید صحیح سمت میں آگے بڑھ رہی ہے۔ خیال کے اس مرحلے پر پہنچ کر اسے بڑی طمانیت محسوس ہوئی۔

چنھو اسی سوچ میں مگن تھا کہ کوئی اس سے ٹکرایا، جس سے وہ گرتے گرتے بچا، پھر رک کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے ٹکرانے والی ایک متوسط عمر کی عورت تھی، جس کے سر پر رکھی ہوئی تیلیوں کی بنی ہوئی ٹوکری زمین پر گر پڑی تھی اور اس میں کی مولیاں چاروں طرف بکھر گئی تھیں۔ مولیوں کو اٹھانے کے ساتھ عورت بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ جب چنھو نے بھی اُدھر ہی نظریں دوڑائیں تو وہاں ایک حیرت انگیز تماشا دیکھا۔ ایک آدمی، جو یقیناً پولیس کا سپاہی تھا، پستول تانے، نپے تلے قدموں کے ساتھ، پیچھے کی طرف چل رہا تھا۔ چھ سات فٹ آگے کوئی درجن بھر آدمی کندھوں سے اوپر ہاتھ اٹھائے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سپاہی کے ساتھ قدم ملا کر حرکت کر رہے ہیں۔ سپاہی چاق و چوبند نظروں سے ان لوگوں کا پہرہ کیے ہوئے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، اور وہ جیسے ہی ایک قدم پیچھے رکھتا، تو وہ لوگ اس کی طرف ایک قدم آگے بڑھاتے۔ ایسا سماں چنھو نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی اسے نرسری اسکول کا وہ سبق یاد آ گیا جس میں استانی بچوں کو کوئی خاص طرح کا ناچ سکھا رہی تھی۔ ڈرامے کے کسی خوف انگیز لیکن پر کشش منظر جیسا یہ تماشا اس وقت تک جاری رہا جب تک سپاہی اور دوسرے سارے آدمی پولیس چوکی کی نچلی منزل تک اتر کر نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔

جب سارے آدمی پولیس چوکی میں غائب ہو گئے تو چنھو کو اردگرد کھڑے تماشائیوں کی بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دیں۔ کسی نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ کسی اور نے جواب دیا کہ جاپانیوں کے سازشی جتھے پکڑے جا رہے ہیں۔ چنھو پل بائے کے گھر سے نکلنے کے بعد اب تک خاصا پریشاں خیال رہا تھا۔ لیکن جس طرح ایک درجن افراد پر ایک فرد نے اکیلے قابو کر لیا تھا وہ نظارہ بڑا فرحت بخش ثابت ہوا۔ سازشیوں کی چوں چرا کے بغیر اطاعت بہت سکون افزا بات تھی۔

گھر پہنچ کر اس کے دماغ میں دونوں خیال متصادم رہے۔ ایک طرف تو وہ تازہ تازہ دل خوش کن منظر تھا، دوسری طرف وہ فکر تھی کہ کشید خانے کا منیجر کس کو بنایا جائے گا۔ تصادم کے حل کے لیے تھوڑی سی سوجھ بوجھ کی مدد درکار تھی، جو رات کے کھانے کے ساتھ چلے گی۔ اس لیے چنھو بوتل تہہ خانے

سے بھر لایا۔ اتنے میں جاپانی بیوہ نے اطلاع دی کہ غسل کے لیے گرم پانی تیار ہے۔ چنھو کو احساس ہوا کہ کئی دن غسل ناغہ ہوا تھا، آج ضرور نہانا ہے، اور کئی دن کے بعد آج اچھی طرح سونا ہے۔ مگر اس سے پہلے ایک دو گھونٹ چاہییں!

آدھی سے زیادہ بوتل پینے کے بعد چنھو ترنگ میں آ گیا۔ کشید خانے کی فکریں جاتی رہیں اور ذہن پر مکمل سکون طاری ہو گیا۔ چند لقمے کھاتے ہی وہ غسل کا خیال بھول بھال کر بستر پر دراز ہو گیا اور لمبی تان کر سو گیا۔

اس رات بھی حسبِ معمول نشہ اترنے کے ساتھ ہی اس کی نیند اچاٹ ہو گئی اور وہ صبح تک بے چین جاگتا رہا۔ نیند لانے کے لیے اس نے پھر ایک بڑا پیالہ بھر کر سوجو پی۔ اس سے تھوڑی بہت نیند تو آئی مگر عجیب عجیب بدخوابیوں کے مارے اسے بالکل آرام نہیں ملا۔ اس نے خواب میں خود کو غسل کرتے دیکھا۔ مگر جلد ہی ٹب کشید خانے میں واقع الکحل کے ذخیرے کے ایک حوض میں تبدیل ہو گیا۔ ''کوئی بات نہیں۔ یہ جی بھر کے پینے کا اچھا موقع ہے۔'' وہ حوض میں تیرتا، تہہ تک غوطے مارتا اور الکحل پیتا رہا۔ سیر ہو کر اس نے حوض سے باہر نکلنا چاہا مگر یہ ناممکن تھا، کیونکہ پکڑ کر اوپر چڑھنے کے لیے کسی طرف کوئی سہارا نہیں تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ اس نے اوپر دیکھا تو وہاں حرامزادہ کونسوپ حوض کی منڈیر پر کھڑا سر نہوڑائے اپنی مخصوص سرد نگاہوں سے چنھو کو گھور رہا تھا۔ اس کے برابر میں ایک اور آدمی کھڑا تھا۔ یہ کمبخت وہی شخص نکلا جس نے چنھو کے مکان میں کمرہ مانگا تھا اور انکار پر چراغ پا ہو گیا تھا۔ اور پھر دیکھا تو وہاں صرف یہی دو آدمی نہیں تھے بلکہ کشید خانے کے ملازمین کا ایک بڑا سا جمگھٹا تھا۔ یہ سب بے مروت لوگ چنھو کی بے بسی کا تماشا مزے لے کر دیکھ رہے تھے، ان سب میں سے ایک آدمی بھی چنھو کو بچانے کے لیے ہاتھ بڑھانے کو تیار نہیں نظر آتا تھا۔ ''ٹھیک ہے تو میں اپنا کام خود ہی نپٹاؤں گا، تم دیکھ لینا!'' اگرچہ حوض سے نکلنا اس کے بس میں نہیں تھا مگر پھر بھی وہ ان ملعونوں سے سہارا مانگنے کو تیار نہیں تھا۔ ''یہ میری عزتِ نفس کا سوال ہے۔'' وہ بے نتیجہ پوری طاقت سے ہاتھ مارتا رہا، یہاں تک کہ وہ اس خواب سے جاگ گیا۔ اس کا سارا بدن ٹھنڈے پسینے سے شرابور تھا۔

دیر سے اٹھنے کے باعث چنھو کام پر دیر سے پہنچا۔ پہنچتے ہی کونسوپ نے خبردار کیا کہ شام

Scanned with CamScanner

کے جلسے میں حاضری ضروری ہے۔ چنھو نے بتایا کہ سرمائے کے لیے ایک قابل اعتبار ذریعہ اس کو مل گیا ہے۔ جواب میں کونسوپ نے یہ کہا (جو چنھو کے خیال میں اس نے اپنی بے حد سرد مہر نگاہیں چنھو سے لڑاتے ہوئے، اور بڑے مغرورانداز میں، کہا تھا): ''ٹھیک ہے، تو اس پر بھی آج شام بات کر لیں گے۔ ویسے میری سنو تو چونکہ ہم غریب ملازم لوگ سرمایہ اکٹھا نہیں کر سکتے، اس لیے ہمارے خیال میں یونین کا انتظام کسی ایک فرد کی دولت کا سہارا لینے سے کہیں بہتر رہے گا۔''

''یونین! ہر وقت کی رٹ یونین!'' چنھو نے سوچا۔ ''اکڑ دکھانے والا، حرامی — : ذرا اس کا اینٹھا ہوا لہجہ تو دیکھو— گویا یہ ملازموں کے فائدے کے لیے ہو رہا ہے۔ کیوں نہیں، وہ پیچھے کھڑے دروازے سے کان لگائے اس کی باتیں جو سن رہے ہیں! جب ایک آدمی نے پاپڑ بیل کے رقم حاصل کر ہی لی ہے تو پھر یونین کو بیچ میں اڑا کر کشید خانے کو کیوں مصیبت میں ڈالو؟'' ان کی منطق اس کی عقل سے باہر تھی۔ کوئی بات نہیں، وہ شام کے جلسے میں سب کچھ سمجھائے گا۔ بقیہ دن بھر چنھو نے پل بائے کو دینے کے لیے کشید خانے کے اثاثوں کی تفصیلی فہرست تیار کی۔ جب یہ کام ختم ہوا تو اس کے پپوٹے بوجھل ہونے لگے۔ وہ کئی دنوں سے ٹھیک سے سو نہیں پایا تھا۔

جلسہ چھ بجے ہونے والا تھا۔ چنھو ذرا سویرے ڈنر کھا لینے کے لیے گھر چلا گیا۔ لیکن ذہن میں اتنے سارے خیالات کا دنگل مچا ہوا تھا کہ سکون کے لیے اس نے کھانے کی بجائے پینے پر توجہ کی۔ پہلے تو اس کا ارادہ تھا کہ وہ کھانے کے ساتھ تھوڑا سا پیے گا، لیکن پھر اسے یہی بہتر لگا کہ جی بھر کے پیے تاکہ جلسے میں بغیر کسی جھجک اور رکاوٹ کے اپنے تمام خیالات سب کے سامنے پیش کر دے۔ اس لیے سوجو کی ایک بڑی بوتل سے شروعات کی۔ جلد ہی اتنا اندھیرا چھا گیا کہ روشنی جلانی پڑی۔ کوٹ تنگ لگ رہا تھا، سو اتار دیا۔

اب سب کشید خانے میں جمع ہو کر اس کے منتظر ہوں گے۔ ہاں، اور وہ کتیا کا جنا کونسوپ کھڑا کشید خانے کے الکحل کے ذخیرے کا ذکر کر رہا ہوگا؛ یا شاید وہ فوری عملی کارروائی کی شق کے طور پر تجویز کر رہا ہوگا کہ لوگ اسی وقت جا کر چنھو کے تہہ خانے کی شراب نکال کر آپس میں بانٹ لیں؛ یا شاید وہ کشید خانہ چلانے کا موضوع گھما پھرا کر دوبارہ لے آیا ہوگا، اور یونین کے انتظام کے قصیدے پڑھ رہا ہوگا، انھی بھاری بھاری لفظوں اور جملوں کے ساتھ جو یہ جاہل ملازمین خاک سمجھتے ہوں گے۔

Scanned with CamScanner

ان لوگوں کے خیال میں شاید کونسوپ بڑا اونچا آدمی ہے۔ شاید وہ اس کے ایک ایک لفظ کو صحیح گردانتے ہیں۔ ''اور کیوں نہ ہو۔ سالے نے مجھ تک کو بہکا دیا تھا۔'' کونسوپ کی تصویر، مع اس کے دیوہیکل منھ کے، چنھو کے ذہن میں ابھری۔ ''تو جس آدمی نے اپنے بیس سال کشید خانے کی خدمت میں گزار دیے، تم خنزیر کی اولادو اس آدمی کا ساتھ چھوڑنے کو تیار بیٹھے ہو۔ اسی لیے تم میرے پہنچنے سے پہلے جلسہ کرنا چاہتے ہو، ہے نا؟''

اس کو احساس بھی نہیں ہوا کہ اس نے اچانک چیخنا شروع کر دیا ہے: ''سازش! سازش!'' اس کے دشمن سازش کر رہے تھے، بالکل ویسی ہی جیسی وہ جاپانی سازش کل نظر آئی تھی۔ اس کے ابھرے ہوے دیدے، جو نیند کی کمی اور نشے سے ویسے ہی خون کی طرح سرخ ہو رہے تھے، اور ابل پڑے، اور ان کے بیچ سے ایک عجیب وحشیانہ نوع کی نگاہ نمودار ہوئی۔ وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ ارے، پستول کہاں چلا گیا؟ ''اچھا چلو، یہیں کہیں پر کوئی چاقو ہوگا!''

چنھو باورچی خانے میں گھس گیا۔ اس کی بیوی بغل کے، گرم فرش والے، کمرے میں تھی۔ اس نے بیچ کا خدمتی دروازہ کھول کر پوچھا کہ کیا وہ کھانا ڈھونڈ رہا ہے۔ چنھو نے بہانہ کیا کہ اسے پیاس لگ رہی تھی اس لیے ابھی وہ پانی لینے باورچی خانے میں آیا ہے، مگر وہ کھانا جلسے سے واپسی پر کھائے گا۔ یہ سوچتے ہوے کہ یہ عمل دیکھ کر بیوی دروازہ بند کر لے گی، اس نے تھوڑا سا پانی بھی پی لیا۔ اس سے واقعی پیاس بڑھ گئی اس لیے اس نے اور کئی گھونٹ لیے۔ لیکن جیسے ہی بیوی نے خدمتی دروازہ بند کیا، اس نے جلدی سے ڈھونڈ کر ایک چاقو اٹھا لیا، اور اسے جیب میں ڈال کر باہر نکل گیا۔

''کتے کے بچو، چکھنا تم اس کا مزہ۔''

گلیاں اندھیری ہو چکی تھیں۔ خزاں کی مکمل عملداری تھی۔ تیز چلتی ہوئی برفیلی ہوا ذرے ذرے میں گھسی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے اور سینے کو ٹھنڈک پہنچی — جیکٹ کے بٹن کھلے تھے — مگر نشے میں قابلِ ذکر کمی نہیں آئی۔ چنھو کے قدم ڈانواڈول تھے۔ نیند کی کمی اور الکحل کے اثر سے حواس اور فکر میں توازن اور کم تھا۔

لڑکھڑا کر چلتے ہوے وہ چیخ رہا تھا: ''سؤر کی اولادو، سازش کے مجرمو، دیکھنا میں تمھیں کیسا مزہ چکھاتا ہوں!'' راہگیر ہنس کر کہہ رہے تھے: ''ہاں، ضرور۔ آزادی زندہ باد!'' چنھو ان پر توجہ دیے بغیر

دیوانہ وار آگے بڑھتا رہا۔ ''بتاؤ ذرا، تم لوگ کتوں سے کس لحاظ سے بہتر ہو؟ مجھے دیکھو، میں نے اپنی ساری جوانی کشید خانے پر تج دی، اور تم کسی اور کو اس کا نمائندہ بنا رہے ہو! کمینو، کان دھر کر میری بات سنو۔ وہ کون تھا جس نے سو سو وون کے نوٹوں کی گڈی پھینک دی؟ گڈی میں کچھ نہیں تو پانچ چھ ہزار وون تو ہوں گے ہی۔ کس نے رشوت کے یہ سارے نوٹ پاس رکھنے کی بجائے ہوا میں اچھال دیے؟ کون ہے جو تم کو اچھا مستقبل دینے کا اہل ہے؟ اور تم مجھی کو کاٹ کر پھینک دینا چاہتے ہو! احمقو، تم مر کیوں نہیں جاتے!'' وہ رات کی طرح جیل کے پاس سے گزرا جو اس وقت اندھیرے سے ڈھنپا ہوا تھا۔ ''ہاں، میں تم سب سازشیوں کو اسی جیل میں بند کرنے والا ہوں۔ دیکھ لوگے۔ تم سب دیکھ لوگے۔''

سوسونگ نی شہر کے یگ یونگ کشید خانے کے چوکیدار کے کمرے کی روشنی جل رہی تھی۔ ''غدارو، تم سب موت کے مستحق ہو!'' یہ کہتے ہوئے کبھی لڑکھڑا کر چلتے ہوئے، کبھی لہرا کر دوڑتے ہوئے، چنہو کشید خانے کا پھاٹک کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ چاقو لہرا کر وہ چلّایا: ''ہاتھ اوپر! کتے کے بچو، ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ اور کوئی ایک انچ بھی نہ کھسکے!''

ملازمین اچنبھے میں آ کر ٹھٹکے۔ کونسوپ کھڑا ہو گیا۔ ''ہاتھ اوپر!'' چنہو پھٹی پھٹی آواز کے ساتھ اور زور سے بھونکا۔ وہ کونسوپ کی طرف بڑھا مگر اس کی ٹانگیں آپس میں پھنس کر رہ گئیں اور وہ چہرے کے بل گر پڑا۔ سارے ملازمین نے چاروں طرف سے اسے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک بھاری کراہ سنائی دی جو شاید اس کی ذات کی کسی گہری تہہ سے باہر آئی تھی، اور چاقو والے ہاتھ میں کمزوری لرزش ہوئی۔ کچھ کہے بغیر آگے بڑھ کر کونسوپ نے چاقو اس کے ہاتھ سے لے کر ایک طرف پھینک دیا۔

چنہو نے آنسو بھری آنکھیں آدھی کھول کر اوپر کی سمت دیکھا، اور اٹھنے کی کوشش کی۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کا منہ دوبارہ تاتامی کی چٹائی پر گر گیا۔

❁❁

Scanned with CamScanner

ارشد محمود

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

قیمت: 200 روپے

ہم نے اپنے ماحول اور انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس حد تک جامد، خشک، بور، بے کیف، حسن اور لطف سے عاری کر رکھا ہے کہ بحیثیت حیوان جن جبلی خوشیوں پر ہمارا حق ہو سکتا تھا، یہ کہہ کر کہ ہم حیوان نہیں انسان ہیں، اُن سے خود کو محروم کر لیا، اور انسان ہونے کے ناتے جن خوشیوں پر حق ہو سکتا تھا انھیں یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہم انسان نہیں مسلمان ہیں۔ یہ ہے ہمارا ثقافتی المیہ۔ نتیجہ یہ کہ ہم اجتماعی طور پر حسن کے احساس اور خوشیوں کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہیں، بلکہ ان کے بیری بن چکے ہیں۔ اب سنجیدگی کا مارا، تاریکی پسند اور جمالیاتی حسوں سے محروم انبوہ کثیر، عالمی تہذیب نو سے اپنی ثقافتی، سیاسی اور معاشی دشمنی میں اضافہ کیے چلا جا رہا ہے۔ بربادی اور موت کی علامتوں سے اپنی شاہراہوں کو سجانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ خود ساختہ اخلاقیات اور پارسائی کے خبط نے ماحول میں مُردنی، گھٹن اور بے کیفی اس حد تک پیدا کر رکھی ہے کہ اس کے اندر زندگی اور دنیا کو خوبصورت بنانے یا اسے ترقی دینے کی لگن اور دلچسپی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ایک طرف ہماری طاقتور ایلیٹ (elite) حکمران کلاس ہے، جو حیوانی اور انسانی سطح کی سب جبلی لذتوں سے بہرہ مند ہے۔ اس نے اخلاقیات اور پاک دامنی کے سب اسباق عام آدمی کے لیے رکھ چھوڑے ہیں، تاکہ عوام کے حصے کی خوشیوں پر قبضہ جاری رکھا جا سکے۔ دوسری طرف کروڑوں عوام کا وہ جم غفیر ہے جہالت اور غربت جن کا مقدر ہے، اور یہ مقدر اسی طاقتور طبقے کا لکھا ہوا ہے۔ وہ خوبصورتی اور لذتوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ کسی بھی سوسائٹی کی ساری تڑپ، جدوجہد اور امید کی کرن صرف متوسط طبقہ ہوتا ہے۔ وہ کون سا انسان ہے جسے اپنے لیے اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے خوبصورتی اور خوشیاں درکار نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں اپنے اوپر سے مسخ شدہ انسان کا چوغہ اتار پھینکنا چاہیے اور خوبصورت بننے، ماحول کو خوبصورت کرنے اور ہر ایک کے اپنے انداز سے خوش ہونے کے حق کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ اگر اس طبقے کی مزاحمت نہیں کریں گے جو ثواب اور پارسائی کے نام پر پورے معاشرے کو بلیک میل کرتا ہے، اُسے پیچھے رہنے، گھٹن زدہ اور بدنما زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے، تو ہمارے اس وطن میں تہذیب کے رہے سہے آثار بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی کاوش ہے۔

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 71 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، نرمل ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان میں: 700 روپے
بیرون ملک: 70 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ ''شب خون'' الٰہ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کہانیاں

آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں	سید رفیق حسین	Rs. 375
عطرِ کافور	نیر مسعود	Rs. 80
زبدا اور دوسری کہانیاں	اسد محمد خان	Rs.180
خطِ مرموز	فہمیدہ ریاض	Rs.100
ایک اور آدمی	حسن منظر	Rs.85
عاقبت کا توشہ	نکہت حسن	Rs.85
دور کی آواز	فیروز مکرجی	Rs.150
صحرا کی شہزادی	سکینہ جلوانہ	Rs.120

کہانیوں کے ترجمے

ایرانی کہانیاں	انتخاب اور ترجمہ: نیر مسعود	Rs.90
ہندی کہانیاں (جلد 1)	ترتیب اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 2)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 3)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 4)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.350
کارل اور اینا	(منتخب ترجمے) محمد سلیم الرحمن	Rs.80
گم شدہ خطوط	(منتخب ترجمے) محمد عمر میمن	Rs.90
مہرِ سکوت	(منتخب ترجمے) زینت حسام	Rs.120
کلی منجارو کی برفیں	(منتخب ترجمے) محمد خالد اختر	Rs.120

Scanned with CamScanner

انتخاب

منتخب تحریریں	گابرئیل گارسیا مارکیز	ترتیب: اجمل کمال	Rs.750
منتخب تحریریں	نرمل ورما	ترتیب: اجمل کمال	Rs.280
منتخب کہانیاں	ویکوم محمد بشیر	ترتیب: مسعود الحق	Rs.180
پریم وانی	میرا بائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395

ناول

بیس سو گیارہ	محمد خالد اختر	Rs. 70
گنگا جمنی میدان	اختر حامد خاں	Rs.120
دائرہ	محمد عاصم بٹ	Rs.100
نمبردار کا نیلا	سید محمد اشرف	Rs.60

ناولوں کے ترجمے

تمس	بھیشم ساہنی	ترجمہ: شہلا نقوی	Rs.180
قلبِ ظلمات	جوزف کونریڈ	ترجمہ: محمد سلیم الرحمن	Rs.80
بوفِ کور	صادق ہدایت	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.200
خیمہ	میرال الطحاوی	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.75
نوکری کی قمیض	ونود کمار شکل	ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال	Rs.100
پہلی بارش	خولیو لیاماز اریس	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.95
سرزمین مصر میں جنگ	یوسف القعید	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.125
درخت نشین	اتالو کلوینو	ترجمہ: راشد مفتی	Rs.175
شہزادہ احتجاب	ہوشنگ گلشیری	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.70
اِنکی کے دیس میں	ولاس سارنگ	ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال	Rs.150
امید اور دوسرے خطرناک مشاغل	لیلیٰ العلمی	ترجمہ: محمد عمر میمن	Rs.100

Scanned with CamScanner

شاعری

پریم وانی	میرابائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کلیات اختر الایمان	اختر الایمان	ترتیب: سلطانہ ایمان، بیدار بخت	زیر طبع
مٹی کی کان	افضال احمد سید	(کلیات)	Rs.500
روکوکو اور دوسری دنیائیں	افضال احمد سید		Rs.50
آدمی کی زندگی	فہمیدہ ریاض		Rs.70
ساری نظمیں	ذی شان ساحل	(کلیات)	(زیر طبع)
جنگ کے دنوں میں	ذی شان ساحل		Rs.125
ای میل اور دوسری نظمیں	ذی شان ساحل		Rs.150
نیم تاریک محبت	ذی شان ساحل		Rs.100
رات	سعید الدین		Rs.50
سائے چراغ کے	احمد عظیم		Rs.150
مٹی کا مضمون	فرخ یار		Rs.150
سویرے کا سیاہ دودھ	پاؤل سیلان	ترجمہ: آفتاب حسین	Rs.150
بارہ ہندوستانی شاعر	(انتخاب)	ترتیب: اجمل کمال	(زیر طبع)
خودکشی کے موسم	زاہد امروز		Rs.120
بے یقین بستیوں میں	علی اکبر ناطق		Rs.150
زندگی میرے پیروں سے لپٹ جائے گی	تنویر انجم		Rs.350
یاقوت کے ورق	علی اکبر ناطق		Rs.200
نئے نام کی محبت	تنویر انجم		Rs.350

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کراچی کی کہانی
(جلد اول و دوم)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.1100

ریت پر لکیریں
(انتخاب)
محمد خالد اختر
Rs.300

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

انیس
(سوانح)
نیر مسعود
Rs.375

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.150

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

لغاتِ روزمرہ
(تنقید و تحقیق)
شمس الرحمن فاروقی
Rs.250

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.280

کافکا کے افسانے
(افسانے)
نیر مسعود
Rs.70

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

آج
(پہلی جلد)

ترتیب: اجمل کمال

Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

ارشد محمود

R s.200

تیسری جنس

سندھ کے خواجہ سراؤں کی

معاشرت کا ایک مطالعہ

مؤلف: اختر حسین بلوچ

Rs.200

شہزادہ احتجاب
(ناول)

ہوشنگ گلشیری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.70

ریت پہ بہتا پانی
(شاعری)

قاسم یعقوب

Rs.160

اردو کا ابتدائی زمانہ
(تنقید و تحقیق)

(تیسرا ایڈیشن)

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.250

امید اور دوسرے خطرناک مشاغل
(ناول)

لیلیٰ العلمی

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

Rs.100

انگی کے دیس میں
(ناول)

ولاس سارنگ

مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال

Rs.150

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

فارسی کہانیاں
(جلد:1)
انتخاب اور ترتیب: نیر مسعود
Rs.250

فارسی کہانیاں
(جلد:2)
انتخاب اور ترتیب: اجمل کمال
Rs.380

فارسی کہانیاں
(جلد:3)
انتخاب اور ترتیب: اجمل کمال
Rs.430

یاقوت کے ورق
(نظمیں)
علی اکبر ناطق
Rs.200

نئے نام کی محبت
(نظمیں)
علی اکبر ناطق
Rs.350

اپنا پانی
(نظمیں)
سعید الدین
Rs.250

ڈاکٹر روتھ فاؤ کا زندگی نامہ
مظہر ضیا
ترجمہ: صائمہ ارم
Rs.200

آخری بیابان
(ناول)
نرمل ورما
ہندی سے ترجمہ: شائستہ فاخری
Rs.200

Scanned with CamScanner

سٹی پریس میں دستیاب اردو رسائل و جرائد

سہ ماہی نقاط، فیصل آباد
مدیر: قاسم یعقوب
قیمت: 150 روپے

سہ ماہی دنیازاد، کراچی
مدیر: آصف فرخی
قیمت: 160 روپے

سہ ماہی آئندہ، کراچی
مدیر: محمود واجد
قیمت: 80 روپے

کہانی گھر، لاہور
ترتیب: زاہد حسن
قیمت: 150 روپے

سہ ماہی ارتقا، کراچی
مرتب: راحت سعید، ڈاکٹر محمد علی صدیقی
قیمت: 100 روپے

سہ ماہی روشنائی، کراچی
مدیر: احمد زین الدین
قیمت: 250 روپے

سہ ماہی سمبل، راولپنڈی
مدیر: محمد علی فرشی
قیمت: 150 روپے

کتابی سلسلہ اجرا، کراچی
مدیر: احسن سلیم
قیمت: 250 روپے

کتابی سلسلہ مکالمہ، کراچی
مدیر: مبین مرزا
قیمت: 350 روپے

مہر نامہ، کوئٹہ
مدیر: دانیال طریر
قیمت: 250

سہ ماہی نیا ورق، ممبئی
مدیر: ساجد رشید
قیمت: 120 -

سہ ماہی نظم نو، کراچی
مدیر: علی ساحل
قیمت: 200

ماہنامہ قومی زبان، کراچی
مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان
قیمت: 15 روپے

ماہنامہ الحمراء، لاہور
مدیر: شاہد علی خاں
قیمت: 80 روپے

ماہنامہ نیا زمانہ، لاہور
مدیر: محمد شعیب عادل
قیمت: 30 روپے

Scanned with CamScanner